

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین طبع

جولائی 2012

PDFBOOKSFREE.PK





پکوان

- 284 حفصہ النعم آپ کا باورچی خانہ
280 خالد جیلانی موسم کے پکوان

نفیات

- 288 عدستان نفسیاتی اور ادبی الجھنیں

بیوٹی بکس

- 290 بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور

رنگارنگ پھول

- 268 شگفتہ جواہ رنگارنگ سلسلہ
272 تصویر نشاط خبریں ویریں

میری بیاض سے

- 275 خالد جیلانی آپ کی بیاض سے

جولائی 2012
جلد 40 شمارہ 3
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آرمیڈس نے این حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹائم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مکمل ناول

- 134 فرحت اشتیاق جو کچے ہیں
82 نایاب جیلانی ایک رات کی بات

ناولٹ

- 186 راحت جیس ساری بھول
202 مقدس مشعل احساس زریاں
168 مہوش کونل مشی حجت آزمائش بن گئی

افسانے

- 61 سعدیہ حمید حجت مجاہدوں
68 نازیہ کونل ناری حیا اگر
126 شانیز جمال نیر مہنگ اٹھے
78 تمسہ شاکر مقصد حیات

نظمیں غزلیں

- 266 پروین شاکر نظم
266 انور شعور غزل

ذرا سا لڑکھائے کیسے شگفتہ
پاکستان (سالانہ) 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا 6000 روپے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے چوں ماہنامہ شاعر اور ماہنامہ شاعرین شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویب سائٹ پر ڈراما، ٹورنامنٹ، انجیل اور سلسلہ وار قطعہ کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

- 14 مسیر کہی سنتی
15 ادارہ کرن کرن روشنی
278 نادر خاتون ہمارے نام

آپ سے کیا پردہ

- 20 انڈوں کی طرف ڈری انشاجی
271 امت (الصبور) میری ڈائری سے

مجھ سے ملنے

- 29 شاہین کرشید باتیں ہمارے کاشف سے

انٹرویو

- 22 امت (الصبور) زمیں کھا گئی
24 شاہین کرشید نعمان اعجاز
276 ادارہ خاموشی کو زنا بولے

ناول

- 32 عنیہ سید کوہ گراں تھے ہم
248 منجبت عبداللہ میرے خواب لوٹا دو

خواتین ڈائجٹ کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

پے درپے غیر متوقع واقعات ہونے کا عمل مسلسل سے جاری ہے اور بدترین اندیشے بھی۔

اختیار، اقتدار اور دولت کا کھیل بھی عجیب ہے۔ یہ انسان کے ہاتھ میں آجائے تو انصاف منہ چھالیتا ہے اور دلیس بے معنی ہو جاتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اقتدار اللہ تعالیٰ کو ہی دیا ہے اور ان کو جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور زمین پر انصاف قائم کرتے ہیں۔

اس مہینے میں رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے۔ روزہ وہ واحد عبادت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

”روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔“

نفس انسانی کی تربیت میں روزے کو خصوصی دخل ہے۔ روزہ کی حالت میں بھوٹ، غیبت، جھٹی، ظلم و زیادتی اور ہر قسم کی فضول و لاپرواہی کو سے منع کیا گیا ہے۔

روزہ کا حقیقی مقصد یہ ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ایک ماہ کی اس تربیت کو ہم اپنی زندگی کا معمول بنا لیں اور اسے سال کے بغیر کیا دہ ماہ میں بھی برقرار رکھا جائے۔

ہماری طرف سے رمضان المبارک کی مبارک باد قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقدس مہینے کی برکتوں سے پوری طرح فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- ۱۔ فوجت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو نیچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
 - ۲۔ نایاب جیسلائی کا مکمل ناول۔ بات ایک رات کی،
 - ۳۔ مقدس شعل کا ناول۔ احساس زریاں،
 - ۴۔ راحت جیس اور مہوش کنول شمی کے ناول،
 - ۵۔ سعید حمید چودھری، نازیہ کنول نازی، شمر مشکور اور شازیہ جمال نیتر کے افسانے،
 - ۶۔ عزیز نسیم اور محبت عبداللہ کے ناول،
 - ۷۔ فی وی کے مشہور ناول نگار نعمان اعجاز سے ملاقات،
 - ۸۔ ایف ایم 105 کی آر جے ہما کاشف سے باتیں،
 - ۹۔ میری خاموشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے سروے،
 - ۱۰۔ کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
 - ۱۱۔ ہمارے نام۔ آپ کے خطوط اور ادیان کے جوابات،
 - ۱۲۔ نصیاتی اندوہی الجیش اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- خواتین ڈائجٹ کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہے۔ ہم اسے آپ کے لیے پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ یہ آپ کا اپنا پڑچاہے۔ ہمیں خط لکھ کر اپنے قیمتی مشوروں اور آراء سے ضرور فائدہ لے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو تمام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ، ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

اخلاقی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کا بیان

حضرت ابو سلمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے،

انہوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلی

اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں سوال کیا تو

”آم المومنین“ نے فرمایا۔

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تھے، حتیٰ کہ

ہم کہتے کہ اب تو آپ روزے ہی رکھتے جائیں گے۔

اور روزے پھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب تو آپ نے

روزے پھوڑ دیے ہیں۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ

وسلم کو کبھی شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے

رکھتے نہیں دیکھا۔ آپ چند دن کے سوا ماہ شعبان کے

(مارے) روزے رکھتے تھے۔“

فوائد

1- نفلی روزے مسلسل رکھنا بھی جائز ہے، جبکہ ہر

روزہ انظار کیا جائے، یعنی وصال نہ کیا جائے، کیونکہ وہ

ہمارے لیے ممنوع ہے۔

2- نفلی روزے سال کے ہر مہینے میں رکھے جاسکتے

ہیں۔

3- مسلسل ایک مہینہ نفلی روزے رکھنا خلاف

سنت ہے۔

4- ماہ شعبان میں نفلی روزوں کا اہتمام زیادہ ہونا

چاہیے۔

5- حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے،

انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلسل) روزے

رکھتے تھے، حتیٰ کہ ہم کہتے، آپ انظار نہیں کریں

گے۔ اور انظار کرتے حتیٰ کہ ہم کہتے، آپ روزے

نہیں رکھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے

مسلک ایک مہینہ روزے نہیں رکھے۔
6- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤد علیہ السلام والا روزہ ہے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑتے تھے اور اللہ کو سب سے زیادہ جو نماز پسند ہے وہ داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات تک سوئے اور تہائی رات میں نماز پڑھتے اور رات کا چھٹا حصہ سوئے رہتے۔“

فوائد

- 1- نفلی عبادات کی مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے۔ آدمی چاہے تو زیادہ نوافل ادا کرے چاہے کم رکھیں پڑھ لے اس طرح چاہے زیادہ روزے رکھے چاہے کم رکھے، البتہ ان امور سے اجتناب کرے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرمایا ہے۔
- 2- حضرت داؤد علیہ السلام کے انداز پر نفلی روزے رکھنا سب سے افضل ہے۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفلی روزے رکھنے سے ثواب کم ہو جائے گا۔
- 3- حضرت داؤد علیہ السلام والے روزے اس لیے افضل ہیں کہ اس طریقے سے انسان کو جسم کا اہل و عیال کا اور دوسرے لوگوں کا وہ حق ادا کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے، جو ہمیشہ روزے رکھنے کی صورت میں ادا نہیں کیا جاسکتا اور اللہ کی عبادت کر کے ثواب بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ دائمی عمل بھی بن جاتا ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے۔
- 4- نماز تہجد رات کے کسی بھی حصے میں ادا کی جاسکتی ہے، تاہم مذکورہ بالا صورت افضل ہے، کیونکہ اس میں بھی جسم کے حق اور اللہ کے حق کا ایک خوب صورت توازن موجود ہے۔
- 5- داؤد علیہ السلام والی نماز کی صورت یہ ہے،

مسلک ایک مہینہ روزے نہیں رکھے۔
آرام کیا جائے، پھر اٹھ کر چار گھنٹے نماز تہجد اور عبادت میں گزارے جائیں، پھر دو گھنٹے تک آرام کر لیا جائے۔

شوال کے چھ روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس شخص نے عید الفطر کے بعد چھ روزے رکھے اس کے پورے سال کے روزے ہو گئے۔ جو شخص نیکی کرے اس کے لیے اس کا دس گنا ثواب ہے۔“

روزہ رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یوں تو نبی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے، سوائے روزے کے“ کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ (گناہوں سے) سپرد (ڈھال) ہے پھر جب کسی کا روزہ ہو تو اس دن گالیاں نہ بکے اور آواز بلند نہ کرے پھر اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کو آئے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔“
ان قسم سے اس پروردگار کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان اس کے ہاتھ میں ہے کہ بے شک روزہ دار کے من کی بو اللہ تعالیٰ کے آگے قیامت کے دن مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور روزہ دار کو وہ خوشیاں ملتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اپنے اقطار سے خوش ہوتا ہے اور دوسرا وہ اس وقت خوش ہوگا جب وہ اپنے روزے کے سبب اپنے پروردگار سے ملے گا۔“

ماہ رمضان کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔“

جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں کس (باندھ) دیے جاتے ہیں۔“
ماہ رمضان سے پہلے ایک دو روزے نہ رکھو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
”رمضان سے پیشگی ایک دو روزے مت رکھو“

سوائے اس شخص کے جو ہمیشہ ایک مقررہ دن میں روزہ رکھ رہا تھا اور وہی دن آگیا تو وہ اپنے مقررہ دن میں روزہ رکھ لے۔ (مثلاً) ”جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا تھا اور انیس اور تیس تاریخ میں شعبان کے وہی دن آگے تو روزہ رکھ لے۔“

روزہ چاند دیکھنے پر ہے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاند کا ذکر فرمایا اور فرمایا۔
”جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم اس کو دیکھو تب ہی اقطار کرو پھر اگر بادل آجائیں تو تیس روزے پورے رکھ لو (اس کے بعد عید کرو)۔“
بے شک اللہ نے اسے مہیا کر دیا ہے

”سیدنا ابو ابیخسری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عمرہ کو نکلے اور جب (مقام) منجد کے درمیان میں پہنچے تو سب نے چاند دیکھنا شروع کر دیا اور بعضوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ تین رات کا چاند ہے (یعنی بڑا ہونے کی وجہ سے) اور بعضوں نے کہا کہ دو رات کا ہے پھر ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے اور ان سے ذکر کیا کہ ہم نے چاند کو دیکھا اور کسی نے کہا کہ تین رات کا ہے اور کسی نے کہا دو رات کا ہے تب انہوں نے پوچھا کہ تم نے کون سی رات میں دیکھا؟ تو ہم نے کہا کہ فلاں فلاں رات میں

انہوں نے کہا۔
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔“
”اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے کے لیے بڑھا دیا اور وہ اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا۔“

ہر شہر (ملک) کے لیے ان لوگوں کی رویت

کریب کہتے ہیں کہ سیدہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے انہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس (ملک) شام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ میں شام گیا اور ان کا کام کر دیا اور میں نے جمعہ (یعنی پندرہ عشرین) کی شب کو رمضان کا چاند دیکھا پھر مہینے کے آخر میں مدینہ آیا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا اور چاند کا ذکر کیا کہ تم نے ب دیکھا؟ میں نے کہا کہ جمعہ کی شب کو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے خود دیکھا؟ میں نے کہا ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور لوگوں نے بھی تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہم نے تو ہفت کی شب کو دیکھا اور ہم پورے تیس روزے رکھیں گے یا چاند دیکھ لیں گے تو میں نے کہا کہ آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (چاند) دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی حکم کیا ہے اور یحییٰ بن یحییٰ کو شک ہے کہ حدیث میں ”تکتنفی“ کا لفظ ہے یا ”تکتفی“ کا۔

عید کے مہینے (اجرو ثواب کے اعتبار سے)

سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”عیدوں کے دو ماہ ناقص نہیں ہوتے۔ ایک رمضان شریف اور دوسرا ذی الحجہ۔“

روزہ کے لیے سحری کا بیان

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔“

سحری میں تاخیر کا بیان

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سحری کی پھر صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں (راوی) نے کہا کہ (سحری اور نماز) دونوں کے درمیان کتنی دیر ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ پچاس آیات کے موافق۔ (سحری سے فراغت اور نماز کی تکبیر کے درمیان تقریباً ”دس منٹ کا فاصلہ تھا۔)

اللہ تعالیٰ کے اس قول حتی یقیم لکم..... کے بارے میں

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ

جب یہ آیت اتری کہ:

”کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ سفید دھاگہ نمودار ہو جائے۔“

تو آدمی جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتا تو دو دھاگے اپنے پیر میں باندھ لیتا۔ ایک سفید اور دوسرا سیاہ اور کھانا پیتا رہتا یہاں تک کہ اس کو دیکھنے میں کالے اور سفید کا فرق معلوم ہونے لگتا تب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ”بحرے“ کا لفظ اتارا تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے۔

بے شک بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رات کو اذان دیتے ہیں پس تم کھاؤ اور پیو

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو مؤذن تھے۔ ایک سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ نابینا تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”بلال رات کو اذان دیتے ہیں پس تم کھاتے پیتے

رہو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔“

سورج غروب ہو جائے تو روزہ افطار کر لو

سیدنا عبد اللہ بن ابی بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رمضان کے مہینے میں سفر میں تھے پھر جب آفتاب غروب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے فلاں! اترو اور ہمارے لیے سٹو کھول دو۔“ انہوں نے کہا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ابھی آپ پر دن ہے۔“ (یعنی ان صحابی کو یہ خیال ہوا کہ جب غروب کے بعد جو سرخ ہے وہ جانی ہے جب رات آتی ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا۔ ”اترو (یعنی اونٹ پر سے) اور ہمارے لیے سٹو گھولو۔“

پھر وہ اترے اور سٹو کھول کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوش فرمایا اور پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔ ”جب سورج اس طرف غروب ہو جائے (یعنی مغرب میں) اور اس طرف (یعنی مشرق سے) رات آجائے تو پس روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔“

افطاری جلدی کرنے کا بیان

ابو عطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں اور مسروق، ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور مسروق نے ان سے کہا کہ۔

”اے مسلمانوں کی ماں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے دو شخص ایسے ہیں کہ ایک تو اوّل وقت افطار کرتے ہیں اور اوّل وقت ہی نماز پڑھتے ہیں اور دوسرے افطار اور نماز میں دیر کرتے ہیں۔“

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ”وہ کون ہیں جو اوّل افطار کرتے ہیں اور اوّل وقت نماز

پڑھتے ہیں۔“

تو انہوں نے کہا کہ ”وہ عبد اللہ (بن مسعود) رضی اللہ

عنه ہیں۔“

تو انہوں نے کہا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔“

سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رمضان کی سولہ تاریخ کو جہاد کیا تو کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی افطار کیے (بے روزہ دار) تھا اور روزہ دار افطار کرنے والے پر عیب نہ کرتا تھا اور نہ افطار کرنے والا روزہ دار پر۔

اس افطار کرنے والے کے اجر کا بیان جو سفر میں کام کرے

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے پس کوئی ہم میں سے روزہ دار تھا اور کوئی بے روزہ دار۔ اور سخت گرمی کے وقت ایک منزل میں اترے اور سب سے زیادہ سارے میں وہ تھا جس کی پاس چادر تھی اور کہتے تو ایسے تھے کہ ہاتھ ہی سے دھوپ روکے ہوئے تھے اور روزہ دار جتنے تھے سب منزل پر جا کر پڑے رہے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے کھڑے ہو کر خیمے لگائے اور اونٹوں کو پانی پلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”افطار کرنے والے آج بہت سا ثواب لے گئے۔“

میت کے روزے کی قضا

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مرجائے اور اس پر روزے (کی قضا) ہو تو اس کا وارث اس کی طرف سے روزے رکھے۔

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا میں نے ایک لونڈی خیرات میں اپنی ماں کو دی تھی اور میری ماں مر گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”کہ تیرا ثواب ہو گیا اور پھر وہ لونڈی میراث کی وجہ سے تیرے پاس آگئی۔“

اس نے عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں پر ایک ماہ کے روزے (قضا) تھے کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”ہاں اس کی طرف سے روزے رکھو۔“

اس نے عرض کیا کہ ”میری ماں نے حج نہیں کیا تھا۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”اس کی طرف سے حج بھی کرو۔“

نماز عید میں کیا پڑھیں

عبید اللہ بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوقدیس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحیٰ اور فطر میں کیا پڑھتے تھے؟“ انہوں نے کہا کہ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ق والقرآن المجید اور اقترمت الساعة وانشق القمر پڑھتے تھے۔“ (مسلم)





کچھ انڈوں کی طرف داری میں

انشائی

دنیا میں یہ بحث ہمیشہ سے چلی آرہی ہے کہ انڈا پہلے یا مرغی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں انڈا۔ کچھ کا کہنا ہے مرغی۔ ایک کو ہم مرغی اسکول یا فرقہ مرعہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے کو انڈا اسکول۔ ہمیں انڈا اسکول سے منسلک سمجھنا چاہیے۔ ملت بیضا کا ایک فرد جاننا چاہیے۔ ہمارا عقیدہ اس بات میں یہ ہے کہ اگر آدمی تھانڈا آریا مولوی یعنی فقہ شہر ہو تو اس کے لیے مرغی پہلے۔ اور ہم ایسا غریب شہر ہو تو اس کے لیے انڈا پہلے۔ اور غریب شہر سے بھی گیا گزرا ہو تو نہ اس کی دسترس مرغی تک ہو سکتی ہے نہ انڈا اس کی گرفت میں آسکتا ہے۔ اسے اپنی ذات اور اس کی بقا کو ان چیزوں سے پہلے جاننا چاہیے، پہلے مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک زمانے میں ہمارا دھیان کبھی کبھی مرغی کی طرف بھی جابا کرتا تھا۔ لیکن جب سے مبری کے دام گائے کی قیمت کے برابر ہوئے ہیں اور مرغی مبری کے

دام پانے لگی ہے اور انڈا مرغی کے بھاؤ دستیاب ہونے لگا ہے ہمارے لیے انڈا ہی مرغی ہے۔ ہم وحدت الوجود کی منزل میں آگئے ہیں۔ انڈا بچوں بھی بڑی خوبیوں کی چیز ہے۔ اس میں سفیدی ہوتی ہے۔ اس میں زردی ہوتی ہے۔ اس میں چونا ہوتا ہے۔ اس میں پروٹین ہوتی ہے۔ اسے دانہ نہیں ڈالنا پڑتا۔ یہ بیٹ نہیں کرتا۔ بلیاں اس کی جان کی خواہاں نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے ڈیرہ نہیں بنوانا پڑتا۔ اس کے خول پر رنگ کر کے اسے گھر میں سجاسکتے ہیں۔ ہاں کبھی بھی یہ گندنا ضرور نکل جاتا ہے۔ سوائے آسانی سے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیا جاسکتا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب نئی تہذیب کے کسی گندے انڈے کو دیکھتے تھے، یہی کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ پرانی تہذیب کے گندے انڈوں کے متعلق انہوں نے اپنے کلام میں کوئی واضح ہدایات نہیں چھوڑیں۔ اس لیے ان کے عقیدت مندان کو سنبھال سنبھال کر رکھے جارہے ہیں۔

اقبال کے ایک شارح نے تو اس شعر کی مدد سے علامہ اقبال کی گھریلو زندگی پر بھی پورا مقالہ لکھ دیا ہے۔ آج کل دستور یہی ہے کہ غالب کی زندگی معلوم کرنی ہے تو اس کے دیوان سے اخذ کرو کہ وہ شہر میں بے آبرو پھر آکرتے تھے۔ دھول دھیا اور پیش دہی کیا کرتے تھے۔ در کعبہ سے اٹنے پھر آیا کرتے تھے، سیدھے نہیں اور مرنے کے بعد بھی بولا کرتے تھے۔

”کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ“ وغیرہ وغیرہ۔ ان صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال ایک روز بازار سے نئی تہذیب کے چند انڈے لے کر آئے۔ ان کی بیوی آلیٹ بنانے بیٹھیں تو انہیں دوسرا مصرع پڑھنا پڑا۔

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اس پر علامہ موصوف نے ترکی بہ ترکی یعنی مصرع یہ مصرع ہدایت کی کہ۔
ان کو اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

تحقیق یہاں ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اتنی سی بات تو ہر عاقل بھی سمجھ سکتا ہے۔ شارح موصوف کا کہنا ہے کہ شاعر کا گھر کسی گلی میں تھا۔ یہ شعر لانا ان دنوں کا ہے۔ جب علامہ مرحوم نے میوزیئم پر اپنی کوٹھی نہیں بنائی تھی۔ ورنہ وہ یہ فرماتے کہ اٹھا کر پھینک دو باہر سڑک پر

جناب محقق نے علامہ اقبال کی زبان میں نقص بھی دریافت کیا ہے کہ باہر کا لفظ زاید ہے کیونکہ گلی گھر کے اندر نہیں ہوتی۔ مزید لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ہر معاملے میں خواہ مخواہ اپنی رائے دینے کی عادت تھی۔ ورنہ گندے انڈے کو گلی میں پھینکنے کا فیصلہ ان کی بی بی خود بھی کر سکتی تھیں۔

شارح موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال مرحوم کے ابتدائے جوانی کا ہے۔ جب انہیں پہلا ملی، کسرت اور کرب بازی سے دلچسپی تھی۔ وہ بھاری بھاری وزن کو اٹھا کر دو چار بار گردش دیتے تھے، پھر پھینکتے تھے۔ یہ ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس لیے کہا ہے کہ ”اٹھا کر پھینک دو“۔ صرف پھینک دو، کہنا کافی نہیں سمجھا۔ معاملہ انڈوں ہی کا کیوں نہ تھا ہمارے خیال میں اس شعر سے ابھی اور معنی نچوڑنے کی بھی گنجائش ہے۔

علامہ مرحوم کو اپنے باطن کی صفائی کی طرف زیادہ دھیان دیتا تھا۔ باہر کی صفائی کا کچھ خیال نہ کرتے تھے۔ ورنہ وہ یہ کبھی نہ فرماتے کہ انڈے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دو۔ انہیں کوڑے کے ڈرم میں پھینکنا چاہیے تھا۔ باہر کسی جھلے آدمی کی اچھان پر گر جاتے تو بڑا فتنہ ہوتا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قوم کو علامہ مرحوم کی ہر ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اپنی عقل کا واجبی استعمال بھی کر لینا چاہیے۔ تھوڑی احتیاط بھی لازم ہے۔ ہر خوشہ گندم کو جلانے، مرمی کی سلوں سے ناخوش و بیزار ہونے

اس رزق سے موت اچھی ہے، نئے اور گندے انڈے گلی میں اٹھا کر پھینک دینے کے متعلق اشعار اس کی محض چند مثالیں ہیں۔

آج انڈوں کی طرف رہ رہ کر ہمارا دھیان جانے کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو سردی، دوسرے حکومت کا یہ اعلان کہ گوشت اور دودھ کی طرح انڈوں کی بھی قیمتیں مقرر کی جا رہی ہیں تاکہ مقررہ قیمتوں پر نہ ملیں۔ تیسرے شاد عارفی مرحوم کا ایک نادرہ کار شعر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ صیاد اور قفس اور نشین کے مضمون بہت شاعروں نے باندھے ہیں۔ نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے بھی باندھے ہیں۔ خود علامہ اقبال مرحوم نے بھی ایک بیل کی فریاد لکھی ہے لیکن اس مضمون کے جملہ تعلقات پر کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔

فرماتے ہیں شاد عارفی رام پوری۔
انہیں بھی ساتھ لیتا جا، کہیں نکلیں بنا لینا
ارے صیاد دو انڈے بھی رکھے ہیں نشین میں
انڈے کا مضمون تو ختم ہوا لیکن اپنے دوست عفا کے شکر کے ساتھ شاد عارفی مرحوم کے چند اور اشعار۔

تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی
لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کرے کوئی

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کے
وہ دن گئے کہ کسی برہمن پہ چوٹ کراول

ستم گر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں
غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں

کانٹے چنے جو ہم نے سر راہ کوئے دوست
جھگڑا یہ ہے دکھاؤ ہمیں، کیا اٹھا لیا

جفا و جور کو خوبی تو ہم سمجھتے ہیں
حکومتوں میں نہیں بلکہ مہ جبینوں میں

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



- اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت-75 روپے

رجسٹری سے منگوانے پر اور می آرڈر سے منگوانے والے

دو بوتلیں-200 روپے

تین بوتلیں-275 روپے

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ، ایف 1، جناح روڈ، کراچی۔

دفتری خریدنے کے لیے:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361

جملوں کی معنی خیزی کائنات کے گہرے رازوں کا پتا دیتی ہے۔ سچائیاں کشید کرتے ہوئے ان کی گہری سوچ اور فکری چنگی کہانی کو ایک نئے انداز سے سامنے لاتی ہے۔ ان کی علمیت اور تاریخ کا وسیع مطالعہ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے، لیکن وہ ان کی ادبی حیثیت کو متاثر نہیں کرتا۔

بیک صاحب علمیت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت انسان بھی تھے۔ ہنس مکھ، بذلہ سنج، مہکتہ مزاج۔

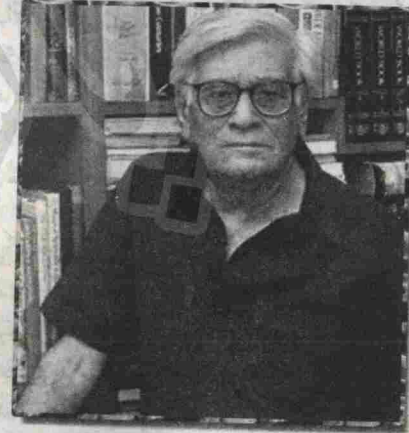
یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی دوستی کس کے ساتھ تھی۔ ریاض صاحب، یار صاحب، خاور صاحب، عامر صاحب، آذر سب ہی کے ساتھ ان کا قربت اور محبت کا رشتہ تھا۔ سلی بھابی کی محبت اور اخلاق کے بھی سب ہی لوگ گرویدہ تھے۔

بیک بھائی کو قدرت نے حسن کلام سے نوازا تھا۔ کبھی تاریخ پر گفتگو چھڑ جاتی تو۔ ان کی ذہانت اور وسیع مطالعہ کا کمال سامنے آتا۔ بڑے سادہ اور سلیس انداز میں دقیق گتیاں سلجھتی چلی جاتیں۔ گھنٹوں گزر جاتے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ باوجود اس کے کہ ذہانت اور علم میں کہیں آگے تھے۔ کبھی اپنی ذہنی برتری اور بڑائی کا احساس نہیں دلایا۔ ان کے مزاج میں بڑی کی فطری سی انکساری اور شفقت و محبت تھی۔

جی جی ہے کہ وہ ایک بہترین اور سچے انسان تھے۔ ایک ایسے انسان جن سے صرف ایک مرتبہ ملنے والا شخص بھی ان سے محبت کا دعویدار تھا۔ آج جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو احساس ہو رہا ہے کہ ہم ایک ایسی شخصیت کو کھو چکے ہیں جس کی جدائی کا غم برسوں مندمل نہیں ہو سکے گا۔ تسلی بھابی کے دکھ کا اندازہ نہیں لگایا جاسکے۔ رفیق سفر کی دائمی جدائی کا صدمہ سہتا آسان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کی بیٹیوں کو مہربان عطا کرے اور بیک بھائی کو جنہیں مرحوم کہنے کوئی نہیں چاہتا اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

زمین کھاگئی آسمان کیسے کیسے

امت الصیوف



تحقیق کی اور دستاویزی فلمیں بنا کر ان کا حسن دنیا کے سامنے پیش کیا۔

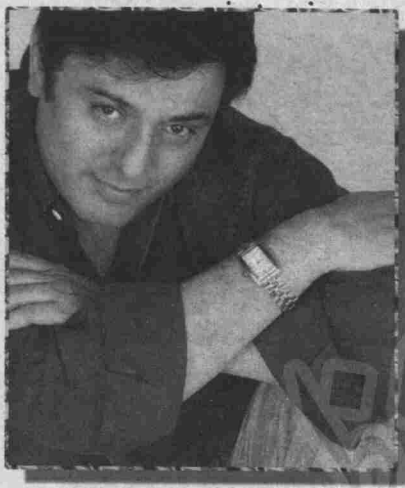
بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ وہ ماہر شکاری بھی تھے۔ ایک بار گفتگو کے دوران انہوں نے بڑے تأسف سے کہا کہ انہوں نے شکاریات پر مضامین لکھے تھے، بحوال شجاع رسالے میں شائع ہوئے تھے مدت ہوئی یہ رسالہ بند ہو چکا ہے۔ اب ان مضامین کا ملنا مشکل ہے۔

ریاض صاحب کے پاس ”الشجاع“ کی فائلیں محفوظ تھیں۔ انہوں نے بیک صاحب کو یہ شمارے بھجوا دیے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

ان کا ناول ”اور انسان زندہ ہے“ عمران ڈائجسٹ میں سلسلہ وار شائع ہوا۔ ایک اور ناول ”راچپوت“ کے نام سے لکھا۔ ان کے ناولوں میں ادب اور تاریخ کا بہت خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ سادہ سے

تہذیب و روایت کا ایک دور ختم ہوا۔ وہ ذہن جو علم و ادب کا خزانہ تھا، خاک ہوا۔ دانش ور، ادیب، محقق، کمپنڈر عبید اللہ بیک (بیک بھائی) اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ عبید اللہ بیک کو شہرت ملی ہوئی پروگرام ”دکھائی“ سے حاصل ہوئی۔ اس پروگرام کے ذریعے انہوں نے دیکھنے والوں کو اپنی ذہانت اور شخصیت کا گرویدہ بنالیا۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور حافظہ کمال کا تھا۔ علم و ادب کی دنیا کی بیشتر معروف شخصیات نے اس پروگرام میں حصہ لیا۔ اور انہوں نے عبید اللہ بیک کی ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

یہ پروگرام ان کی وجہ شہرت بنا، لیکن درحقیقت وہ ایک بہت اچھے ادیب بھی تھے اور بہترین محقق بھی۔ ٹی وی پر ان کا پروگرام ”سیلابی“ کے ساتھ ”آپنی نوعیت کا منفرد پروگرام تھا۔ جس میں انہوں نے پاکستان کے مختلف حصوں کی قدیم تاریخی حیثیت کے بارے میں



کچھ بھی نہیں ہے۔ چاہے وہ کتاب ہی زور لگالے کہ اسے یہی بننا ہے۔ بہر حال میں خوش ہوں اپنی لائف میں۔

”اس فیلڈ میں کیا تجربات حاصل ہوئے؟“
(ہستے ہوئے) ”یہ نہ پوچھیں کہ کیا تجربات ہوئے۔ بہت پرے تجربات بھی ہوئے اور بہت اچھے بھی لیکن ایک تجزیہ بہت گہری نظر سے میں نے کیا کہ اس فیلڈ میں مخلص، ایمان دار اور دوسروں کے لیے اچھا سوچنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ زیادہ تر لوگ اس فیلڈ میں مفاد پرست ہیں۔ دوسروں کی غیبت کرنا دوسروں کو نیچا دکھانا اور دوسروں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا یہ سب کچھ اس فیلڈ میں ہوتا ہے۔ منافقت اور جھوٹ بہت ہے اس فیلڈ میں۔“

”اس لیے آپ نے اپنی لائف پارٹنر کے لیے شوہر کا انتخاب نہیں کیا؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے۔ لیکن اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میری قسمت میں شوہر کی لڑکی نہیں تھی اور پھر وہی بات کہ اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔“

”مگر شوہر کے کئی لوگ ہیں جو بہت خوش گوار و

”جی بالکل! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ واقعی میں نے اس فیلڈ میں اگر اتنے رول کیے ہیں کہ اب یہ حسرت نہیں ہے کہ مجھے یہ کرنا چاہیے یا وہ کرنا چاہیے۔“

”آپ کا خواب ڈاکٹر بننا تھا بن نہ سکے۔ پھر وکالت میں آئے مگر شوہر کی مصروفیات کی وجہ سے چھوڑ دی۔ آخر آپ شوہر میں آئے کیسے؟ کس نے آپ کو یہ راستہ دکھایا؟“

”ایسا نہیں ہے کہ مجھے شوہر میں آنے کا شوق نہیں تھا۔ شوہر میں آنے کا شوق تھا۔ مگر اداکار بننے کا شوق نہیں تھا۔ میں بی بی وی بہ نیوز کاسٹرز کو خبریں پڑھتا ہوا دیکھتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی خبریں پڑھوں۔“

چنانچہ انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں بی بی وی گیا اور نیوز کاسٹر کے لیے آڈیشن دیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ 1985ء کی بات ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے نیوز اچھی نہیں پڑھی تھیں بلکہ یہ کہا گیا کہ تم ابھی کم عمر ہو۔ 1987ء میں جب دوبارہ اس کام کے لیے گیا تو اتفاق سے نصرت ٹھاکر صاحب سے ملاقات ہو گئی انہوں نے کہا کہ ”تم اداکاری کی فیلڈ میں کیوں نہیں آجاتے۔ مجھے تم میں ٹیلنٹ نظر آتا ہے۔“ اور پھر انہوں نے ہی مجھے اپنے ڈرامے ”دن“ میں کاسٹ کر لیا۔ یہ میرا پہلا ڈراما تھا۔ اس میں میری پر فارمنس ان کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے مجھے اپنے مزید چار ڈراموں میں کسٹ کر لیا۔ بس اس طرح میں اس فیلڈ میں آ گیا۔“

”گویا انسان کو دنیا میں وہی کچھ ملتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ آپ مانتے ہیں اس بات کو؟“

”جی بالکل! مانتا ہوں، کیونکہ بچپن سے میرا خواب ڈاکٹر بننے کا تھا۔ لیکن میں وہ کچھ بن گیا جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس فیلڈ میں آنے کا سوچتا بھی تھا تو یہی کہ نیوز کاسٹرز بنوں گا۔ مگر اسامی نہیں ہوا، تو ج تو یہ ہے کہ انسان کے اختیار میں



مَشْهُورٌ وَمَقْبُولٌ آرٹسٹ

نعمان اعجاز سے ملاقات

شائین رشید

جو چلے تو حال سے گزر گئے، اک نظر میری طرف، جل پری“ اور دیگر بہت سے ڈراموں میں آپ کی اداکاری منفرد نظر آئی۔ کیا اداکاری آپ کا خواب تھا؟“
”نہیں ہرگز نہیں! میرا خواب تو ڈاکٹر بننا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور اداکار بن گیا۔ ویسے کیریئر کا آغاز میں نے وکالت سے کیا تھا۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ایک ڈیڑھ سال اس پیشے سے وابستہ رہا، پھر شوہر کی مصروفیات کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکا اور وکالت کو خیر باد کہہ دیا۔“
”ویسے اس فیلڈ میں اگر ہر طرح کے رول کر کے کچھ تسکین تو ہوتی ہوگی؟“

نعمان اعجاز ایک ایسا نام جو کسی بھی سیریل اور ٹیلی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ ورشائل فنکار جو ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ناظرین میں اسی طرح مقبول ہیں جس طرح پہلے تھے۔
آج آپ انہیں ٹی سیریز میں دیکھ رہے ہیں اور سب میں ان کا کردار مختلف اور منفرد ہے اور یہی سچے فنکار کی پہچان ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اپنے کرداروں میں تخیل دے۔
”کتے ہیں نعمان اعجاز صاحب؟“
”محمد اللہ۔“
”آپ ایک بہترین فنکار ہیں۔ ڈراما ”میرا سانس“

خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔

”بے شک بہت سے جوئے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ بات پھر وہیں پہنچے رک جاتی ہے کہ جو نصیب میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔ اگر میرے نصیب میں شوہر کی لڑکی ہوئی تو مجھے ضرور ملتی۔“

”دیسے رابعہ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ آپ کی پسند کا کتنا عمل دخل تھا؟“

”میری ہی پسند کا مکمل دخل تھا۔ میں نے رابعہ کو پہلی مرتبہ کالج کے ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی اور دوسری ملاقات میں پروپوز کر دیا تھا۔“

”گھر والوں کو پتا تھا آپ کی پسند کا؟“

”بالکل پسند کا پتا تھا اور انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ لیکن ٹھوڑی سی دیر رابعہ کی طرف سے ہوئی، لیکن آخر کار سارا معاملہ سیٹ ہو گیا۔ ہماری شادی 1995ء میں ہوئی۔ جس لڑکی کو میں نے چاہا تھا، وہ مجھے مل گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے تین عدد خوب صورت بیٹے دے کر زندگی کو مکمل کر دیا۔ میرے بڑے بیٹے کا نام ”زاویار“ دوسرے کا نام ”شاہ میر“ اور تیسرے کا نام ”ریان“ ہے۔“

”بٹی نہیں ہے آپ کی۔ اچھا محسوس کرتے ہیں یا خواہش کبھی بٹی کی؟“

”مجھے بیٹیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ مجھے بٹی کی خواہش کبھی۔ مگر اللہ نے نہیں دی۔ اب کیا کہہ سکتے ہیں۔“

”چلیں! سوویں آجائیں گی تو یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ خیر! جب آپ اس بات کو ماننے ہیں کہ

سب کچھ نصیب کا لکھا ملتا ہے۔ پھر تو کبھی کوئی کام پلاننگ کے ساتھ نہیں کرتے ہوں گے؟“

”آپ ٹھیک سمجھی ہیں۔ میں آئندہ زندگی کے لیے کوئی پلاننگ نہیں کرنا اور میں روزانہ کی بنیاد پر پلاننگ کرنا ہوں۔ جو آج ہے وہ ہمارا ہے، جو کل ہے اس کے بارے میں کچھ بتا نہیں ہے۔ بس اللہ تعالیٰ

اپنی مہربانیاں ہم پر جاری رکھے۔“

”1987ء سے آپ اس فیلڈ میں ہیں۔“

”بہت کام کیا۔ تعداد تو یاد نہیں ہوگی، مگر حیرت سارے چیمپلز کے آجانے کے بعد کن ڈراموں کو بہت اچھا نہیں لگے؟ میں آپ کے ڈراموں کی بات کر رہی ہوں؟“

”اوکے۔ پہلا ڈراما تو جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ڈراما سیریل ”دن“ تھی۔ اس کے بعد سے لگاتار کام کیا اور تقریباً 120 یا 125 ڈراما سیریلز کی ہیں۔ تقریباً پونے تین سو کے قریب سنگل ڈراموں میں جنہیں آپ ٹیلی فلمز بھی کہہ سکتی ہیں، میں کام کیا اور دس فلمیں کیں۔ اب یہ بات کہ پسند کون کون سے ہیں تو مجھے تو اپنے سارے ہی ڈرامے اور فلمیں پسند ہیں۔ ہاں! جو بہت مشہور ہوئے ہیں ان میں ”میرا سائیں“ جس کا سیکوئل بھی چلا۔ اس کے علاوہ ”دشت“، ”بل بری“ جو چلے تو جاں سے گزر گئے، ”نجات“ یہ زندگی ہے خاموشیاں، ”جھکا جان“، ”اک نظر میری طرف“ میں مرگئی شوکت علی، ”در شہوار“، ”فشار“، ”من و سلوی“، ”سب ہی سپر ہٹ گئے۔ مگر ”میرا سائیں“ نے تمام ریکارڈز توڑ دیے ہیں۔“

”اس میں آپ کا رول بہت اچھا تھا۔“

”بے شک! مگر اس میں ساری ٹیم نے بہت محنت کی۔ کسی ایک کے رول کے اچھا ہوجانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک ٹیم ورک نہ ہو۔ سب نے اپنا اپنا کام بہت محنت سے نبھایا ہے۔“

”کر دار اپنی پسند سے لیتے ہیں؟“

”ڈائریکٹر مجھے بتاتا ہے کہ یہ رول ہے، پھر میں دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں اور اگر اچھا پاور فل ہوتا ہے تو قبول کر لیتا ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے ”ہاں“ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جو رول پسند آتا ہے، بس پھر اسی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ آگے میری مدد اللہ کرتا ہے۔“

”مگر لوگ کہتے ہیں، میں نے بہت محنت کی، بہت جدوجہد کی، تب اس مقام تک پہنچا۔ کیا اولاد کو آگے

بڑھانے میں والدین کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ والدین کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ اگر ہماری اچھی تربیت نہ کریں، ہمیں اچھی تعلیم نہ دلائیں، ہمارے اندر محنت کا جذبہ پیدا نہ کریں تو ہم کب کچھ کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ میں تو اپنے والدین کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنے پیروں پہ بااعتماد طریقے سے کھڑے ہوئے۔“

”اور اب آپ اسی انداز میں اپنے بچوں کی تربیت کر رہے ہیں؟“

”جی بالکل! بچوں کی تربیت میں والدین کا ہاتھ ہی ہوتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ماں کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ باپ تو سارا دن اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ میرے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں میری بیگم کا بہت ہاتھ ہے۔“

”آپ کتنا وقت دیتے ہیں؟“

”میری کوشش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ وقت دوں۔ لیکن کام کی نوعیت ایسی ہے کہ جتنا وقت مجھے دینا چاہیے، اتنا دے نہیں پاتا۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہر سال ملک سے باہر مہینہ دو مہینے کے لیے ضرور جاتا ہوں اور پھر وہ سارا وقت بچوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔“

”مزید سوالات سے پہلے آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتائیں۔“

”میں 14 فروری کو لاہور میں پیدا ہوا۔ میرا ستارہ حوت ہے۔ میری والدہ کا نام فرحت اور والد کا نام اعجاز ملک تھا۔ دونوں حیات نہیں ہیں۔ ہم دو بھائی ہیں اور ہماری ایک ہی بہن ہے۔ بھائی مجھ سے بڑا ہے جو کہ امریکا میں ہے۔ بہن چھوٹی ہے جو کہ اپنی شادی شدہ لائف میں خوش حال زندگی گزار رہی ہے اور اپنی تعلیم کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتایا ہی ہے کہ (ایل ایل بی) ہوں۔“

”آپ کے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ پھر بھی

کسی چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں اپنی زندگی میں؟“

”بہت اچھا سوال کیا آپ نے۔ بے شک اللہ نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہوا ہے۔ میں ایک اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔ بس کمی ہے تو والدین کی۔ کاش وہ حیات ہوتے۔ ہمارے ساتھ ہوتے تو زندگی کا طعم ہی کچھ اور ہوتا۔ میں انہیں بہت مِس کرتا ہوں۔ بہت کمی محسوس ہوتی ہے ان کی۔“

”آپ بتا رہے ہیں کہ آپ ہر سال ملک سے باہر گھومنے پھرنے جاتے ہیں۔ کبھی دل چاہا کہ باہر ہی رہنا چاہیے؟“

”شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میرے پاس کینیڈا کی شہریت ہے۔ مگر میں صرف اور صرف پاکستان میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے پاکستان سے پیار ہے۔ یہاں میری جڑیں ہیں اور اللہ نے پاکستان میں ہی مجھے شہرت دی ہے۔ میں جو کچھ ہوں پاکستان کی وجہ سے ہی ہوں۔“

”شہرت؟“ ایک سوال پوچھوں گی۔ ہجوم سے گھبراتے ہیں؟“

”نہیں! لوگ محبت کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ڈیمانڈ کرتے ہیں، آؤ گراف کی، تو کیا ہوا۔ لوگ ملتے ہیں تو تعریف ہی کرتے ہیں۔“

”اپنے آپ کو عام لوگوں سے کتنا مختلف سمجھتے ہیں؟“

”بالکل بھی مختلف نہیں سمجھتا۔ میں بھی عام لوگوں کی طرح انسان ہوں۔ عام انسانوں کی طرح رہتا ہوں۔ ضرورت کے اوقات میں گھر کے کاموں میں بھی حصہ لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جو عزت و شہرت دی ہے اس پر غور کیا؟“

”آپ سے بات کر کے بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ میں بہت انکساری ہے۔ کھانے پینے میں مخمور دکھاتے ہیں؟“

”نہیں بالکل نہیں! کیونکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ مخمور کیا کرنا اور سچ بات تو یہ ہے کہ کھانے پینے میں مخمور دکھانے نہ دکھانے کا سارا دارو



- 1 "وصلی نام؟"
- "ہم کاشف۔"
- 2 "پیار کا نام؟"
- "ہم ہی ہے۔"
- 3 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"
- "10 اپریل / کراچی۔"
- 4 "اسٹار / قد بغیر ٹیل کے؟"
- "ARIES / 5 فٹ 6 انچ۔"
- 5 "تعلیمی قابلیت؟"
- "گریجویٹ۔"
- 6 "ہن بھائیوں میں آپ کا نمبر؟"
- "میرا نمبر پانچواں ہے۔"

ایف ایم ۵۔ اکی آر جے

بائیں ہما کاشف سے

شاہین رشید

- 7 "ریڈیو کا پہلا پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟"
- "ریڈیو کا پہلا پروگرام "بی ان اسٹائل" اور وجہ شہرت "آواز انداز" بنا۔"
- 8 "ٹی وی کا پہلا پروگرام؟"
- "جی سویرا۔ مارننگ شو ہے یہی آج کل کر رہی ہوں۔"
- 9 "مڈیا میں آمد؟"
- "بے شوق سے اپنی کوشش سے آئی۔ ایف ایم 100 میں آؤں تو دن اور کامیاب ہو گئی۔"
- 10 "کن کن ایف ایم میں کام کیا؟"
- "ایف ایم 100، ایف ایم 103، ایف ایم 91 اور اب ایف ایم 105 میں ہوں۔"
- 11 "ایف ایم سے آپ کی وابستگی؟"
- "2001ء میں ایف ایم جوائن کیا۔"
- 12 "پہلی کمائی کیا کیا تھا؟"
- 13 "پہلی کمائی تو نیچرنگ کی تھی۔ ایک کوچنگ میں پڑھایا تھا اور کراچی یونیورسٹی میں نگران محنت کے فرائض انجام دیے تھے۔ کمائی کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔"
- 14 "بہت مرتبہ اور اکثر باتیں سچ ہوتی ہیں۔"
- 15 "کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
- "کراچی میں۔"
- 16 "کس ملک میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
- "کہیں نہیں صرف پاکستان۔"
- 17 "کوئی تحفہ جسے آپ بہت خوشی ہوتی ہو؟"
- "میرے بہتار مجھے اکثر تحفہ دیتے رہتے ہیں۔ ان کا

"ہر وقت فضول خرچی نہیں کرتا۔ لیکن جب کچھ پسند آجاتا ہے تو پھر نہیں رک سکتا۔ میرا ایمان ہے کہ اگر خرچ کریں گے تو اللہ تعالیٰ رزق میں اضافہ کرے گا۔ اپنے اوپر بھی خرچ کرنا چاہیے۔ گھر والوں پر بھی خرچ کریں اور ضرورت مندوں پر بھی۔ پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح رزق میں اضافہ کرتا ہے۔"

"مذہبی ہیں؟"

"بالکل ہوں۔ نصیب کے لکھے پر یقین رکھتا ہوں۔ نماز، روزے کی پابندی کرتا ہوں۔ با وضو رہتا ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ با وضو رہنے سے اللہ تعالیٰ رزق میں اضافہ کرتا ہے۔ میں نے اس بات کو گھر سے باندھ لیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے رزق میں کشادگی دی ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھوں۔ کبھی مجبوری میں چھوٹ جائے اور بات ہے ورنہ نہیں چھوڑتا۔"

"غصہ آتا ہے؟ رو عمل کیا ہوتا ہے؟"

"انسان ہوں۔ غصہ تو آتا ہے مگر کم آتا ہے۔ کوئی بلا وجہ جھوٹ بولے تو بہت غصہ آتا ہے، مگر اظہار نہیں کرتا۔ خاموش رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

"کھانے میں خرچہ تو نہیں دکھاتے، پھر بھی کھانے میں کیا پسند ہے آپ کو۔ اور کیا خود بھی پکالتے ہیں؟"

"میں خود نہیں پکالتا۔ نہ کبھی ایسا کوئی موقع آیا کہ مجھے خود پکانا پڑا ہو اور کھانے میں دال چاول اور ساتھ ہری مرچ بہت پسند ہیں۔"

"میوزک سے آپ کا لگاؤ؟"

"بالکل ہے۔ نہ صرف فتح علی بہت پسند ہیں۔ زیادہ تر انہیں ہی سنتا ہوں۔ بانی کو ذرا کم سنتا ہوں۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ اوقات اپنی میمیلی کے ساتھ گزارنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ ان کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے بہت کم مواقع ملتے ہیں۔"

مرا والدین کی تربیت پر ہوتا ہے ہمارے والدین نے کچھ کھانے اور کچھ نہ کھانے کی بالکل بھی عادت نہیں ڈالی۔ بلکہ ہمیشہ یہی کہہ کر ہم کو سب کچھ کھانا ہے۔ کوئی خرچہ نہیں دکھانا، کیونکہ یہ ناشکری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ناشکری کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں اپنے بچوں کو بہت ڈانٹتا ہوں، جب وہ کھانے میں خرچہ دکھاتے ہیں۔"

"جو انکساری اور خلوص آپ میں ہے یقیناً آپ کے بچوں میں بھی ہوگا؟"

"ان شاء اللہ ہوگا۔ کیونکہ بڑا بیٹا بارہ سال کا ہے۔ دوسرے دو چھوٹے ہیں، لیکن میں ان کو مینوز سکھاتا رہتا ہوں کہ کسی کے گھر جاؤ تو ان کے ملازموں سے بھی بہت عزت و انکساری کے ساتھ ملو۔ کیونکہ محنت سے کمائے والا ہر شخص عزت اور احترام کے قابل ہے۔"

"سیاست سے لگاؤ ہے آپ کو؟"

"ہے اور نہیں بھی۔ ہمارے یہاں کی سیاست بہت عجیب و غریب ہے۔ ہمارے سیاست دان صرف اپنے ہی مفاد کا سوچتے ہیں۔ انہیں غریبوں کی غمٹ کا کیا احساس، جنہوں نے بھی فائدہ نہ کیا ہو، جنہوں نے کبھی بازار جاکر خود خریداری نہ کی ہو۔ جنہوں نے لائن میں لگ کر بیل جمع نہ کرائے ہوں۔ جنہوں نے کبھی دھوپ کی گرمی نہ سہی ہو۔ انہیں غریبوں کا کیا احساس ہوگا۔ میرا بس چلے تو کچھ سبق تو سکھائی دوں۔ مگر مجبور ہوں۔"

"آپ کے خیال میں عورتوں کو جاب کرنی چاہیے؟"

"کیوں نہیں۔ اگر مجبوری ہو، ضروری ہو اور اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کروانا ہو تو ضرور کریں، مگر اپنی حدود کے اندر رہ کر۔ ویسے بھی خواتین کو تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے۔ تاکہ بچوں کی اچھی تربیت کر سکیں۔ خود میری بیگم رابعہ گریجویٹ ہے۔"

"فضول خرچ ہیں؟"



غلوں و دیار بہت بڑا خفہ ہے۔“
18 ”ٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟“
”بہت کم۔“
19 ”آپ کی فوج پلاننگ؟“
”کام کے حوالے سے ہی ہے۔ بہت زیادہ کام کرنا ہے اور اسی فیلڈ میں اپنا کیریئر بنانا ہے۔“
20 ”سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟“
”خاموشی، سناٹا سکون۔“
21 ”مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری ہے؟“
”بہت ضروری ہے کیونکہ بہت ساری باتیں انسان کتابوں سے سیکھتا ہے۔ کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔“
22 ”پاکستانی معاشرے کی اچھی اور بری بات؟“
”اچھی بات یہ کہ لوگ اچھا کام کرتے ہیں تو اس کو سراہا جاتا ہے اور بری بات یہ کہ انسان جب کوئی کام شروع کرتا ہے تو لوگ نصیب جتنی بہت کرتے ہیں۔“
23 ”باہر کے معاشرے کی اچھی اور بری بات؟“
”باہر کے لوگوں میں آگے بڑھنے کا جذبہ بہت ہے اور صبح اٹھنے کی اچھی عادت ہے۔“
24 ”خودکشی کرنے والا باہر ہوتا ہے یا بھڑل؟“
”بھڑل ہوتا ہے۔ حرام موت مرنے سے بہتر ہے کوئی اچھا کام کرے۔“
25 ”آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟“
”کمزوری یہ کہ لوگوں پر بہت جلدی بھروسہ کرتی ہوں اور طاقت یہ کہ آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔“
26 ”کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہے یا متاثر ہیں؟“
”کچھ ایسی سلیبرٹیٹز ایسی ہیں جن سے ملنے کی خواہش ہے۔“
27 ”میک اپ میں کیا چیز بری لگتی ہے؟“
”سب ہی اچھی لگتی ہیں۔ بری کوئی نہیں لگتی۔“
28 ”میک اپ ایسا ہونے والا تو؟“
”توہ اٹنے حسین نظر نہ آتے۔“

29 ”کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟“
”گنہگار کرنا سب سے زیادہ دکھ کا باعث بنتا ہے۔“
30 ”بوریست دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟“
”گائے وغیرہ کو لیتی ہوں یا بیوی دیکھ لیتی ہوں۔“
31 ”کس کی یاد عثمانی میں سکون کا باعث بنتی ہے؟“
”بچپن کی یادیں اور ماضی۔“
32 ”صبح اٹھنے کی کیا دل چاہتا ہے؟“
”کہ کاش! میری فجر کی نماز قضا نہ ہو مگر ہمیشہ ہو جاتی ہے۔“
33 ”گھر کے کس کو نے میں سکون ملتا ہے؟“
”اپنے بیڑم میں۔“
34 ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“
”کچھ بھی مل جائے، مہربانی ہو، چاہے پالک ہو، ٹینڈے ہوں۔“
35 ”کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟“
”اماں کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں مگر اب ہر وقت ان کے ہاتھ کے کھانے تو نہیں کھا سکتے۔“
36 ”ماشتا جو شوق سے کرتی ہیں؟“
”میں تو ناشتا نہیں کر پاتی، حالانکہ اپنے سننے والوں کو ناشتے کی تاکید کرتی ہوں۔“
37 ”بچے مسائل کس سے شیر کرتی ہیں؟“
”اپنی بہترین دوست شجاع سے۔“
38 ”کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟“
”بہت شدید غصہ آتا ہے۔“
39 ”آپ کو کتنا وقت دیتی ہیں؟“
”بہت کم وقت دیتی ہوں، کیونکہ مصروف بہت رہتی ہوں۔ ہاں کوئی تعریف کرے تو پھر ضرور دیکھ لیتی ہوں۔“
40 ”کیا آپ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی ہیں؟“
”ہاں بالکل! اپنی مرضی سے گزار رہی ہوں۔“
41 ”زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟“
”اپنے لیے۔“
42 ”پہلی مرتبہ نیا نیا استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی

ہیں؟“
”جس چیز کے لیے استعمال کر رہی ہوں، وہی لکھتی ہوں۔“
43 ”کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟“
”نہیں! میں اپنی صحت کا نقصان نہیں کرتی۔ غصہ میں لوگوں پر نکالتی ہوں، کھانے نہیں۔“
44 ”دل کب ٹوٹتا ہے؟“
”جب لوگوں کا رویہ بہت سخت ہو جاتا ہے اور کوئی نظر انداز کرے تو۔“
45 ”کیا بات جذباتی کر دیتی ہے؟“
”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“
46 ”موڈ کب خراب ہوتا ہے؟“
”جب اپنی مرضی سے کوئی کام نہ ہو رہا ہو یا کوئی آپ کو دھوکا دے۔“
47 ”ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟“
”تعلیم بہت ضروری ہے۔“
48 ”کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟“
”بالکل جی! کرتی ہوں۔“
49 ”پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟“
”سوچتی نہیں! بلکہ ہر نماز میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ میاں پاکستان کو بہت لمبی عمر عطا فرمائے۔“
50 ”آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟“
”عام لوگوں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن میں اپنے پورے دن کا ٹائم ٹیبل بنالتی ہوں اور اسی حساب سے چلتی ہوں۔“
51 ”کون چیزوں کے بغیر گھر نہیں نکلتیں؟“
”موبائل، پرس، گلاسز، اسے لی ایم۔“
52 ”تمہاری میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟“
”اپنے آپ سے ہی ہم کلام ہوتی ہوں۔“
53 ”پنامو بائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟“
”اب تک نہیں کیا۔ شاید میں واحد ہوں کہ جس نے نمبر نہیں بدلا۔“
54 ”سفر کے لیے بہترین سواری، رکشا، بس یا اپنی کار؟“

”اپنی کار بڑا سکون دیتا ہے۔“
55 ”کون چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟“
”اپنے کپڑوں پر۔۔۔ کیونکہ میڈیا کی جانب سے تو پٹریے اسٹائلس ہونے چاہئیں اور پرفورمنز وغیرہ۔“
56 ”کوئی ایسا لہجہ جس کے ساتھ پروگرام کرنا چاہتی ہیں؟“
”کسی کے ساتھ نہیں۔“
57 ”اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیے؟“
”اچھی تو یہ کہ جتنا ہو سکتا ہے لوگوں کی مدد کرتی ہوں اور اسی لیے نقصان بھی اٹھاتی ہوں اور شاید یہی بری عادت ہے کہ بھروسہ کرتی ہوں۔“
58 ”دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟“
”اپنے نہیں دیتے۔ پرائے دیتے ہیں۔“
59 ”کس ملک کے لیے کتنی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟“
”سعودی عرب۔“
60 ”پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟“
”پاکستان میں تو ہر چیز کی آزادی ہے۔ یہاں ہر شخص ہر ایشیو بات کر سکتا ہے۔“
61 ”لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟“
”یا۔۔۔ کیا ہے۔“
62 ”لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟“
”اوہ! آپ تو بڑی گلیمرس ہو گئی ہیں۔“
63 ”اگر آپ ملک کی صدر ہوتیں تو؟“
”بہت سی برائیاں کا خاتمہ کر دیتی اور تعلیم کو عام کر دیتی۔“
64 ”ٹی وی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سالگاتی ہیں؟“
”اے آر وائی ڈق، کیونکہ اس میں میری آواز میں ریسیبی چل رہی ہوتی ہے یا پھر دیکھتی ہوں کہ مارنگ شو میں کس نے کیا ڈانرنگ کی ہے اور کیا ٹاپک ہے۔“
”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟“
”کوئی بات نہیں۔ اللہ اللہ خیر صلہ۔“

چاند کو دل تھم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بڑا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ”شمناز“ نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک میٹم ہے۔



ماہ نور ایسے چار سوار خان کے گاؤں گئی تو وہاں ہندو کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے ہندو کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے نزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک ہندو والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے ہندو والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد بخیرگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی ہندو والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شایا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں ”شہناز“ نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھروالوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔ سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو بھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے ”سید پور کچل شو“ میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بھائی ہوئی بیسٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں فلزاطصور سے ملنے کی تاکید کی۔ فلزاطصور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کونسل سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی فلزاطصور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویس جماعت کی طالبہ ہے حدیثیں ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جو کرتھا۔ ماہ نور اور شاہ بانو ”سید پور کچل شو“ میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

۴۔ چوتھی قسط

سید پور میلے میں پہلا دن تھا۔ ماہ نور کا ذہن چکرا رہا تھا۔ چاک پر مٹی کے برتن گھڑتے کمار پر نظر پڑتے ہی اس کے ذہن نے شدید جھٹکا کھایا تھا۔ ماہ نور کمار کے سامنے کھڑی ایک ٹک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

”چلیں۔ اب کچھ کھا لیتے ہیں۔“ شاہ بانو نے کچھ دیر بعد اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

”ہوں! ماہ نور جو کئی تھی مگر وہاں سے ملی نہیں تھی۔“ اس برتن کو کیا کہتے ہیں۔“ کمار کے گرد ہجوم ڈراما ہونے پر اس نے دانستہ آگے بڑھ کر ایک برتن کو چھوتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

”ہاتھ نہ لگنا ملی!“ کمار کے بالکل ذہن نے تیزی سے کہا۔ ”گیلا ہے۔“

بالکل ذہن نے بلند آواز پر کمار نے ذرا ذرا نظر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کا خیال تھا کہ اس کی طرح

کمار بھی اس کو دیکھ کر ضرور چونکے گا، مگر اس نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالنے کے بعد نظریں جھکا کر اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ ماہ نور کا ذہن ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔

”پہلے چل بھی دو۔“ شاہ بانو نے ماہ نور کا بازو پھینچا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ شاہ بانو کے ساتھ چل رہی مگر نجانے کیوں شاہ بانو کے بھائی تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی بار مڑ کر گیلی مٹی سے برتن گھڑتے اس کمار کو دیکھا تھا۔



”چند بری صیبت نے آکھیا اے گول گول تے ایکو چنے کو نگلو کو کھرے کر لو۔“ (چند بری صاحب نے کہا ہے کہ گول اور ایک جیسے شایم الگ کر لو) کھاری نے سبزی دھوئی جنت بی بی کو مخاطب کیا۔

جنت نے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

”نگو نگلو اس رے کوئی شہسپل، ہانڈی چارڑھی اے آج رات دی عورت لئی۔“ (شلموں کا کوئی خاص کھانا بنانا ہے آج رات کو دعوت کے لیے) کھاری نے جنت کو اطلاع دی۔

”تے گا جراس تے ادھیاں کس دی لٹیاں نے ہانڈی تے چاچے جمالے میں۔ ادھیوں تھوڑیاں ای پیچھے رہ گئیاں میں۔“ (چاچے جمالے اور بھائی نذیر نے آدھی سے زیادہ گاجریں کدو کس کر بھی لی ہیں)۔ وہ منہ میں آتا پانی ٹھٹھا ہوا۔

”وے بدیتا۔“ جنت نے ہاتھ ٹل سے نکلنے پانی کے نیچے کر کے ان کی مٹی چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تیرا دھیان ہر ویلے کھان پین دل ای کیوں رہندا اے۔“ (تیرا دھیان ہر وقت کھانے پینے کی طرف ہی کیوں رہتا ہے)

”دھیان ای رہندا اے نا، کھیندا میں کھاپی لیندا آل۔“ (دھیان ہی رہتا ہے نا، کون سا میں کھاپی بھی لیتا ہوں) کھاری نے بچی آواز میں کہا۔

”ناویرانا۔“ جنت نے کھاری کو شرمندہ ہوتے دیکھ کر کہا۔ ”ہندے دی نظریں ہونی چاہی دی اے۔“ (انسان کی نظریں سر ہونی چاہیے)

”میری نظریں ای اے جناب۔“ (میری نظریں سر ہی ہے جناب) کھاری تیزی سے بولا۔ ”میں نے کدی اکھ چک کے کسی شے دل دیکھا دی نہیں۔“ (میں تو نظر اٹھا کر کسی چیز کی طرف دیکھا بھی نہیں ہوں)

”ہے شایاں اے۔“ جنت نے چادر کے پلو سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کھاری کو شاباش دی۔ ”چلو یہ مڑکا ٹوکرا اٹھاؤ اور یو یوں میں بھر دو۔“

کھاری نے مڑے سے بھر ٹوکرا اٹھا کر سر پر رکھا۔ دوسرے ٹوکرے میں سے دھلی دھلائی گاجر نکالی اور اسے کھاتے ہوئے فارم ہاؤس کی طرف چل دیا۔

میں انتہاں تے ڈھول ملتان اے

وہ بلند آواز میں گارہا تھا۔

”اونٹیں اونٹیں۔“ پھر اس نے لمحہ بھر کر رک کے خود کو یاد دلایا۔ ”اے ننیں گانا۔“ اس نے خود کو یاد دلایا اور دوبارہ سے چلنے لگا۔

اوکھے پینڈے لسیاں نے راہواں عشق دیاں
لکھ نہ جھڑے دیکھ وفاقاں عشق دیاں

(عشق کے راستے دشوار اور مشکل ہیں عشق ہندے کے پلے کچھ نہیں چھوڑتا)

کتاب پر پوروں کی ستائی اور سعید نے اصل اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

”شیدائی ہے بے چارہ۔“ فضل نے کہا۔

”جیسا بھی ہے فارم کی رونق اسی کے دم سے ہے۔“ سعید نے ہاتھ روک کر دم لیتے ہوئے کہا۔

”چوہدری صاحب نے بڑی شفقت رکھی ہوئی ہے اس پر۔“ فضل نے مشاقی سے فینچی چلاتے ہوئے کہا۔

”بڑی نیکی ہے۔ بے چارے کا نہ کوئی آگاہ نہ پیچھا۔ یہ فارم ہی اس کا گھر اور فارم پر کام کرنے والے ہی اس کے گھر والے ہیں۔“ سعید نے خیال غاہ کیا۔

”او فارم چھوڑو پورا بند ہی اس کا دوست ہے۔“ فضل ہنسا۔

”اللہ خوش رکھے اس کو۔“ سعید نے فینچی بند کرتے ہوئے کہا۔

پھلاں در کی جندری عشق رلا چھڈ دا

سر بازار جالے عشق نچا چھڈ دا
(پھولوں جیسی زندگی کو عشق خوار کر دیتا ہے عشق کے لیے سر بازار ناچتا رہے تو بھی ناچتا ہے)
افضل اور سعید کی گفتگو سے لاعلم کھاری راستہ بھرتائیں اڑا تا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”تم اتنی اپ سیٹ کیوں نظر آ رہی ہو ماہ نو! شاہ بانو نے سید پور سے واپسی پر پریشان ہوتے ہوئے اسے پوچھا۔
”کیوں ماہ نور۔ کوئی ہنر (ناگوار) چیز دیکھ لی کیا؟“ شاہ بانو کے بھائی عبید نے بھی اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں! ایسا تو کچھ نہیں ہے۔“ وہ جو مسلسل گاڑی کے شیشے سے باہر گزرتے مناظر پر غیر حاضرداشی کے ساتھ نظریں لٹکائے بیٹھی تھی ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ شاہ بانو اور عبید کن اکیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کسی الجھن کا شکار ہوں۔

ماہ نور نے ہاتھ پھیر کر اپنے بال سیدھے کیے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور پھر شاہ بانو کی طرف دیکھ کر مسکادی۔
”ارے کیا ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”شاید میں تھوڑا تھک گئی ہوں۔“ اس نے اپنے تئیں دلیل دینے کی کوشش کی۔

”ہاں۔“ شاہ بانو نے بے یقین نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شانے اچکا ئے۔

”شاید ماہ نور کو آج وہاں کچھ اپنی مرضی کے مطابق نہیں نظر آیا۔ کل اسے مزا آئے گا، کل دن میں ایگزیمیشن اور رات میں میوزیکل ٹائٹ ہوگی۔“ عبید نے موڈ کاٹتے ہوئے کہا۔

”مجھے آج بھی بہت مزا آیا۔“ ماہ نور نے اپنی آواز میں وہ کھٹکنا ہٹ سیدھا کرنے کی شعوری کوشش کی جو اس کے لہجے کا حصہ تھی۔ ”یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ میں نے اس سے پہلے انسانی کاوش کے ہاتھوں اس طرح آباد ہوا شہر نہیں دیکھا تھا۔ اسٹوڈنٹز رفل! بہت منظم بہت خوبصورت۔“

”مگر سید پور کے مقامی لوگ اس انسانی کاوش سے خوش نہیں ہیں ان کی آزادی متاثر ہوئی ہے۔“ عبید نے کہا۔

”ہاں یہ ان کا پوائنٹ بڑا ویلڈ (صحیح) ہے۔“ شاہ بانو کہہ رہی تھی۔

وہ دونوں بہن بھائی اسی موضوع پر بات کرنے لگے۔ ماہ نور کے ذہن پر وہ منظر بھرا بھرنے لگے۔ وہ ان مناظر کے درمیان تعلق جوڑ رہی تھی۔ منطق کی رو سے ان مناظر کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بناتا تھا۔ نہ ان مناظر کے پس منظر ایک سے نہ جائے وقوع ایک سی تھیں۔ پھر اس کا ذہن بار بار کیوں اٹکتا تھا۔ وہ خود سے سوال کرتی اپنے آپ سے الجھتی گھر تک پہنچی تھی۔ اس رات وہ ایک لمحہ کے لیے بھی سو نہ سکی تھی۔ اسے بچپن سے ہی بے یلیوں جگسہ ریز اور بھول بھلیوں جیسے کھیلوں سے چڑھی تھی۔ اخباریں بچوں کے مضمون اور بچوں کے رسائل میں بھی اس قسم کے صفحات سے اسے چڑھوس ہوئی تھی جن میں راستہ ڈھونڈے اور خزانے تک پہنچنے کی سرخیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسے مشرقی موویز اور ایڈونچر فلمیں بھی کچھ زیادہ پسند نہیں تھیں۔ ایسی چیزوں کے بجائے اسے نقطہ ملا کر اشکال بنانے والے کھیل زیادہ پسند تھے اور کامیڈی موویز اور رومانیک فلمیں دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ بھول بھلیوں کے کھیل اور مسیحینس کمائیوں میں اس نے بھی دل غ نہ کھایا تھا مگر اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا سامنا ایک راستہ ڈھونڈ کر خزانے تک پہنچنے والے کھیل یا جگسہ ریز کے ٹکڑے ملا کر تصویر بنانے والے چیلنج سے ہو گیا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود اپنے ذہن کو اس صورت حال میں الجھنے سے بچا نہیں پا رہی تھی۔

☆☆☆

”یہ عارف خان ہے، یہ ہی تمہارا باپ ہے، یہ ہی تمہاری ماں۔“

جب اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد لفظوں کو سمجھنا سیکھا تو اسے بتایا گیا۔ وہ شخص جس کی شکل سے وہ مانوس تھی جس کے چہرے پر اس کے لیے نرمی اور محبت تھی اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس کا باپ تھا۔ اسے اس بات کو مان لینے میں کوئی تاثر نہ ہوا۔ لفظ باپ کا جو مطلب وہ سمجھتی تھی عارف خان اس پر پورا اترتا تھا۔

”تم پر ہی ہو پری۔ جس کے ہاتھ میں جاو کی چھڑی ہوتی ہے۔ جاو کی چھڑی جس کے ایک سرے پر ستارہ بنا ہوتا ہے۔“ عارف خان نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

”نیریزوینڈ (پری کی چھڑی)۔“ مسز پیٹر نے بہت دن بعد جب اسے اس کتاب میں سے پری کی چھڑی کی تصویر دکھائی جس میں پیاری پیاری چیزوں کی رنگیں تصاویر تھیں تو وہ کتنی ہی دیر پلکیں جھپکاتے بغیر پری کی چھڑی کی تصویر دیکھتی رہی تھی۔ وہ چھڑی سنہری رنگ کی تھی جس کے ایک سرے پر سنہری ستارہ بنا ہوا تھا اور جس میں سے سنہری روشنیوں کے جھماکوں کے عکس ادھر ادھر جاتے دکھائی دے رہے تھے۔

”تو کیا میں ایسی چھڑی والی پری ہوں؟“ کافی دیر بعد اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا اور مسز پیٹر سے پریوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ پریاں جن کی چھڑیاں گھمانے سے ناممکن، ممکن ہو جاتا ہے۔

اس نے عارف خان سے خود کے لیے چھڑی والی پری کا خطاب سنا تھا اور مسز پیٹر سے پریوں کے کرشموں کے ناقابل یقین اور ناقابل فراموش واقعات سنے تھے اور کبھی کبھی سوچنے پر اسے ایسا لگتا جیسے عمر بھر جوہر کرتی رہی وہ خود کو اور اپنے دیکھنے والوں کو یہ باور کرانے کے لیے کرتی رہی کہ وہ واقعی ایک ایسی پری ہے جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

”ہم اسکول کی کتابیں بھی پڑھیں گے اور اپنے کام کو بھی سیکھیں گے۔“ وہ تھوڑی اور بڑی ہوئی تو عارف بابا نے اسے بتایا۔

”ہم کون سے اسکول جائیں گے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

”ہم سیلانی لوگ ہیں پری! عارف خان بابا نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم ایک جگہ تھوڑی رکتے

ہیں ہم تو مشہور شہر پہنچتی گھومتے ہیں اس لیے ہم کسی اسکول میں بھی نہیں جائیں گے۔
 ”تو پھر ہم اسکول کی کتابیں کیسے پڑھیں گے؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔
 ”میں پڑھوں گا اور تم کو بھی پڑھاؤں گا۔“ عارف بابا نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلانے کے لیے انداز میں کہا۔

”اور مسٹر بیڑ بھی تو ہیں۔“ پھر عارف بابا نے اسے یاد دلایا تھا۔
 ”مگر وہ تو کھانا بناتی رہتی ہیں اور جانوروں کو نسلائی ہیں ان کو برش بھی کرتی ہیں۔“ اسے مسٹر بیڑ والا آئیڈیا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”اے بابا! وہ بہت پڑھی لکھی عورت ہے۔“ عارف بابا نے اسے تسلی دی۔ ”وہ جو بڑا سارا ٹینک اس کے پاس ہے نا اس میں ڈھیری کتابیں ہیں وہ کتابیں وہ تم کو پڑھائے گی۔“
 پری عارف خان بابا کی یہ باتیں سن کر آنے والے دنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھنے لگی تھی جن میں مسٹر بیڑ کے ٹینک میں دھری تصویروں والی ساری کتابیں اس نے ایک ایک کر کے پڑھ ڈالی تھیں اور عارف خان بابا سے وہ سب بھی سیکھ لیا تھا جو اس کو ہر حال میں سیکھنا ہی تھا۔



وہ پہلی بار بس پر بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر کئی بار پچھلی سڑک سے گزرتی اکا دکا لاریوں کو دیکھا تھا۔ اسے یہ لاریاں کچھ اتنی اچھی نہیں لگتی تھیں کیونکہ وہ دھواں بہت زیادہ چھوڑتی تھیں اور ان میں اکثر ان کی گنجائش زیادہ مسافر لے دیتے تھے۔ اکثر مسافر چھتوں پر بھی بیٹھتے ہوتے تھے۔ اسے لگتا کہ مسافروں کی زیادتی کی وجہ سے یہ ایک طرف کو جھکی جاتی ہیں اور شاید ایک طرف جھکتے جھکتے کبھی یہ الٹ جائیں اور سارے مسافر گر جائیں۔ وہ خود بھی لاری پر نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے بہت عرصے تک اس بات پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ خود اس کی اماں اور بابا بھی کیسے نہیں جاتے۔ اس نے کبھی اپنے ماں باپ سے یہ سوال ہی نہیں کیا تھا کہ کیا ان کے کوئی رشتے دار عزیز دوست ایسے نہیں ہیں جن سے ملنے جانے کے لیے انہیں لاری یا رکشا پر بیٹھنا پڑے۔ اس نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا تھا کہ ان کے گھر کبھی کوئی خالہ، ماموں، نانائے، چچا، تایا، پھوپھی یا وادی، دادا، اسم کے رشتے دار کیوں نہیں آتے۔ وہ اپنے اس پہلے سفر سے قبل اپنی ہی ایک الگ دنیا میں مست تھی۔ اسی لیے شاید اس پہلے سفر کے تصور اپنی رہائش گاہ بدل جانے کے خیال اور عزیز ترین سہیلیوں کے چھوٹ جانے کے احساس تلے وہ سفر سے کئی دن پہلے ہی تھکی ہوئی اور بیڑ بھال گئی۔

گھر کا مختصر سامان ایک تانگے میں پورا لگایا تھا۔ دوسرے تانگے میں وہ اماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بابا سامان والے تانگے پر کوجوان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ محلے کی تمام خواتین بچے اور بچیاں اماں اور اسے رخصت کرنے کے لیے مسجد کی دہلیز سے بری سڑک تک قطاروں میں موجود تھیں۔

خواتین اماں کے گلے لگ کے آنسو بھی بہا رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ وہ اماں کے پڑھائے سبق اور نصیحتیں بھی بھلا نہ پائیں گی۔ کسی کو اماں کی سلائی کا انداز یاد آ رہا تھا، کسی کو ان کے ہاتھ کے ڈالے اچار پختیوں اور مربوں کا ذائقہ یاد آ رہا تھا، کسی کو ان کے وہ مشورے یاد آ رہے تھے جو ہر مشکل وقت میں ان کے کام آئے۔

اماں کی گونا گوں صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر کبھی اسی روز پہلی بار سعدیہ کلثوم کے کانوں میں پڑا تھا۔ محلے کے مرد مولوی سراج سرفراز کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ ان کی روانگی سے ایک روز قبل مولوی

صاحب کے لیے الوداعی محفل کرانی گئی تھی جس میں انہیں ایک عدد نیا سفید جوڑا، سرخ چار خانہ رومال اور سفید ٹوپی کا خند پیش کیا گیا تھا۔ انہیں تلے کا بار بار سنایا گیا اور ان کے اس مسجد میں گزرنے وقت میں ان کی کارکردگی پر خراج تحسین بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس پذیرائی پر مولوی سراج سرفراز کی آنکھیں احساسِ تشکر سے بھر آئی تھیں۔ ان کی مسکین اور عاجز سی شخصیت کے لیے یہ اعزاز خلاف توقع تھا۔ وہ اہل محلہ کے مشکور ہوتے ہوئے گلوگیر ہو گئے تھے۔

وقت رخصت بھی مولوی سراج سرفراز شانے بر رکھے زرد چار خانہ رومال سے بار بار اپنی نم آنکھوں کو پونچھ رہے تھے۔ وہ ایک انجان منزل کے مسافر بننے والے تھے جہاں خدا جانے ان کے لیے کتنی مشکلات تھیں اور کتنی آسانیاں۔

نانگا ایک جھٹکے سے عازم لاری اڈہ ہوا اور سعدیہ کلثوم نے بڑی سڑک سے آگے کے منظر پہلی بار اور شاید آخری بار ہی دیکھنے شروع کیے۔ وہ گھوڑے کی ٹاپوں پر کان دھرے راستے میں آنے والی دکانوں، گھروں اور دفنوں کو آنکھوں بھاڑے دیکھ رہی تھی۔

”کاش! پہلے پتا ہوتا کہ بڑی سڑک سے آگے یہ سب کچھ ہے تو کیوں نہ میں کھیتی کھیتی سب کو لے کر ادھر ہی آ نکلتی۔“

اس نے تانگے کی سواری کے دوران بار بار سوچا تھا۔ جس طرح کے جھٹکے کے ساتھ گھوڑا دوڑنا شروع ہوا تھا، ویسا ہی جھٹکا کھا کر ایک جگہ جا کر رک گیا اور اس نے سعدیہ کو اس کے خیالوں کی دنیا سے نکال باہر پھینکا۔ سعدیہ نے چونک کر دیکھا۔ اس کا کندھا اماں کے آہنی شلجے جیسے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ سعدیہ بے دھیانی میں جھٹکا کھا کر کہیں نیچے ہی نہ لڑھک جائے۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ اس نے اماں سے پوچھا اور سیاہ برقعے کے دھڑے نقاب تلے چھپے ان کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

”آہستہ بول۔“ آواز کا بھی پردہ ہوتا ہے۔ اماں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

سعدیہ نے کچھ دیر اماں کے کئے الفاظ پر غور کرنے کے بعد سمجھ نہ آئے اپنا دھیان دوسری طرف کر لیا۔ سامان والا تانکہ ان سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور بابا اس سے نیچے اتر کر سامان اتروا رہے تھے۔ سعدیہ نے دیکھا ایک روغن اڑے سنگ میل پر ”لاری اڈا“ کے مٹے مٹے الفاظ نظر آ رہے تھے۔

”وہ تو یہ لاری اڈہ ہے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔

لاری اڈے کے قریب ہی نہر کا پل تھا۔ سعدیہ نے پانی سے لباب بھری وہ چوڑی اور لمبی نہر بھی اس روز پہلی بار دیکھی تھی۔ نہر کے کنارے بہت سے لوگ موجود تھے۔ وہ جون کا ایک چمچلا ماون تھا۔ جب سورج صبح نو بجے ہی سوائیز پر محسوس ہو رہا تھا۔ بہت سے لڑکے، جانگم پنے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور بارہ ٹنٹے میں مشغول تھے۔ نہر کے کنارے سبز تر بوڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ بہت سے تروڑ کنارے کے ساتھ ساتھ بننے والے پانی کے اندر بھی رکے ہوئے تھے۔

”کیا یہ تروڑ نہر میں بہاتے جاتے ہیں؟“ سعدیہ کے ذہن میں ایک اور ایسا سوال آیا جو اسے کسی سے نہیں پوچھنا تھا۔

پھر دھواں چھوڑتی شور مچاتی، کھڑکھڑاتی، نیلے، سرخ اور سبز رنگوں سے مزین ایک ویسی ہی لاری اڈے پر آ کر رک گئی جیسی سعدیہ اپنے گھر کی چھت سے دیکھا کرتی تھی۔ بس میں بیٹھے کچھ مسافر اتر رہے تھے۔ سعدیہ کے ابا

اور ایک آدمی نے مل کر تیزی سے سعدیہ کے گھر کا سامان لاری کی چھت پر منتقل کیا۔ اباجی نے اماں اور سعدیہ کو لاری میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ لاری کا پانڈان اونچا تھا اور سعدیہ اس پر چڑھنے سے قاصر۔ اباجی نے آگے بڑھ کر خود اسے اٹھا کر لاری کے اندر رکھ دیا۔

لاری کے اندر قدم رکھنے تک سعدیہ گن چلی تھی کہ لاری کے بیرونی حصے پر دو غن سے سبز رنگ کے بیس مور بنے ہوئے تھے اور اس کے پچھلے شیشے پر دو بڑے بڑے پرندے اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ پچھلے شیشے پر "حافظ خدا تمہارا" کے الفاظ بھی درج تھے۔

سعدیہ اور اس کی اماں کو دو ایسی سیٹوں پر بٹھایا گیا جہاں سے ڈرائیور کے سامنے کاشیشہ اور اس بڑے شیشے سے پار کے منظر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ سعدیہ کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور اس کھڑکی کاشیشہ بند تھا۔ وہ پسینہ میں نہانی ہوئی تھی اور اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

اس نے انگلی سیٹ کے مسافر کی تقلید کرتے ہوئے بند شیشے کو پیچھے کھسکایا اور گرم ہوا کے جھوٹے فیض یاب ہوئی۔ کھڑکی کے شیشے سے مرمل مرمل آموں کی ریڑھیوں والے پکڑیوں کے ٹھیلوں والے اور بڑے بڑے کولر اور گلاس تھامے "ٹھنڈا شربت" کا گھوٹ لگاتے ہوئے لوگ صاف نظر آرہے تھے۔

ٹھنڈے شربت کے کولر کو دیکھ کر سعدیہ نے اپنے پیاس سے سوکتے لبوں پر زبان پھیری اور اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ انہیں متوجہ نہ پا کر اس نے دوبارہ کھڑکی سے پار دیکھنا شروع کر دیا۔

اسی وقت لاری ایک جھپٹے سے چلنا شروع ہوئی۔ سعدیہ نے گھبرا کر لاری کے سارے مسافروں پر نظر ڈالی اس کے اباجی کہاں تھے وہ سوار بھی ہوئے تھے کہ نہیں۔ پچھلی سیٹوں میں سے ایک پر بیٹھے اباجی نظر آئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اب لاری نہر کے ساتھ ساتھ بھاگتی چلی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے سے اگلتے دھوس کے بادل دائیں بائیں مکھرتے بھی نظر آرہے تھے۔ سعدیہ اماں اور اباجی انجان منزل کے مسافر تھے اور تینوں کی نظریں راستے پر تھیں۔ کون جانے کب اچانک منزل آجائے اور ان کا سفر ختم ہو جائے۔

اگلا دن تصویری نمائش کا دن تھا۔ ماہ نور نے اس خاص دن کے لیے خصوصی کپڑے بہت شوق سے بنوائے تھے۔ ایک مصوری حیثیت سے یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بہت اچھی طرح اس سے گزرتا چاہتی تھی لیکن کل کی الجھن اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ وہ بے دلی سے تیار ہوتی رہی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا رست کھر کی بھی قمیص اور رست اور سیاہ اسکارف کا گہرا رنگ اس کے چہرے کی اتاری رنگت کا ساتھ نہیں دے پارہے تھے۔ اس نے شاہ بانو کے سوالوں سے بچنے کے لیے ہونٹوں پر قمیص سے ہم رنگ لب اسٹک سجائی اور کانوں میں سیاہ آؤ بڑے بھی پہن لیے۔ لیکن ابھی بھی اسے لگ رہا تھا کہ شاہ بانو سوال کیے جائے گی اور وہ اس کے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے پائے گی۔

نومید آرٹ گیلری سید پور میں اس روز گننام مصورین کا راج تھا۔ وہ سب اپنی پہلی نمائش کے لیے پر جوش نظر آرہے تھے۔ ماہ نور کے چار ٹول امیج (تصویریں) ایک کونے میں رکھی تھیں۔ نمائش دیکھنے والوں میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، پیشہ ور فوٹو گرافرز پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگ موجود تھے۔ ماہ نور خاصی پر اعتماد شخصیت کی مالک تھی مگر اس روز اسے ایسا لگ رہا تھا وہ یہاں جس حیثیت میں متعارف ہو رہی ہے وہ اس کی نہیں ہے، جیسے وہ یونہی کہیں آگئی ہو۔ نقاد اور بصرہ نگار اس سے اس کی پینٹنگ کے بارے میں سوال

پوچھ رہے تھے اور حیرت انگیز طور پر اپنی توقع کے بالکل برعکس جواب بھی دے رہی تھی مگر اسے اپنا ذہن اس جگہ حاضر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کسی سحریں جکڑی ہوئی ہوں۔ مگر وہ کون ہے جس نے مجھے اس سحریں جکڑا کر رکھا ہے؟ کیا ہے؟" وہ فکروں سے سوچ رہی تھی۔

"کیا آپ یہ اس کی پچھلی کی؟" وہ اسی غیر حاضر ذہن کے ساتھ کھڑی تھی جب کسی نے اسے مخاطب کیا۔ ماہ نور نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر مخاطب کرنے والے کی طرف دیکھا۔ صبح سے اب تک وہ اپنے ہر مخاطب کے سوال کا جواب حاضر جوابی سے دیتی رہی تھی۔ لیکن اس وقت اسے لگا کہ اس کا ذہن سپاٹ ہو گیا ہے اس پر جواب کے لیے کوئی لفظ درج ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ Silhouette (ہلکے رنگ کے پیش منظر میں گہرے رنگ کی تصویر) امیژنگ ہیں۔" اس کا مخاطب کہہ رہا تھا۔

"میں کسی آرگنائزر سے کہہ کر وقتی طور پر اس پر فروخت شدہ کاٹنگ لگوا سکتا ہوں، قیمت ہم بعد میں طے کر لیں گے۔" ماہ نور اس کی بات سن رہی تھی مگر اس کا ٹاؤف ہونا ذہن اس کے الفاظ کے مفہوم سے قاصر تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور وہاں رکے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس کو یوں بیٹھتے دیکھ کر شاہ بانو جو دور کھڑی کسی سے باتوں میں مصروف تھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر کو چلی۔

"کیا ہوا۔ تم تھیک ہونا؟" اس نے ماہ نور کے قریب آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ماہ نور نے سر اٹھا کر شاہ بانو کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دینے کے لیے سر ہلایا۔ شاہ بانو نے گردن موڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا، جو ماہ نور کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں ان سے اس اس کیج کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" شاہ بانو کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔

"جی کیا پوچھتا تھا آپ کو؟" شاہ بانو نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"یہی کہ اگر یہ اسے بیچنا چاہیں تو میں انہیں اس کی منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔"

شاہ بانو نے بے یقینی سے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔ "اس کا داغ چل گیا ہے شاید۔ ایک نو آموز آرٹسٹ کے نانچتے سے کام کی منہ مانگی قیمت؟" اس نے سوچا۔

"آپ بعد میں سوچ کر بتا دیجیے گا۔" وہ لڑکا ماہ نور سے مخاطب ہوا۔ "میں بھی صرف اتنی اجازت دے دیجیے کہ میں اس پر سولڈ کاٹنگ لگوا دوں۔"

شاہ بانو نے ماہ نور کا رد عمل جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ ماہ نور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"اوہ فہم نکس۔" لڑکا خوش ہو کر بولا۔ وہ اتنا خوش نظر آ رہا تھا جیسے اسے ہفتہ اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہال کے دوسرے سرے پر پہنچا گیا تھا۔ اسے کسی آرگنائزر سے ملنا تھا شاید۔

"تم بہت خوش قسمت ہو مائی! شاہ بانو متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

"پکی ایک ریجیشن کے پہلے دن منہ مانگی قیمت پر سیل ہو گیا تمہارا کام۔"

ماہ نور خاموش بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی جگہ لگی تھیں جہاں وہ لڑکا کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے ذہن کے روبرو پرکٹی منظر ابھر اور غائب ہو رہے تھے۔

"مائی! شاہ بانو نے اس کے شانے کو جھنجھوڑا۔ "لگتا ہے تم حیرت اور خوشی کے مارے بے ہوش ہونے والی ہو۔"

"اس نے کہا اور بیک سے اپنا سیل فون نکالا۔ "ٹھہرو! میں عبید بھائی کو یہ بریکنگ نیوز دے دوں۔"

شاہ بانو کے بھائی عبید کو بھی یہ خبر اپنی کامیابی محسوس ہو رہی تھی۔

”دیکھو یہ ماہ نور منہ کر رہی تھی کہ اسے اپنا کام اگیزہ پیش میں نہیں رکھنا۔“ وہ بار بار کہہ رہے تھے۔
 ”اس نے کہنے میں اچانک کامیابی ملنا۔“ شاہ بانو بھی بہت خوش تھی۔
 ”لیکن مجھے تو یہ اسکی چیز نہیں بیچنے تھے۔“ دوپہر کے کھانے کے بعد ماہ نور کا ذہن تھوڑا ٹھکانے پر آیا تو اس نے کہا۔
 ”لو بھلا۔“ شاہ بانو کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”کیوں نہیں بیچتے تھے۔“ اس نے سوال کیا۔ ”اور اگر نہیں بیچتے تھے تو اس وقت سر کیوں ہلا دیا تھا جب وہ لڑکا تم سے کہہ رہا تھا اس پر سولڈ کا ٹیک لگا دو۔“
 ”جی نہیں۔“ ماہ نور نے کوک کا آخری گھونٹ حلق میں اندیلا اور گلاس پر چپکتے پانی کے قطروں کو انگلی سے مٹانے لگی۔

”یہ تو بہت عجیب اور غلط بات ہے۔“ شاہ بانو خفگی سے بولی۔
 ”بے اصولی کی بات ہے بلکہ۔“ عید بھی جھلا کر بولا۔
 ”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اسے میں یہ اسکی چیزوں کی نہیں۔“ ماہ نور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے یہ کہا کہ میں اسے بیچوں گی نہیں۔“
 شاہ بانو نے اس کی بات سن کر ہونٹ پیچنے لگے۔
 ”یعنی تم اسے یہ اسکی تحفہ پیش کرو گی؟“ شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جسے تم جانتی ہو نہیں اور جو کہیں دور دراز سے بھی تمہارے مائے چاچے کا پتہ نہیں۔“
 ”کیا ہے بھئی۔“ ماہ نور نے انکا جواب دیا۔ ”میں بیچنے مجھے مجھ سے غلطی ہو گئی جو بغیر سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ اب اس غلطی کو کسی طریقے سے نبھانا تو ہے۔ آپ۔“ اس نے عید کی طرف دیکھا۔
 ”عید بھائی پلیر اس سے کوئی قیمت ویرت نہیں لیجے گا۔ بس اس کو دے دیجئے گا۔“
 ”تم ہوش میں ہو؟“ شاہ بانو نے زور سے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔ ”منہ مانگی قیمت دے رہا ہے وہی پگل!“ اس نے ماہ نور کو یاد دلانا چاہا۔
 ”وہ بے وقوف ہے۔“ ماہ نور ہلکا سا مسکرا کر بولی۔ ”میں نے ناچنے کام کی منہ مانگی قیمت دینے کا کہہ گیا ہے۔ شاید اس کے پاس بہت بات تو پیسہ ہے۔“
 ”اگر وہ بے وقوف اور فضول خرچ ہے تو پھر میں بھی اتنی مین (لاچی) نہیں ہوں کہ بے سبب پیسے لے لوں اس سے۔ مجھے اپنے کام کی ویرتہ (قیمت) کا خوب اندازہ ہے۔“
 ”تمہارا دماغ چل گیا ہے مائی!“ شاہ بانو خفا ہو گئی۔ ”پیسے مل رہے ہیں تمہیں تم ان پیسوں سے اتنے مزے کر سکتی ہو کہ حد نہیں۔“

”میں ابھی بھی مزے کر رہی ہوں۔“ ماہ نور نے بے نیازی سے کہا۔
 ”اتنے کہ حد نہیں۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔
 وہ اوپن ایر رستوران ملکی، غیر ملکی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ غیر ملکی لوگوں کے لیے یہ رستوران پاکستانی دیسی ثقافت کا آئینہ دار تھا اور وہ یہاں اگر خوش نظر آ رہے تھے۔
 ”ایک بار پھر سوچ لو میری بس!“ تھوڑی دیر کے بعد شاہ بانو اپنی خفگی جھٹک کر ہار سے بولی۔
 ”اس میں سوچنے کی تو بات ہے ہی نہیں۔ میں نے بھی کوئی چیز فروخت کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ یہ میرے بیچنے کا کام ہے جسے میں نے یوں ہی موقع ملنے پر نمائش کے لیے رکھ دیا۔ سوچا تھا ایک دن کے لیے ذرا سا اہم بن جانا کیسا لگتا ہے یہ جان لوں گی۔ میں یہاں خریدنے بیچنے کے لیے نہیں آئی تھی۔“ ماہ نور نے حتیٰ لہجے میں جواب دیا۔

”وہ۔“

”بچپن کا نہیں لڑکپن کا۔“ شاہ بانو نے ناراضی کے باوجود تصحیح کی۔
 ”جو بھی ہے۔“ ماہ نور نے شانے اچکائے۔ ”عید بھائی! آپ کے پاس اگر اب آئے اسکی لینے تو اسے بس دے دیجئے گا۔“ اس نے ایک بار پھر عید سے اپنی بات دوہرائی۔ وہ دونوں بسن بھائی یقیناً ”اس کی عقل کا ماتم کر رہے تھے۔ جب ہی دونوں بالکل خاموش ہو گئے۔
 وہ سر پہ اور شام انہوں نے سید پور گاؤں کے مقامی لوگوں سے ملنے میں گزار دی۔ تھوڑی دیر کی خفگی کے بعد شاہ بانو کا موڈ خود ہی ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ بھی ان لوگوں سے جو گفتگو تھی۔
 ”ان لوگوں کے مسائل سننے والے کان لگتا ہے بالکل بند ہیں۔“ واپس میلے والی جگہ کی طرف آتے ہوئے ماہ نور نے کہا۔

”ہاں۔ وہ کان تو اسی پلینڈ ویلج (ایک منصوبے کے تحت بسائے گئے گاؤں) کی پروموشن کی تعریف سننے میں مشغول ہیں۔ یہاں آئے دن دھول بجتے اور تماشے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو ثقافت کے نام پر تفریح مہیا کر کے پیسہ کمایا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کی آواز سننے والے لوگ کہاں۔“ شاہ بانو نے کہا۔
 ”ویسے مائی!“ پھر شاہ بانو روک کر بولی۔ ماہ نور نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”کتنا بندہ سمجھا وہ لڑکا جو منہ مانگی قیمت دے رہا تھا اسکی۔“ شاہ بانو کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ماہ نور کی نظروں کے سامنے کا منظر یہ بات سن کر ایک بار پھر گنڈھ ہونے لگا تھا۔ اس کے ذہن نے پھر ایک جھٹکا کھایا تھا۔
 ”میں تم پر لڑو تو نہیں ہو گیا؟“ شاہ بانو نے شرارت سے ایک آنکھ بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔ ”کتنی فلمی صورت حال ہے۔ ایک ناچنے والا اسکی منہ مانگی قیمت۔ ڈھنگ لڑکا۔ وہ کیا بات ہے۔“
 ماہ نور تیز قدموں سے چلتی شاہ بانو سے آگے چلی گئی۔

”اچھا سوری!“ شاہ بانو کو لگا وہ اس مذاق پر ناراض ہو گئی تھی۔ ”میں صرف مذاق کر رہی تھی بھئی۔“
 ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ ”کوئی بات نہیں۔“
 ”کیا بات ہے مائی۔“ تم کیوں اتنی اپ سیٹ ہو جاتی ہو اچانک۔“ شاہ بانو نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”کچھ نہیں ہے۔“ ماہ نور نے سر جھٹکا۔ ”چلو عید بھائی بلا رہے ہیں۔“ اس نے شاہ بانو کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کال آئی دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں کیلری کی طرف چل دیں۔
 ”پنی سیٹیں پر قبضہ کر لو۔“ عید نے انہیں دیکھ کر دو کارڈ پکڑائے۔ ”سیوزیکل ٹائٹ شروع ہو رہی ہے۔“

انہیں ہر کام وقت پر کرنے کی عادت تھی۔ یہ کوشش بھی ان کے مزاج کا حصہ تھی کہ وہ جو بھی کام کر سں وہ مکمل ہو اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اپنی اس عادت کو وہ اکثر اپنے ساتھ کام کرنے والوں پر بھی لاگو کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس حد تک اس کوشش میں کامیاب رہے تھے کہ ان کے ہر پروجیکٹ کا عملہ مستعد اور چوکنا رہتا تھا۔ عملے کا جو رکن ایسا کرنے میں ناکام رہتا تھا ان کے پاس اس کی مدت ملازمت اکثر بہت مختصر ہوتی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان کے ہر پروجیکٹ کا عملہ ”پرفیکٹ پروفیشنل“ پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان کے قریبی دوست اور شناسا لوگ ان کے بارے میں اکثر ایک ہی رائے دیتے تھے۔ وہ انہیں پرفیکٹ بزنس مین کا خطاب دیتے تھے۔ وہ کسی کا نقصان کرتے تھے نہ کسی کو اپنا نقصان کرنے دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کی ایک اور خوبی خود اپنا احتساب کرتے رہنا تھا۔ وہ اپنی خامیوں غلطیوں اور نقصان

کا بھر پور تجزیہ کرتے اور انہیں نہ دہرائے کے طریقے سوچنے پر کافی غور و فکر کیا کرتے تھے۔
یہ ان کی پیشروانہ زندگی کی خوبیاں تھیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں وہ یہ سب اصول و ضوابط لاگو کرنے میں کامیاب رہے تھے یا نہیں یہ سوچنے کی بھی ہلال سلطان نے دانستہ کوشش نہیں کی تھی۔



سٹڈیٹ گولڈی لاک ریڈر اینڈنگ ہنسل اور گرٹل کی کہانیوں سے مطالعہ کا آغاز کرنے والی پری نے خود اپنے آپ کو ایسی ہیریٹی ٹیل (پریوں کی کہانی) میں موجود پایا تھا۔ پریوں کی کہانی کی پری مہمان، خوب صورت، خوش اخلاق، ہر ایک کی مدد کرنے۔ اور معجزے دکھانے والا کردار تھی۔ پری نے کہانیوں کی پریوں سے بہت کچھ سیکھا۔ مسز پیٹر نے اسے ہندسوں سے بھی متعارف کروایا اور یہ بھی بڑی مزے کی بات تھی کہ مسز پیٹر کے پاس ایسی کتابیں بھی تھیں جن میں ہندسے انسانی اور جانوروں کی شکلوں میں اپنا آپ متعارف کرواتے تھے۔

ہندسے جو بھی کتے، ہمیں جمع کرو، کبھی کتے ہیں، تفریق یا تقسیم کرو۔ بھی ایک چھوٹا ہندسہ اپنے سے اوپر والے ہندسوں کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہوتا ہے ان کو کچھ سے ضرب دے کر دیکھو یہ کتنے زیادہ ہوجاتے ہیں۔ ان ہی ہندسوں نے بھی انفرادی طور اور کبھی اکٹھے ہو کر اسے بتایا کہ وزن، رفتار، وقت اور رقبے کے بارے میں ان کے ذریعے کیسے جانا سکتا تھا۔ مسز پیٹر نے ہی اسے زبان سے روشناس کرایا۔ پریوں کی کہانیاں پڑھنے کے بعد اسے انگریزی اور اردو زبان کی ایسی کتابیں پڑھنے کو دیں جن سے اس کو زبان کے لہجے اور صرف و نحو کا پتا چلا۔ عارف بابا نے اسے مسز پیٹر کے ٹرنک کا خزانہ چاٹ لینے پر لگا دیا مگر عارف بابا کام کے معاملے میں سست نہیں تھے۔

پری کی دوپہر میں مسز پیٹر کے خزانے چاٹنے میں گزرتیں صبحیں اور شامیں سخت مشقت میں۔ وہ بلیو ہیون سرکس کی بچی تھی، جہاں باہر سے آکر لوگ کرتب دیکھتے تھے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے دیکھے ہوئے کرتبوں کا مظاہرہ کرتے تھے، پھر وہ تو پیدا ہی سرکس کی سرگرمیوں کے درمیان ہوتی تھی۔ اسے کرتب سکھانا اور سرکس کا حصہ بنانا لازمی تھا۔ پری کی تربیت چھوٹی چھوٹی گیندیں ہوا میں اچھال کر دوبارہ دوپٹے سے شروع ہوتی تھی۔ وہ ہوا میں گیند اچھالتی مگر دوبارہ پڑنے سے پہلے ہی گیند اوپر اٹھ کر چلی جاتی تھی کہ وہ کئی بار گیندوں کو قابو کرنے کی کوشش میں گری، کبھی منہ کے بل، کبھی بازو کے بل اور کبھی جھٹ، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھاگتے بھاگتے اس کا سر کی ستون یا سامنے آنے والے ہندسے سے ٹکرا جاتا۔ وہ گر کر منہ بسورتی۔ عارف بابا کی آواز اسے دانتیں بائیں سامنے یا عقب سے سنائی دیتی۔

”یہ تو بچک ہے پری بچک۔ جس کو آجائے وہ کبھی بھی کسی بھی چیز کو کچھ بھی بنا لیتا ہے۔ اندھے سے طوطا نکال لیتا ہے۔ رومال سے خرگوش اور پیٹ سے کیوٹر۔ تم نے تو خود دیکھا ہے عابد انکل از صائمہ آئی کے شوز میں کیا کیا نہیں ہوتا۔“

منہ بسورتی پری کے کان میں پڑنے والی یہ آواز بھی جادوئی اثر رکھتی تھی۔ اپنے چوٹ کھائے اعضا کی تکلیف بھول کر پری اپنی تمام گیندیں اکٹھا کر کے دوبارہ ہوا میں اچھالنے میں مشغول ہوجاتی۔

جول جول وہ بڑی ہوتی گئی گیند اچھالنے کا کرتب اس کے سامنے بچہ بنا گیا۔ بچہ پیچھے رہ گیا اور وہ بڑی سے بڑی ہوتی چلی گئی۔ صرف سات سال کی عمر میں وہ بھی شیر اور کتے قابو کر کے انہیں اپنی چھڑی کے اشارے پر چلانے، نوکیلی سوئیوں کے بستر پر بستے کھیلنے، آگ لگے رنگ میں سے مسکراتے ہوئے گزر جانے اور الماری میں بند ہو کر صندوق سے نکلنے کے کرتب پر مہارت حاصل کر چکی تھی۔

بلیو ہیون سرکس جس شہر میں چلی جاتا اس کے اشتہاروں اور بینروں پر پری کا ذکر خصوصی طور پر درج ہوتا۔

پری کی تصویریں بھی اشتہاروں پر موجود ہوتیں۔ ہاتھی اور شیروں پر نقار کے ساتھ بیٹھی بچی جو اپنے کرتبوں کے ذریعے تماشائیوں کو درمیان حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ لوگ مارے جھج اور شوق کے خاص طور سے اس چھوٹی بچی کے کرتب دیکھنے آتے تھے۔ جو ہر شیر کے جوڑوں کے ساتھ کھلے میدان میں تماشاکرتی تھی اور ہاتھیوں کی پشت پر کھڑے ہو کر ہوا میں لہرائی، قلابازیاں کھاتی، دوبارہ چلتے ہوئے ہاتھی کی پشت پر آن کھڑی ہوتی تھی۔ سرکس کے منتظمین پری کے کرتب عموماً آخر میں رکھتے تھے تاکہ تماشائیوں کے شوق اور جھج کو خوب ہوا دے لینے کے بعد اسے سامنے لایا جائے۔

پری کی رنگ میں آمد تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں ہوتی اور جب وہ رنگ سے نکلتی اپنے پیچھے تالیوں غنوں اور سیٹیوں کی گونج چھوڑ کر آتی۔
”پری کی چھڑی تلخ بھر میں ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔“

عارف بابا کو اپنی ٹریننگ پر فخر محسوس ہوتا تو وہ سینہ پھلا کر اعلان کرتے اور بہت دفعہ ایسا ہوا کہ عارف بابا کی یہ بات سننے ہوئے کچھ دیر سانس لینے کو سستائی ہوتی پری ٹریننگ ایریا میں اپنے سامنے موجود جانوروں اور انسانوں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگتی۔

”تماشا دیکھنے والے لوگوں کو یہ کبھی نہیں پتا چلے گا کہ ان ہاتھیوں، گھوڑوں، شیروں، کتوں اور انسانوں نے اپنے اپنے کرتبوں پر مہارت حاصل کرنے کے لیے کتنی مار کھائی، کتنی بار چڑیاں اڑھڑائیں۔ ان میں کتوں کے کاسٹو مزے کے پیچھے جسموں پر مار کے کتنے زخم اور کتنے نشان ہیں۔ تماشا دیکھنے والوں کو کبھی پتا نہیں چلتا اور کبھی پتا چلے گا بھی نہیں کہ ان کے سامنے آکر کھیلنے والے شیر کتنے دن بھوکے رکھے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنا کرتب دیکھنے کی ہار مان لیں۔ ان بڑے بڑے ہاتھیوں کی سورتی سخت کھالیں کہاں کہاں سے اڑھڑی ہوئی ہیں اور ان کتوں کے دانت کیسے کمزور کر دیے گئے ہیں۔“

”شش“ پھر وہ خود کو یاد دلاتی۔ ”تماشا دیکھنے والوں کو کبھی پتا چلنا بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ اگر انہیں پتا چل گیا تو انہیں تماشا بھول جائے گا۔ صرف ظلم یا درہ جائے گا اور دنیا بھر کے سرکس بند ہوجائیں گے۔“

وہ جیسے خواب اپنے کان میں سرگوشی کر رہی اور ایسا سوچتے ہوئے خود اس کے اپنے جسم پر بجائے کہاں کہاں تازہ اور مندل ہو چکے زخموں کا درد اٹھنے لگتا تھا۔ اس کے پیروں کے تلووں میں جلن شروع ہوجاتی۔ ٹریننگ کے دوران پاؤں ایک بار غلط پڑ جانے پر بجائے کتنے بیدار کی نذر کیے جاتے تھے۔

انیت کا ایک اہل اس کے اندر اٹھتا جس کو وہ صرف ایک چیز کے تصور سے اندر ہی بٹھا دیتی۔ اور وہ چیز مسز پیٹر کا خزانہ سے بھر اڑنگ تھا۔



وہ میوزیکل ٹائٹ بھی شاید ٹیلنٹ اینڈ اسکیم (کسی میدان سے متعلق خوبی اور مہارت رکھنے والے لوگوں کی تلاش کا منصوبہ) کے تحت منعقد کی گئی تھی۔ ایک سے ایک ایسا گروپ اسٹیج پر وارد ہورہا تھا جس کا پہلے کبھی کسی نے نام نہ تھا نہ گانا تھا۔ ان گروپس کے ساتھ مختلف صوبوں کے روایتی لباسوں میں ملبوس ان کے ساتھی عجیب و غریب رقص بھی کر رہے تھے۔

”ڈانس کمزیر“ ایک گروپ کی پر فارمنس دیکھتے ہوئے شاہ بانو نے ماہ نور کے کان میں سرگوشی کی۔

”سب سے ڈبا آکٹم ہے یہ اس میلے کا۔“ ماہ نور نے کہا۔ ”بہت فضول اور بکواس۔ وقت ضائع کر رہے ہیں ہم

لوگ بس۔“
 ”اے کیا کریں، پھنس گئے ہیں۔“ شاہ بانو نے بے بسی سے کہا۔ ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھ کر ایک لمبا سانس لیا اور پھر آنکھ کی طرف متوجہ ہوئی جس کے چاروں کونوں سے روشنیاں اٹھ رہی تھیں۔ ایک نیا گروپ سندھ کا کوئی علاقائی گیت سن رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا یہ گیت انگریزی لہجے میں گا کر اس کی سخت توہین کی جا رہی ہو مگر تماشاخیوں میں موجود نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بازو اٹھا اٹھا کر موسیقی کی تال پر رقص کر رہے تھے۔
 ”ہمارا اخلاقی چہرہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔“ ماہ نور کو خدیجہ آئی کی بات یاد آئی اور خدیجہ کی یاد کے ساتھ ہی اسے فاطمہ اور قلزہ ظہور بھی یاد آ گئیں۔

”نکل اس میلے سے فارغ ہو کر شاہ بانو سے کہوں گی کہ قلزہ ظہور کا پتا لگاتے ہیں۔“ اس نے دل میں سوچا اور کوئلے کے ٹکڑے سے چار کول تنک کا سفر کرنے والی قلزہ ظہور کے بارے میں سوچنے لگی۔
 وہ ان ہی خیالوں میں کم تھی جب اسے اچانک محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ارد گرد شور اور کچھ دیر پہلے چاہوا بلز تھم سا گیا ہو۔ اس نے چونک کر اپنے ارد گرد بیٹھے لوگوں کی طرف دیکھا جن کی تجسس نظریں سامنے اسے پہنچ رہی تھیں۔ ان ہی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی نظریں بھی اسے پہنچ رہی تھیں۔ اس نے اپنے اپنے ساز بجائے دو لڑکے کھڑے تھے اور ان سے آگے مائیک کے ساتھ جو لڑکا کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں تہہ کی ہوئی سفید چادر لٹک رہی تھی اور سر پر کس صوبے کی علاقائی ٹوپی تھی۔ اس کا اندازہ ماہ نور کو نہیں ہو سکا۔ اس لڑکے کے چہرے پر سیاہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی تھی۔
 ”میری آپ لوگوں سے صرف اور صرف ایک ریکولسٹ ہے۔ ہماری پرفارمنس کے دوران خاموش رہنے کی کوشش کیجئے گا۔“ پلیئر نوٹور تو تالیاں بٹینڈ نوٹور (میٹھیاں)۔“

”ایگرید؟“ (منظور ہے؟) مائیک والا لڑکا جو م سے اپنی درخواست کرنے کے بعد سوال کر رہا تھا۔
 مجمع میں موجود اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بس اور اچھل اچھل کر رضامندی ظاہر کر رہے تھے۔
 ”سوپلیئر! ایک سائنٹسٹ ناؤ۔“ (برائے مہربانی اب خاموش ہو جائیے)
 ان لوگوں سے منظوری لینے کے بعد وہی لڑکا بولا۔ مجمع بروقی طور پر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر میں ان گلوکاروں کے آلات موسیقی بجتے شروع ہوئے یہ کسی علاقائی گیت کی دھن تھی اور کانوں کو مانوس بھی لگ رہی تھی۔
 عشق تے آتش دونوں برابر

اوسے عشق دا تو کھیرا
 آتش سدا سارے ہے کچھ نہ پاں
 اوسے عشق سڈے دل جھپٹا
 آتش بانی نال بے چھندی
 اوسے عشق دا وارو کھپٹا
 غلام فرید او تھے جاہ نہ رکھی
 جتھے عشق لائے گاؤیرا

(عشق اور آگ دونوں برابر ہیں)
 لیکن عشق کی تپش الگ ہی ہوتی ہے
 آگ انسانوں کو بھوکا یا ساجلاتی ہے
 لیکن عشق میں دل جو جلتا ہے

آگ پانی سے بجھ جاتی ہے
 لیکن عشق کا کیا علاج ہے
 غلام فرید! وہاں مت تمہنا
 جہاں عشق نے ڈیرا لگا رکھا ہو
 گانے والا ایک جذب کے عالم میں گارہا تھا اور مجمع پر سکوت طاری تھا۔ ماہ نور کے ابرو اس آواز کی کشش سے اوپر چڑھے یا کسی اور بات سے۔ مگر وہ آنکھیں سکیڑے غور سے اس گلوکار کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
 یار ڈاڑھی عشق آتش لائی ہے

اس نے تان اٹھائی اور مجمع جیسے ہوش میں آ گیا۔ تالیاں میٹھیاں اور وادواہ کی آوازیں ہر طرف گونجنے لگیں۔
 ”سانٹنس پلیئر۔“ (سیخ سے گائیک روک کر درخواست کی گئی۔ آوازیں مدہم پڑنے لگیں۔)

یار ڈاڑھی عشق آتش لائی ہے
 دے یار سانوں لگ گئی بے اختیاری
 سینے دے وچ نہ سائی ہے
 یار ڈاڑھی۔

اسے پھر آواز ابھری۔

گانے والا ایک جذب کے عالم میں گارہا تھا۔ شور مچاتا، میٹھیاں بجاتا، تالیاں بیتنا مجمع سکوت کے عالم میں تھا۔
 ہویار سانوں لگ گئی بے اختیاری

الفاظ دہرائے جا رہے تھے اور ماہ نور کے کان جیسے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس نے اپنی سیٹ کی پشت چھوڑی اور سیٹ کے کنارے پر آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک پامپر بچانے کی مشق میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اس کے کان مانوس آواز کا تعاقب کر رہے تھے۔
 ہل ہلاں کے عشق جو آیا

اوسے پینڈے لیاں نے راہواں عشق دیاں۔

کھٹی کھٹی شام آئی ہے

ککھنہ جھڈے ویکھ وفاقاں عشق دیاں۔

”من من من۔“ ماہ نور کے کان بجتے لگے اور اس کی سماعتوں میں آوازیں گلدھ ہونے لگیں۔

بابے منگو کے میلے میں اکٹراہ بجاتا سائیں، سید پور پچر فیٹیول میں، بہترین ساؤنڈ سسٹم اور جدید ترین آلات موسیقی کے ساتھ مائیک پر گاتیاہ نوجوان۔

”یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے زور سے سر کو جھکا اور گلدھ ہوتی آوازوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔

”اے! اس کی آواز سنی ہے۔“ شاہ بانو نے حمرزہ انداز میں ماہ نور کا شانہ دیا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ کوک اسٹوڈیو کے اگلے یزن میں نظر آنے والا ہے۔“

شاہ بانو اس کے سنسناتے کان میں کہہ رہی تھی۔

پھلاں وری جندڑی عشق رلا جھڈ دا

سر بازار جالے عشق نچا جھڈ دا

ماہ نور کو لگا جیسے وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو رہی تھی۔ وہ حمرزہ انداز میں اٹھ کر آہستہ قدموں سے چلتی آگلی نشستوں طرف چل دی۔

”ماہ نور کہاں جا رہی ہو؟“ شاہ بانو اس کی پیچھے لگی۔
 ”یہ شخص۔۔۔ یہ شخص۔۔۔“ ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ شاہ بانو کو ایسا لگا جیسے اس کے سامنے ماہ نور نہیں کوئی زوہبی کھڑی ہو۔

”کون شخص؟“ شاہ بانو نے پریشان ہو کر اس جانب دیکھا جہاں ماہ نور دیکھ رہی تھی۔
 ”پلیز بیٹھ جائیں۔۔۔“ مجمع میں سے کسی نے ان دونوں سے درخواست کی تھی۔
 ”اچھا دھر آؤ۔“ شاہ بانو نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے نشستوں کے ساتھ خالی جگہ کی طرف لے جانا چاہا مگر ماہ نور اس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اسٹیج کے بیچ میں کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی۔
 ”فوبہ!“ شاہ بانو جھٹکائی اور ماہ نور کا بازو پکڑ کر اسے تقریباً ”گھٹکتی ہوئی خالی جگہ کی طرف لے گئی۔
 ”کیا ہو گیا ہے ماہ نور!“ شاہ بانو نے ماہ نور کو زور سے جھنجھوڑا۔

پھلاں دور کی جنڈری
 یار ڈاڑھی عشق آتش
 لکھنہ چھڑے
 سینے دے دیج نہ سمائی
 اوکھے پینڈے لیاں نے راہواں۔۔۔
 ماہ نور کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ چکرا کر گر جائے گی۔ الفاظ اس کی سماعتوں پر باز گشت کی طرح بکھر رہے تھے۔
 ”ماہ نور! ماہ نور!“ پھر اسے شاہ بانو کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔
 ”شاہ بانو! یہ شخص تپا نہیں کون ہے یہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے ہر جگہ۔“ وہ برتاؤ لائی۔
 ”مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ شاہ بانو نے کھرا کر کہا۔ ”چلو گھر چلتے ہیں۔“ وہ ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

اس نے پلٹ کر مجمع میں بیٹھے عید کو تلاش کرنا چاہا۔ عید اسے نظر نہیں آیا۔ شاہ بانو نے اپنا فون نکال کر عید کا نمبر ملایا۔ وہ بے چینی سے فون انیڈ کے جانے کی منتظر تھی۔
 ”جی جی بتاؤ تم کون ہو۔“ شاہ بانو کی گرفت ماہ نور کے ہاتھ پر ڈھیلی ہوئی اور وہ ہاتھ چھڑا کر کسی سمت لپکی۔ شاہ بانو فون بند کر کے اس کے پیچھے بھاگی۔
 اسٹیج پر کچھ لمحے پہلے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا شخص اپنے ساتھیوں سمیت نیچے آکر تماشائیوں میں شامل ہو رہا تھا۔ تماشائی اس کی آواز پر حیرت زدہ تھے اور اس کے خاموش ہونے پر جیسے طلسم ٹوٹنے کے بعد ہوش میں آئے تھے۔
 ”وُس مور وُس مور۔“ تماشائی اس سے مطالبہ کر رہے تھے اور ماہ نور نے تماشائیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

”تم چھلاوے ہو، ساجر ہو یا تم بہرو پیو ہو۔“ ماہ نور نے اس لڑکے کا بازو پکڑ لیا، جس نے سیاہ رنگ کی شلوار قمیص اور پگڑی پہن رکھی تھی۔
 لڑکے نے تھک کر شور مچاتے حاضرین کے درمیان اس لڑکی کو دیکھا جس کی گرفت میں اس کا بازو یوں جکڑا تھا جیسے کسی طور نہیں چھوڑے گی۔
 ”اشاپ! ماہ نور! کیا بے وقوفی ہے۔“ شاہ بانو نے بھی کسی نہ کسی طرح لوگوں کے درمیان راستہ بنا لیا تھا اور ماہ نور تک جا پہنچی تھی۔

”تمہیں نہیں پتا ہے ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتیں۔“ شاہ بانو نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ شور مچانے لگی۔ شاہ بانو نے جھل ہو کر واپسی سے اس منظر کو دیکھتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا، کیمروں کے فلاش جگہ جگہ جل بکھ رہے تھے۔
 ”آئی ایم رینکی سوری۔“ شاہ بانو نے اس لڑکے سے کہا۔ اس کی نظروں میں شرمندگی تھی۔
 ”اس لڑکے۔۔۔ لڑکے نے نرمی سے ماہ نور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنا بازو پھڑکایا۔
 ”کابے کو جذباتی ہو رہی ہو مس!“ مجمع میں سے کسی نے جملہ کہا۔ شاہ بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
 ”تو ہونگ پلیز۔“ وہ لڑکا اس طرف رخ کر کے بولا، جہاں سے جملہ آیا تھا اور ان لڑکیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا ہاتھ ہلانے لگا جو اپنے ہاتھوں بازوؤں، مفلوں اور دوپٹوں پر اس کے آؤگراف مانگ رہی تھیں۔
 ”جسٹ ویٹ فور مائی فیکسٹ سونگ۔“ (میرے اگلے گانے کا انتظار کرو) مائیک پر اس کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ ہاتھ ہلاتا ہوا حاضرین کے درمیان پھر رہا تھا۔
 ”آئی ایک گو ٹنگ ٹو سٹک رائی حانہ۔“
 (میں رائی حانہ کا گانا گانے والا ہوں) وہ بلند آواز میں نوجوان لڑکے لڑکیوں سے مخاطب ہوتا دھر ادھر گھوم رہا تھا۔
 ”ٹوک پچر شو میں رائی حانہ، کس کس نے سنا ہے یہ گانا؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ اب قدرے ہوش میں نظر آرہی تھی۔
 ”چلو یہاں سے۔“ شاہ بانو نے ڈپٹ کر کہا۔ ماہ نور بغیر بحث کیے کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل دی۔
 ”پاکستان کے شفاقی شو میں بدیسی گانا کون سنا چاہتا ہے۔“ وہ ہی لڑکا اسٹیج کے بیچ میں کھڑا مجمع سے پوچھ رہا تھا۔
 حاضرین ہاتھ اٹھا اٹھا کر ووٹ دے رہے تھے۔
 ”مجھے امید ہے کہ آگنڈا زبرائیں مانیں گے۔“ وہ کہہ رہا تھا اور پھر اسٹیج سے میوزک شروع ہوا۔
 روشنی میں چلتے زور دہیرے
 اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہیں
 تمہارا سایہ میرے سائے کے پاس سے گزرتا ہے
 کیا ہو جو یہ جاندار ہو جاتے ہیں
 میں ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں
 اور میں اپنے محسوسات کا انکار نہیں کر سکتا
 لیکن مجھے اسے جانے دینا ہے۔
 ہمیں محبت ایک ایسی جگہ ملی جہاں پر ملنے کی امید نہ تھی۔
 کچھ دیر پہلے سرائیکی لہجے میں کافی سنانے والا نوجوان انگریزی کا ایک مشہور گانا گارہا تھا اور حاضرین پر دیوانوں کی کیفیت طاری تھی۔
 ”یہ توور شامل ہے۔“ شاہ بانو نے سوچا۔
 ”یہ وہی ہے۔“ ماہ نور گاڑی میں بیٹھ کر برتاؤ لائی۔ جگہ جگہ نصب اسپیکر زبر آواز ابھر رہی تھی۔
 لیکن بابے منگو کے میلے کا سا میں رائی حانہ کو کیسے گا سکتا ہے۔ بندر کے تماشے دکھانے والی سید پور کلچر فیسٹیول میں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ منطق اور بصارت کی کشمکش بری طرح شروع ہو چکی تھی۔
 ماہ نور اپنے ذہن اور اپنے دل میں یہ جنگ لڑ رہی تھی۔ نہ منطق بصارت کو شکست دے پار رہی تھی نہ بصارت منطق کو۔ گھر پہنچتے تک ان دونوں کی کشمکش میں ماہ نور تھک چکی تھی۔ اس کا سر میٹ کی پشت پر ٹکا ہوا تھا

”نہیں یہ وہ نہیں ہے۔“ پھر وہ خود سے مخاطب ہو کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

شاہ بانو نے یقین نظروں سے ماہ نور کی یہ ساری حرکات دیکھ رہی تھی۔
 ”ایک سائیں رائی خانہ کو کیسے گا سکتا ہے۔“ ماہ نور نے شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ ”ہے نا؟“

”یہ جو سنگر تھا عبید بھائی! یہ وہی لڑکا تھا نا جو چار کول اسکیج خریدنے کی بات کر رہا تھا؟“ ماہ نور سیدھی ہو کر بیٹھنے ہوئے عبید سے مخاطب ہوئی۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ عبید نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”اوہ خدایا!۔۔۔ آپ لوگ کیوں نہیں پہچانتے یہ وہی تھا بالکل وہی۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ماہ نور! یہ وہ لڑکا نہیں تھا۔“ عبید بھائی نرمی سے بولے۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں شاہ بانو! وہ یقین دلانے والے انداز میں شاہ بانو سے مخاطب ہوئی۔

”دو روہ جو پہلے اس نے سنایا تھا وہ سائیں جیسا تھا، وہ سائیں بھی یہی تھا۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”اچھا۔۔۔ چلو گھر چل کر پہلے آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔ شاید تم تھک گئی ہو۔“ شاہ بانو نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

گاڑی سید پور سے باہر نکل آئی تھی۔ سید پور کے درو دیوار سے گانے والے کی آواز نکل رہی تھی۔



ماہ نور کے ماموں کے گھر گاڑی رکنے پر شاہ بانو نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی بھی سحر زدہ نظر آ رہی تھی۔ وہ ماہ نور کے ساتھ گھر کے اندر گئی اور اسے اس کمرے تک لے گئی۔

”ماہ نور! تم پہنچ کر لو۔“ شاہ بانو نے اس کا بیگ ٹیبل پر رکھ کر کہا۔ وہ بغیر کسی بحث کے واش روم میں چلی گئی۔
 دس منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل نظر آ رہی تھیں اور چہرہ مٹا ہوا تھا۔

”چلو اب تم لیٹ جاؤ۔“ شاہ بانو نے کہا اور اس کے لیٹ جانے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ سہلاتی رہی پھر آہستگی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔
 ”ماہ نور کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا ہے وہ کل دیر تک سوئے۔“

اس نے لاؤنج میں بیٹھی ماہ نور کی ممانی سے کہا۔ انہوں نے سر ہلادیا۔ شاہ بانو ماہ نور کی طرف سے خاصی پریشان تھی۔ اس نے راستہ بھر عبید سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی اچھی خاصی سمجھ دار دوست کو شاید کوئی جن چٹ گیا تھا۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں ایک ہی خیال سر اٹھا رہا تھا۔



لاری ایک جھٹکے کے ساتھ کسی جگہ رکی تھی۔ لاری کا کنڈیکٹر اس جگہ کا نام لے رہا تھا۔ مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے منظر پر نظر جمائے سعدیہ کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اماں نے اسے چونکا دیا۔

”چلو اٹھو۔ ہماری منزل آگئی۔“ اماں نے چچی آواز میں کہا۔

”تم جلدی سفر ختم ہو گیا۔“ سعدیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ جلدی ہے؟“ اماں نے اسے گھورا۔ ”دھائی گھنٹے ہو گئے بس میں بیٹھے بیٹھے۔“

سارا سفر نہر کے ساتھ ساتھ ہی گزرا تھا۔ راستے میں کچھ دیر کے لیے نہر غائب ہوئی لیکن ایک جگہ موڑ کاٹ کر

جب لاری کی سڑک پر چڑھی تو سرحد دوبارہ نظر آنے لگی۔ سرحد پر پانی بہت زیادہ نہیں تھا اور یہاں اس میں تریبونوں کی جگہ بھی نہیں نہ رہی تھیں۔

”ہائے! ان کو کتنا مزہ آ رہا ہوگا۔“ سعدیہ کو بھیمنوں پر رشک آیا۔ خود اس کے اپنے کپڑے پسینے کی وجہ سے جسم کے ساتھ چپکے رہتے تھے اور پیاس کے بارے برا حال تھا۔

”یہ سولنگ اندر کو جاتا ہے گاؤں کی طرف۔“ اس نے سنا ایک شخص اباجی کو بتا رہا تھا۔ اباجی ایک طرف کھڑے چند مرل گھوڑوں والے ناگلوں کے سوتے سوتے کو چوانوں میں سے ایک سے مخو گفتگو تھے۔

اب اباجی ایک مرل گھوڑے والے ناگے پر سامان سوار کر رہے تھے۔ جس جگہ وہ لوگ کھڑے تھے۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر نہر کے کنارے ایک ہینڈ پمپ لگا تھا۔ سعدیہ نے بغیر کچھ بولے اباجی سے ہاتھ چھڑایا اور ہینڈ پمپ کی طرف لپکی۔ پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ سعدیہ نے نکلا چھوڑ کر پمپ سے اگلنے پانی کے آگے ہاتھوں کی اوک بنائی۔ تھوڑا پانی اس کی پیاس بجھانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس نے ایک بار پھر نکلا زور و شور سے چلایا اور پھر اگلنے پانی کے آگے ہاتھ باندھ لیے۔ اس کے کپڑے بھی اس کو شش میں بھیگ رہے تھے اور اسے یہ کیلے ہوتے کپڑے اچھے لگ رہے تھے۔

”سعدیہ! اماں کی ڈھنٹی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں اس کے سر پر کھڑی تھیں۔

”برا ٹھنڈا پانی ہے اماں! آپ بھی لیو منہ دھو لو۔“ سعدیہ نے منہ پر کچھ دیر پہلے مارے پانی کے چھپا کے کے آنکھوں پر دھ جانے والے قطرہوں کے پیچھے سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ اماں کے سخت لہجے نے اسے ڈرایا۔ ”چلو۔ اباجی ناراض ہو رہے ہیں۔“ اماں نے سختی سے اس کا بازو پکڑا اور دوبارہ اسی جگہ لے آئیں۔ جہاں وہ پہلے کھڑی تھی۔

”لو پانی پینے پر بھی ڈانٹ۔“ سعدیہ نے سوچا۔ ”راستے بھر لاری میں ٹھنڈے شربت اور ٹھنڈے پانی والے چڑھ کر بیٹھے آتے رہے، کسی نے ایک گلاس نہیں لے کر دیا۔ اب یہ تو مفت کاپانی تھا اس پر بھی ناراضی؟“

اس کے دل کی یہ خفگی اور بھی بڑھ گئی جب اماں نے اسے اندر جاتے ایک رستے کی طرف دھکیلا۔ سامان والا ناگہ آگے آگے چل رہا تھا۔ اور اباجی اس کے پیچھے پیدل چل رہے تھے۔ اماں اس کا بازو پکڑے اباجی کے پیچھے چلے گئیں۔ گویا ان کو اگلا راستہ پیدل چل کر طے کرنا تھا۔

”ہم ناگے پر کیوں نہیں بیٹھے؟“ اس نے منہ اٹھا کر اماں سے سوال کیا۔

”دیکھتی نہیں کیا مرل ناگہ ہے، سامان ہی لے جائے بڑی بات ہے۔“ اماں نے نقاب کے پیچھے سے جواب دیا۔

”او نہ!“ وہ خفگی سے بولی۔ ”دوسرے ناگے کا گریہ بچایا ہو گا اباجی نے۔“

اس نے سوچا اور اپنا غصہ نکالنے کے لیے راستے میں آئے ایک پتھر کو جوتے کی نوک سے ٹھوکر ماری۔ پتھر اڑ کر ذرا آگے جا کر گر گیا، پتھر کے قریب پہنچ کر سعدیہ نے اس کو دوسری ٹھوکر ماری۔ پتھر کچھ اور آگے جا کر ا۔ اب وہ اس نئے شعلے میں مشغول ہو گئی۔ وہ پھر سعدیہ کی ٹھوکر سے اڑا کر اس کے ساتھ اس جگہ تک پہنچ گیا جو سعدیہ اور اس کے گھرانے کا نیا گھرانہ تھا۔



”ایک بات غور سے سن لو اور مگرہ سے باندھ لو، ایسی کوئی تصویر پر نٹ میڈیا میں نہیں جائے گی اور ایسا کوئی شاٹ الیکٹرانک میڈیا پر نہیں چلے گا انڈر اسٹینڈ!“

”رائٹ۔“

”آئی ہو پ۔ کچھ یہ بات دوبارہ کرنے کے لیے تمہیں کال نہیں کرنا پڑے گی۔“

”لیکن سر! وہ جو لوگوں کے پرنٹ ویڈیوز ہیں۔ وہ جو سوشل ویب سائٹس اور یوٹیوب وغیرہ۔“

”معاذ اللہ! یہ جو تم مین مین کر رہے ہو، اس کا کل نم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔“

”ہاں سر!“

”پھر پہلی بات ہی آخری بات بھی ہے۔ میں کہیں بھی اس کے بارے میں کچھ دیکھنا سننا نہیں چاہتا۔“

”جی سر!“

”اوکے۔“



وہ کتنے گھٹنے سوئی تھی اسے اندازہ نہیں ہوا۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس کے کمرے کی کھڑکیوں پر دینے پر وہ ہونے کی وجہ سے کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود ہر چیز کے خدوخال مدھم سے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک بار آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اسے لگا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن شاید سوچنے اور محسوس کرنے کا بوجھ نہیں اٹھایا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا وہ پول کیوں لپٹی ہوئی ہے۔

کچھ سمجھ میں نہ آنے پر اس نے سوچنے کی مشقت چھوڑی اور پہلو بدل کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل فون اٹھانے کے لیے ہاتھ مارا۔ موبائل فون وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ چونک کر اٹھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ سیل فون اس کے ساتھ کہیں رکھنا نہ ہو۔ وہ اٹھ کر بیڈ گئی۔

اسے سامنے میز پر رکھا اپنا شوڈر بیگ نظر آیا۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر اپنا بیگ اٹھایا اور واپس بیڈ پر بیٹھ کر اس میں اپنا فون تلاش کرنے لگی۔

فون نکال کر اس نے اس کی اسکرین روشن کی۔ تاریخ اور وقت دونوں نے ہی اس کو حیران کر دیا۔

مسٹر کالز کی لمبی فہرست تھی۔ اس میں ایک نام معلوم نمبر بھی تھا۔ ”ایا“ ممی علمان اور شاہ بانو کے مسیح جی کے علاوہ میڈ آرٹ گیلری مسیح تھا۔ جس میں گیلری انتظامیہ سے بہترین تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور اس کے اسکیم جی کے تعریف کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اپنے فروخت شدہ اسٹینج کی قیمت طے کرنے کے لیے گیلری کے اسلام آباد آفس میں تشریف لائے۔

اس نے سر جھٹکا اور ممی کو کال کی۔ وہ حسب توقع پریشان تھیں۔

”اسی لیے میں تمہیں وہاں بھیجے پر متال تھی۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”اپنے گھر کے علاوہ تمہیں کہیں رہنے کی عادت جو نہیں ہے۔“

”کیسی بات نہیں ہے ممی! سردار چاچا کے پاس بھی تو رہی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”میں شاید کل زیادہ تھک گئی تھی۔“

”اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ سرین یا فرقان نے کل سے تمہاری خبر نہیں لی۔ دیکھا بھی نہیں کہ تم آخر جاگ کیوں نہیں رہی ہو۔“ ممی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ کو پتا ہے کیلہ دونوں بہت مصروف ہوتے ہیں۔“ اس نے اپنی اکثری ہوئی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں بھی کیا مصروفیت کہ گھر میں آئے چند دن کی مہمان کی خبر ہی نہ لی جائے۔“ مٹی کو غصہ آگیا۔

”تم صبح ہی سامان اٹھاؤ اور شاہ بانو کے پاس چلی جاؤ۔“ تھوڑی دیر بعد ان کی آواز آئی۔

”اے دوا! ماہ نور ایک دم خوش ہو گئی۔“ واقعی مٹی!

”ہاں واقعی۔“ وہ نرمی سے بولیں۔

”اور اگر شاہ بانو ابھی کچھ دن اور رکے گا تو۔“ وہ منمنائی۔

”تو تم بھی رک جانا۔“ وہ فراخ دلی سے بولیں۔ ”اب گھر سے نکلی ہی گئی، ہوتو ذرا گھوم پھر لو۔“ ماہ نور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

”اور فرقان اور نسرین سے تو مجھے سخت شکوہ ہو گیا ہے۔“ وہ ناراض لہجے میں بولیں۔ ”دل میں شکوہ ہو تو پھر اس شخص سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ورنہ گناہ گاری ہو جاتی ہے۔“

ماہ نور ماں کی یہ بات سن کر بے اختیار مسکرا دی۔ بظاہر اتنی سخت مزاج خاتون کے اندر اللہ سے ہر دم ڈرنے والا دل موجود تھا۔ ماہ نور کو اس کا بہت اچھی طرح اندازہ تھا۔

”مٹی! آئی لیو۔“ ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

”چلو اب تم اٹھو، خود ہی بچن میں جا کر کچھ کھا لو، مجھے یقین ہے نسرین کا فرقن کھانے کی اشیاء سے بھرا ہو گا، چاہے انہیں کھانے والا کوئی نہ ہو۔“ وہ ہنس کر بولیں۔

”مٹی! یہ بھی غیبت ہوتی ہے۔“ ماہ نور نے انہیں یاد دلایا۔

”اے ہاں! آئی ایم سوری۔“ انہوں نے کہا۔

”چلو پھر اٹھ کر کچھ کھالو، صبحی کو بتا دینا کہ تم نے فرج سے کیا کیا لیا تھا۔“ وہ ہنسیں۔ ماہ نور نے مسکراتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

”مٹی! یہ سولہ اسکیچ“ (فروخت شدہ تصویروں) پھر اس نے دوبارہ آرٹ گیلری سے آیا پیغام پڑھا۔ ”اچھا دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دی اور اٹھ کر دوش رو کم کی طرف چل دی۔

☆☆☆

شاہ بانو اس کا فون سن کر خوش بھی تھی اور تھوڑا پریشان بھی۔ ماہ نور کو جس کیفیت میں دودن پہلے وہ اس کے ماموں کے گھر چھوڑ کر آئی تھی اس کے لیے وہ کیفیت پریشان کن تھی۔ اب ماہ نور اسے خبر دے رہی تھی کہ اس کی مٹی چاہ رہی تھیں کہ وہ شاہ بانو کے ساتھ رہے۔

”تم ٹھیک تو ہونا! شاہ بانو نے ماہ نور سے بار بار پوچھا تھا۔

”ہاں۔ ایک دم ٹھیک۔“ وہ ہنسیں لہجے میں ہنس رہی تھی۔

”ماہ نور کو تو شاید جتنا ہی دور بے پڑنے لگے ہیں۔“ ماہ نور کو اس کے ماموں کے ہاں سے لینے کے لیے آتے ہوئے شاہ بانو مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

”لیکن یہ جن اسے چمٹا کہاں اور کیوں؟“ پھر اس نے سوچا تھا۔ ”جن ہی تو تھا جو پاگلوں کی طرح فوک میوزک کے ریکارڈز جمع کر رہا تھا اس سے۔“ شاہ بانو کو اپنی ہی سوچ پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

”اور اس لڑکے کو محترمہ سائیں سمجھ رہی تھیں جو رائے خانہ کا نمبر گارہا تھا اور کیا خوب گارہا تھا۔ کاش اس روز

ماہ نوریوں ری ایکٹ نہ کرتی تو اس لڑکے کے گائے ہوئے گائے تو سننے کو مل جاتے۔ اللہ جانے اور کتنی دیر اسٹیج پر رہا ہو گا وہ تو بھی منوں میں کراؤڈ کے لیے heart throb (دل کی دھڑکن) بن گیا تھا۔

”نام پتا نہیں کیا تھا اس کا؟“ ماہ نور کے ماموں کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے شاہ بانو نے سوچا۔ ”چلو سید پور فیشیول کی ویڈیو زاپ لو، وہی جاسیں کی سب پتا چل جائے گا۔“ اس نے خود کو تسلی دی اور ماہ نور کے ماموں کے گھر میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

بارہ سال کی عمر تک بچتے بچتے پری بلویہون سرکس کے ساتھ میلوں کا سفر طے کر چکی تھی۔ اور اب تاروں اور ریوں پر کرتب دکھانے کے علاوہ انٹیل بار پر کرتب دکھانے میں اس سے زیادہ ماہر کوئی دوسرا شخص سرکس میں نہیں تھا۔

”پری تو بلویہون کا ایسا اثاثہ ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔“ عارف خان بابا سینہ تان کر کہتے۔

”پری انگریزی بولتی ہے اور پری رنگ میں پری کی چھڑی جیسے کرشمے دکھاتی ہے۔“ مسٹر پیٹر اپنا کیریڈ لیتا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔

سرکس رنگ میں شام کے وقت پری سے زیادہ پر جوش ماہر اور میلہ لوٹ لینے والا کوئی دوسرا فنکار نظر نہیں آتا تھا۔ گردن کے وقت سرکس کی خاموش چھولدار یوں میں سے کسی ایک میں ایک بالکل مختلف پری ہوتی تھی۔

سرکس میں آئے روز نئے نئے لوگ شامل ہوتے تھے، کچھ عرصہ گزار کر چھوڑ جانے والے بھی لگتی ہوتے تھے۔

”مجھے مسخو بننے کا شوق ہے۔“ میں گھر والوں سے چھپ کر آیا ہوں۔“ کوئی درخواست کر رہا ہوتا۔

”مجھے ہاتھی اور گھوڑوں کے ساتھ کرتب کرنے ہیں جناب! میں نے نیوی پر یہ کرتب دیکھے ہیں۔ مجھے اپنے پاس جگہ دے دیں۔“ کوئی اور کہتا سنائی دیتا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق

خوبصورت چھاپائی

شائع ہو گئے ہیں

مضبوط جلد

آفٹ پیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درودی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امرتیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

لوہی باروں پر چل کر کتب دکھانے کا دعویٰ دار ہوتا اور کسی کا خیال ہوتا کہ اس سے بستر موت کے کوئیں میں موڑ سائیکل کوئی نہیں چلا سکتا۔

آنے والوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل ہوتے تھے۔ بری ایسے منظر بچپن سے ہی دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اکثر یہ لڑکے اور لڑکیاں عمر میں اس سے بڑی ہوتی تھیں۔ پہلے پہل اس نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا مگر جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی اس کا شعور بھی بیدار ہو رہا تھا۔ اور کئی قسم کے سوال اس کے ذہن میں اٹھنے شروع ہو چکے تھے۔

”لوگ جو ادھر ادھر سے آئے ہوئے ہیں ان کے تو اپنے گھر بھی ہیں۔ ماں باپ بھی ہیں۔“ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو دیکھ کر سوچتی۔ ”میں کون ہوں؟ میں کہاں سے آئی ہوں میرے ماں باپ کون ہیں؟“ اس کا ذہن ان سوالوں کی زد میں رہنے لگا تھا۔

”ارے تو تو سرکس کی تہہ پہنچ رہی۔“ عارف بابا نے ایک بار اس کے سوال کے جواب میں کہا تھا ”تو سرکس کی بیٹی ہے۔ سرکس ہی تیرا گھر ہے اور یہاں ہم سب جو کرتے دکھانے والے ہیں تیرے ماں باپ ہیں۔ تو دیکھتی نہیں سب تجھ سے لکتا پیرا کرتے ہیں۔ سب کے لیے تو کتنی اہم ہے۔“ وہ اس کا دل راضی کرنے کی کوشش میں کرتے۔

مگر بری کا دل ان جوابوں سے کبھی راضی نہ ہو سکا تھا۔ وہ دس سال کی عمر میں ہی یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ وہ یہاں موجود کسی بھی شخص کی بیٹی نہیں تھی۔ یہاں کوئی عورت اس کی ماں تھی نہ کوئی مرد اس کا باپ تھا۔ چند ماہ اور آگے بڑھنے پر اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس حقیقت پر کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے اپنا تنہا سا دل کتابوں اور تربیت کے علاوہ ادھر ادھر کے کاموں میں لگانا شروع کیا۔ سرکس کی بیٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہونے کے باعث وہ بلا روک ٹوک سرکس سے متعلق ہر شخص سے بات کر سکتی تھی اور اس کے کام کے متعلق پوچھ بھی سکتی تھی۔

وہ چھو لاریاں نصب کرنے، سامان بچانے، سرکس رنگ تیار کرنے، لوگوں کا کھانا بنانے، جانوروں کا رات تیار کرنے والوں سے لے کر نٹے پرانے تمام فنکاروں پر ان سے چھوٹی ہونے کے باوجود رعب جما کر بات کر سکتی تھی۔ اور کچھ عرصہ اس نے ایسا کیا بھی۔ یہ سب لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ اس کی ایک شکایت پر وہ اپنے کام سے ہر طرف کیے جاسکتے تھے۔ مگر وہ تھوڑے ہی عرصے میں اس مشغلے سے بھی اکتانگ ہو گئی۔

جانوروں کی تربیت دینے والے اریا میں کم ہی کوئی دوسرا شخص جاسکتا تھا سوائے ان کو تربیت دینے والوں کے۔ بری کو وہاں جانے سے بھی کوئی نہیں روکتا تھا۔ مگر یہاں کے مناظر وہ لادینے والے تھے۔ بری نے اپنی آنکھوں سے خوفناک جانوروں کو ہفتوں کی تربیت میں انسانی اشارے کے سامنے بیٹھ کر دیکھا جن کے تصور سے ہی عام انسان کو خوف آجائے۔

کچھ ہفتوں میں اس کی برداشت جواب دے گئی اور اس کے بعد اس نے فرصت کے دنوں میں ادھر ادھر پھرنے کے بجائے اپنی چھو لاری میں چارپائی پر لیٹے لیٹے دن گزارنے شروع کر دیے۔ ان ہی دنوں میں اس نے سرکس سے باہر کی دنیا کے بارے میں سوچا۔ اس کے تصور میں وہ زندگی اتنی ہی نہیں تھی جو سرکس کے باہر ہو سکتی تھی۔ جب بھی وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے وہ راستوں میں نظر آنے والے مناظر کو دیکھتی اور اسے لگتا سب سے اچھی زندگی سرکس کے اندر ہے۔

وہ اس سے آگے کا شاید سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر اس نے فن کے مظاہر ہوں کے دوران پتے جانے والے

شاہ بانو نے ماہ نور کو غور سے دیکھ کر اپنی تسلی کرنے کی کوشش کی کہ وہ بالکل نارمل تھی یا نہیں۔ ”تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ ماہ نور نے مسکرا کر پوچھا۔ ”ویسے ہی۔“ شاہ بانو نے اس پر سے دھیان ہٹا لیا۔ ”تم مجھے اتنے عرصے سے جانتی ہو شاہ بانو! کیا میں پہلے کبھی تمہیں یوں ایب نارمل لگی۔“ اپنا سامان شاہ بانو کی گاڑی میں رکھنے کے بعد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر ماہ نور نے شاہ بانو سے کہا۔ ”مجھے تمام بھی ایب نارمل نہیں لگ رہی ہو۔“ شاہ بانو نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ابھی کی نہیں میوزیکل نائٹ والے روز کی بات کر رہی ہوں۔“ ماہ نور نے سامنے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں اس روز۔“ شاہ بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ ”میں تمہاری جگہ ہوتی تو کسی کو اس طرح ری ایکٹ کرتے دیکھ کر یونی پریشان ہوتی جیسے تم ہوئیں۔“ ماہ نور نے اعتراف کیا۔

”وہ ری ایکشن نہیں تھا۔“ شاہ بانو نے گھٹو بدلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ جو کچھ تھا اس وقت تماشا بن رہا تھا۔“ اس نے بدستور سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی۔

ماہ نور نے چونک کر شاہ بانو کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“ ”تم کیا سمجھتی ہو ماہ نور۔“ شاہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہزار ڈیڑھ کے مجمع میں تم ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر چیخو چلاؤ کی تو کیا اس کو کوئی عقیدت کا اظہار قرار دیا جائے گا۔ وہ سادہ ترین لفظوں میں تماشا تھا۔ جس کو دیکھ کر لوگ محظوظ ہو رہے تھے، جملہ بازی کر رہے تھے اور بہت سے اس لمحہ کی تصویریں بھی لے رہے تھے شاید کسی نے اس کی ویڈیو بھی بنالی ہو۔“ شاہ بانو کے لہجے میں خفگی تھی اور غصہ بھی۔

ماہ نور کو لگا کہ اس کے جسم کا سارا خون چہرے کی چھوٹی چھوٹی رگوں میں جمع ہو گیا ہے جو کسی بھی لمحہ پھٹ کر باہر بھی آ سکتا تھا۔

”مجھے نہیں پتا میں نے۔ مجھ سے یہ کیوں ہو گیا۔“ اس نے کچھ دیر کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ شاہ بانو نے پورا دھیان گاڑی ڈرائیو کرنے کی طرف مبذول کر لیا تھا۔ ”آئی سوئیر۔ شاہ بانو! ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔

”میں تو سمجھتی ہوں ماہ نور۔“ شاہ بانو نے بدستور سامنے نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ ”مگر لوگ نہیں

ماہ نور اپنے آنسوؤں کو قابو نہیں کر پار ہی تھی۔
 ”شاید میں الوٹنز (واہوں) کا شکار ہو گئی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”مگر یقین کرو۔ مجھے کئی بار مختلف جگہوں پر ایک ہی شبیہ کے لوگ نظر آئے ہیں۔“
 شاہ بانو نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”ہر بار ان کے کام مختلف ہوتے ہیں، ہر بار جگہ مختلف ہوتی ہے، ان کی موجودگی کے پس منظر مختلف ہوتے ہیں، مگر ہر بار بھی چہرے، کبھی آنکھیں، کبھی ہاتھ اور کبھی آواز اتنی مماثل ہوتی ہے کہ میرا ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔ پھر میں کچھ سوچنے بچھنے کے قابل نہیں رہتی۔“
 ”ایسا کب سے ہو رہا ہے؟“ شاہ بانو نے پوچھا۔
 ”کافی عرصہ ہو گیا، جب میں گاؤں گئی تھی اس وقت سے۔“ ماہ نور نے سر جھکا کر گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کے ناخنوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔
 ”میں کوئی سائیکالوجسٹ یا سائیکارٹرسٹ تو نہیں ہوں۔“ شاہ بانو نے اس کی طرف نرمی سے دیکھا۔ ”لیکن جو تمہاری کیفیت ہے اسے شاید یہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔“
 ماہ نور شاہ بانو کی بات کے جواب میں کچھ نہیں بولی۔
 ”چلو خیر، اب ہم ساتھ رہیں گے۔ کچھ دن، گھومیں، پھیریں گے۔ تمہارا ذہن بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ شاہ بانو نے عبید کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے کہا اور گاڑی کا ہارن بجانے لگی۔
 ”میں اس کو اپنی بات سمجھا سکتی ہوں۔ نہ یہ سمجھ سکتی ہے۔ پھر بات کرنے کا فائدہ کیا۔“ ماہ نور نے عبید کے گھر کے پورچ میں گاڑی سے اترتے ہوئے سوچا۔

”تمہارا اسکیچ پچاس ہزار روپے میں بکے ماہ نور۔“ اس رات کھانے کی میز پر عبید بھائی نے اچانک اسے بتایا۔
 پلیٹ میں چمچ چلا نا اس کا ہاتھ ایک دم رگ گیا۔
 ”مگر میں نے تو نہیں بیچنا تھا عبید بھائی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔
 ”ہاں، بھئی۔ میں نے بھی اس لوکے کو تمہارا پیغام دے دیا تھا۔ مگر وہ مفت میں لینے پر تیار نہیں تھا۔ پھر شہ ازجو میرا کو لیک ہے اس نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک مناسب سی رقم اس سے لے کر تمہاری طرف سے کسی رفاہی ادارے کو دے دیجے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ عبید بھائی نے سب کچھ کہنے کے بعد اسے یوں بتایا تھا جیسے انہیں یقین ہو اس پر وہ برا نہیں مانے گی۔
 ”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

”شاہ بانو! سید پور میلے کی ویڈیو میری USB میں موجود ہے، تم کاپی کر لیتا۔“ عبید بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ”حیرت ہے۔ میں اس روز سے تمام سوشل ویب سائٹس کی ویڈیو وغیرہ سب چیک کر چکی ہوں۔ کہیں مجھے اس سے متعلق کچھ نہیں ملا۔“ شاہ بانو کو اچانک یاد آیا۔
 ”سب رائٹس محفوظ ہیں۔ سختی سے آرڈر ہو چکا ہے اس لیے کہیں یہ نہیں چلائی جائے گی۔“ عبید بھائی نے اطلاع دی۔

”سوا سٹینج۔“ شاہ بانو حیران ہوئی۔

”تھارٹر، بھئی اتھارٹیز۔“ عبید بھائی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔
 ”دو منٹ کے بعد ہی عبید کمرے میں واپس آگئے۔“ ماہ نور! میں نے اسکی خریدنے والے لڑکے کو ”دور ہاں!“ دو منٹ کے بعد ہی عبید کمرے میں واپس آگئے۔
 غور سے دیکھا تھا، وہ کسی طرح بھی اس شکر کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔
 اس کا تاپا، نام نشان پوچھا، ”شاہ بانو نے پانی پیتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ایک دفعہ پھر سے سرخ ہو گیا تھا۔
 ”اس کا کارڈ میرے پاس بڑا ہے، دیکھ لیتا۔“ عبید نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔
 ”شکر کرو۔ کہیں کوئی تصویر، کوئی ویڈیو نہیں آئی۔“ شاہ بانو نے ماہ نور کو تسلی دینی چاہی۔ گماہ نور کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
 ”پھر، مجھے کیوں ایسا لگتا ہے، مجھے ہی کیوں۔“ وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔ اس اسرار کا جواب اس کو شاید کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

اس رات رات بھر جاگنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ اس معاملے پر کبھی سوچے گی بھی نہیں۔ یوں جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔
 لیکن جب اس نے وقت دیکھنے کے لیے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون آن کیا، فون میں ایک نامعلوم نمبر سے اس کے لیے پیغام موجود تھا۔ اس نے پیغام کھولا۔
 ”ماہ نور! میں سخت محذرت خواہ ہوں، میری وجہ سے تمہیں اتنی کوفت اٹھانا پڑی۔“
 پیغام پڑھتے ہوئے ماہ نور کا ذہن ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔
 اس نے اپنے ذہن کو ایک بار پھر شفاف ہونے سے روکا۔ وہ ذہن پر لکھی تحریروں کو قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ایک لمبے عرصہ سے وہ جس واہے کا شکار ہو رہی تھی اس کا اسرار اسے خود ہی کھولنا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر نظریں دوبارہ آنے والے اس پیغام پر جمائیں۔
 یہ پیغام جس کسی نے بھی بھیجا تھا اسے بلا سوچے سمجھے اس سے رابطہ کرنا تھا۔ شاید کوئی گرہ کھلے اس نے اس نمبر پر کال ملائی، دو، تین بار تیل ہونے کے بعد اس کی کال وصول کر لی گئی۔
 ”السلام علیکم ماہ نور! مجھے یقین تھا۔ تم کال کرو گی۔“ دوسری طرف سے بولے گئے الفاظ نے ماہ نور کو حیرت کا ایک نیا تجربہ کا لگایا تھا۔ وہ کون تھا جو اس سے اتنی بے تکلفی سے مخاطب تھا۔
 ”تم کون ہو؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”میں سمجھی کسی کے سامنے لا جواب نہیں ہوا سوائے اس کے جو مجھ سے پوچھے، تم کون ہو۔“ جواب میں کہا گیا۔

”کسکے کیا مطلب کک کون ہو تم؟“ ماہ نور کا اعتماد ایک دم متزلزل ہو گیا۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلنے لگے تھے۔
 ”ریلیکس ماہ نور۔“ دوسری جانب سے اسی سکون اور اعتماد کے ساتھ کہا گیا جس کے ساتھ پہلے دو جملے کہے گئے تھے۔

تھے۔
”پلیز۔ مجھے بتاؤ تم کون ہو۔“ ماہ نور کے لہجے میں اضطراب تھا۔

”میں نے ابھی خلیل جبران کو کوڈ کیا ہے اس سوال کے جواب میں۔“
”ہیلیاں مت بھجواؤ، مجھے بتاؤ پلیز۔“

”ضرورتاً دل کا میری وجہ سے تم اتنا پریشان ہوئی ہو کہ میں دل میں سخت شرمندہ ہو رہا ہوں۔“
”کب بتاؤ گے اب بتاؤ مجھے چکو۔“ ماہ نور نے اپنی ہتھیلی میں آئے سینے کو خشک کرنے کے لیے فون دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

میں اس بات کی تفصیل سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں اس نے انگریزی میں کہا تھا۔
”اور یہ تفصیل فون پر سنائی نہیں جاسکتی۔“

”نہیں۔ تم ابھی بتاؤ تم کون ہو۔“ ماہ نور نے اب کے سخت لہجے میں کہا۔
”میں نے کہا ناہ نور۔ میں اس کے آغاز سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ بندر کے تماشے والے سے لے کر میوزیکل ناٹک کے سکرٹک، ایک ایک بات کی وضاحت۔“
ماہ نور کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

”نتیجہ نہیں کیسے معلوم۔“ الفاظ بے ربط انداز میں اس کے منہ سے پھسلے۔

”مجھے ہی تو معلوم ہے۔“ دوسری جانب سے نرم لہجے میں کہا گیا۔
”میں تم سے کیسے ملنا چاہتا ہوں ماہ نور؟“

”کب کہاں؟“ ماہ نور نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

”جہاں تمہارے لیے ممکن ہو اور اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”ہاں ضرور۔“ ماہ نور نے ایک بار پھر بغیر سوچے سمجھے کہا۔ ”میں ضرور تم سے ملوں گی۔ بتاؤ کب اور کہاں؟“
”اوکے میں تمہیں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔“

دوسری جانب سے ایک لمبا سانس لینے کے بعد کہا گیا۔ فون بند ہو گیا۔ سیل فون ہاتھ میں پکڑے ماہ نور حیرت زدہ بیٹھی تھی۔ کیا اس کو فون پر ہونے والی گفتگو کا یقین کرنا چاہیے تھا۔ کیا اسے اس سے ملنے پر رضامند ہو جانا چاہیے تھا؟

اس کے ارد گرد سوالوں کا جھوم تھا اور اسے ان میں سے کسی کا جواب بھی نہیں دینا تھا۔ اسے صرف اور صرف اپنے ذہن پر چھائے واہموں کے غبار کو دھونا تھا، اسی لیے اس نے نتائج و احوال پر غور کیے بغیر اس کی کال کا انتظار کرنا تھا جس میں وہ بتانے والا تھا کہ وہ اس سے کب اور کہاں ملے۔ اس کال کو سننے کے بعد اسے ہر صورت اس شخص سے ملنا تھا۔ بندر کے تماشے والے سے کچل فیشیول کے سکرٹک کی کہانی سننے کے لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



سجائیہ حمید چوہدری



جست میں ملے کرتی ہے۔ باقی تو زندہ رہنے کے بہانے ہوتے ہیں۔ اس کی پیاس بجھتی ہی نہیں۔ تن کی پیاس من کی پیاس۔ من کی پیاس تو انشراؤں بھی نہیں بجھا پاتے خواہ بارش سے بھرے کیوں نہ ہوں۔“

صفائی والا کپڑا اس کے ہاتھ میں تھا۔ چپڑوں پہ پڑی مٹی فٹا ہونے کی چاہ میں اس کی منتظر تھی۔ نی دی ڈرامے کے کردار ابھی تک اپنے کرداروں کو زندہ کر

”عورت بہت عجیب سی شے ہے یار! تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ ہر عورت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ خواہ وہ عام سی ہو یا چاند چہرہ۔ چاہے وہ درختوں پہ نام لکھ کر اپنے جذبوں کو کھلے عام آشکار کر دے یا پھر سوکھے گلاب کتابوں میں رکھتی رہے اور کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ کب یا وہاں آئی۔ کب کوئی غزل خواں ہو اسے یا نہیں ہو۔ صحرا کی پیاس من میں لیے زندگی ایک

رہے تھے غفلتوں کے ساتھ انصاف کر رہے تھے مگر وہ نجانے کہاں تھی۔ روح میں پڑتے شکاف اور دُڑاں اس کے چہرے پر نمودار ہو رہی تھیں۔ وہ خود نجانے کیا کھوج رہی تھی۔ بعض اوقات یہ کھوج کسی بندگی میں انگلی تمام کے چھوڑ آتی ہے۔ دنیا میں مقام عدل اور قاعدہ کی وادی محض اسی کھوج کی اختراع ہوتے ہیں۔ اس کھوج کو یہ ہنر حاصل ہے کہ یہ کسی سرمنی شام کو خالی ہاتھ بھی کر سکتی ہے اور بول پھیلی کی نازک کچی کلیاں بھی اگا سکتی ہے۔ ایک عام سی لڑکی کو کیا بنا سکتی ہے۔ صحرا میں پھول کھل سکتے ہیں۔ عام سے لوگ بادشاہ ہو سکتے ہیں۔ ایک دن محض ایک دن ”عمید“ ہو سکتا ہے۔ محض اجر برائے اجر کی خاطر۔ چاہے یہ اجر کسی کی خاطر رکھی گئی یا مافی کی منت کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو اور بعض اوقات پوری ہو جانے والی منت بانی زندگی کے لیے بھجادی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

”میتا اپنی! قسم سے آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ وہ کپڑوں کی تہہ لگا رہی تھی۔“ آصفہ کی آواز پر یکایک رک کے اس کی شکل دیکھی۔

خوش قسمتی کا پیمانہ کیا تھا بھلا؟

”جس کو چاہا جائے اس کو ابھی لیا جائے اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے بھلا۔ کتنی دھوم دھڑکے سے شادی ہوئی تھی تا آپ کی رضا بھائی سے۔ اب بھی یاد کروں تو بڑی ایک سائنٹسٹ ہوتی ہے۔“ اس نے تصور کر کے فرمایا۔

اس نے بڑے دھیان سے اس کی بات سنی پھر سر جھکا کے سوسے کپڑوں کے جال میں الجھ گئی۔

”کتنا چاہتے تھے نارضا بھائی آپ کو۔“

”تھے“ کی آندھی اس کا سارا دھیان اڑا کے لے گئی۔

”یاد ہے جب خالد انکل نہیں مان رہے تھے تو انہوں نے زبردست قسم کی بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ جمال ہے جو ایک نوالہ بھی ان دونوں میں، منہ میں ڈالا

ہو۔ سب زور لگا کے تھک گئے۔ کیا فلمی پجویں تھی۔ پھر خالد انکل نے باقاعدہ تسلیم کی مگر ان کے جذبوں کے آگے۔ اور آپ تو بھی آگے سینہ سپر ہوئی ہی نہیں۔ واقعی لگن جی ہو تو کچھ بھی ممکن ہے۔“ ہوں۔“ وہ زیر لب کہہ کے الماری میں گھس گئی۔

”اور وہ ہندی کی رات آیا ہے؟“ آصفہ نے کیا یاد دلایا تھا۔ اسے کرٹ سالگا۔

”خالد انکل نے زبردست پہرہ لگا رکھا تھا مگر وہ بھی رضا بھائی تھے۔ پچھلے لان کی دیوار بھاند کے اندر آگئے تھے۔ اپنے سامنے آپ کو ہندی لگائی اور خالد انکل کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلا۔“

”بھنے سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ میتا نے سنہری یاد کے ساتھ اس کے گلابی پن کو دیکھا۔“

”تسنے چاہنے والے ہرگز نہیں آپ کے۔ آپ کو تو ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔“

”ہاں واقعی محبت کا تو ایک لمحہ بھی قیمتی ہوتا ہے۔ خوش قسمت لوگوں کو ملتی ہے محبت۔“

تو سے فیصلہ لاگے، پیا سانورے! نہیں بس میں اب یہ جیسا سانورے!

محبت تو اک جاوداں زندگی ہے

تو سے فیصلہ لاگے

ملی روشنی

تو سے من جولاگا

ملی زندگی

محبت تو اک جاوداں زندگی ہے

آصفہ نے اس کی بات پوری کیاں سنی تھی۔ وہ کمپیوٹر کے ساتھ مصروف ہو چکی تھی۔ اس نے رضا کی پسندیدہ سی ڈی لگائی تھی۔ وہ رضا کی شرٹس لٹکا رہی تھی۔ اسے شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ کچھ مدت کے بعد نئی شرٹس اور ٹائیاں میتا کو لگتا تھا کہ اس کی مٹلون مزاجی اسے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھٹکائے رکھتی ہے۔

”تو سے فیصلہ لاگے، پیا سانورے“ اس نے بھری آنکھ کو رضا کی شرٹ میں چھپالیا۔

”بھابھی! رضا بھائی یہ گانا آپ کو سناتے ہوں گے، ہیں نا۔“ آصفہ اسے شرارت بھرے انداز میں دیکھ کر بولی۔ وہ جب لاڈ میں ہوتی تو اسے بھابھی کہا کرتی تھی۔

”نہیں تو۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ایک دم پانچ سو والٹ کے بلب کی روشنی کی زد میں آئی تھی۔ اسے رضا کی مٹلون مزاجی سہارے رکھتی تھی۔

”کیا باتیں کر رہی ہو تم لوگ؟“ شمیم خالہ ایک دم کرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”میتا! ہمیں پتا ہے کہ بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور تمہارے کام ہی ختم نہیں ہو رہے۔ تو یہ ہے بھئی! گلابی کی بھی حد ہوتی ہے۔“

میتا کو ہمیشہ خالہ کی اندر تک اتر جانے والی نگاہوں سے خوف کیا کرتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے کپڑے الماری میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھ دیے تھے۔ اور باہر کی طرف لپک گئی۔

”اتنی سستی کی ماری ہے کہ بس۔“ انہوں نے بے شکل اس کے کمرے سے باہر نکل جانے کا انتظار کیا تھا۔

”مہسنی نے کسے میرے بیٹے کو پھاس لیا۔“

”امی! آپ کو براہم کیا ہے؟“ آصفہ کو ایک دم غصہ آگیا۔

”اتنی اچھی تو ہیں میتا آپ!۔“

”پتا ہے مجھے، تمہیں بھی اس گھنی نے اپنے چکر میں ڈال رکھا ہے۔“

”امی آپ بھی۔“ وہ پاؤں پٹختے ہوئے واک آؤٹ کر گئی۔

اس نے جلدی جلدی چکن کا پیکٹ فریئر سے نکالا۔

”حزق کے لیے اسپیشلٹی بنائی تھی۔ عبیدہ تو ہر طرح کے کھانے آرام سے کھا جاتی تھی۔ مگر حزق بہت ضدی تھا بالکل رضا کی طرح۔ اس کے لیے اسے اسپیشل کھانا بنانا پڑتا تھا۔ اجودا اور باقی سب کے لیے اسے چکن اور

سلادہ وال بنائی تھی۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی۔

اس نے جلدی میں دیکھی کو بغیر کپڑے کے اٹھالیا تھا اور سی کی آواز کے ساتھ فوراً ہی واپس رکھ دیا۔

”یہ ہاتھ کام کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ میں تمہیں کام نہیں کرنے دوں گا۔“

اس کے جلے ہاتھ کی انگلیوں پر رضا کے ہاتھوں کا لمس مرمم کا کام دے رہا تھا۔ مگر یہ بات بہت پرانی تھی۔

”تم کلا رنگ مت پہنا کرو۔ بہت جتنا ہے تم پر۔“

پھر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔“

نیم وا آنکھوں کی سرخی اس کے دل پہ چھا جاتی تھی۔ اب وہ کئی کئی دن تک کلا رنگ پہنے ہوئی رہتی مگر رضا کے غصے کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

آوازوں کے ٹکراؤں جھوم میں اس نے کھانا وقت سے پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ حزق اور عبیدہ کی وین کا ہارن سن کر وہ باہر نکلی۔ ان کے کپڑے وہ نکال کے رکھ چکی تھی۔ عبیدہ بہت مطمئن ہو کے باہر نکلی تھی۔

”اما! آج میں نے مہتھس میں تین بائے ٹین لیے ہیں۔“ حزق نے بیک وہیں بھینکا اور کاپی نکال کے اسے دکھانے لگا۔ ان کے پچھلے میٹھے تک وہ اس کا ٹیسٹ چیک کر کے تعریف بھی کر چکی تھی۔

وہ عبیدہ کو ساتھ لیے ہاتھ روم میں داخل ہوئی۔

”اما! یہ کلو میرا ٹاول استعمال نہیں کرے گی اور نہ ہی میرا سوپ۔“ وہ دروازے میں اکڑ کے کھڑا تھا۔

”پہلے میں نہاؤں گا۔“

اس نے عبیدہ کو دکھا دیا تھا۔ اس نے جلدی سے عبیدہ کو پکڑ کے بٹھالیا تھا ورنہ اس کا باجا بند ہوتے ہوتے اٹھ اٹھتے تو لگ ہی جاتا۔

”اوکے! انوٹیشن۔“ وہ عبیدہ کو لیے باہر آگئی۔

عبیدہ کو نہلانے کے بعد وہ اس کو توالہ میں لپیٹ کر باہر لائی۔ اس نے رضا کو تکیہ میں سر دیے ہوئے بیڈ پہ کراٹ کے مل لیٹنے دیکھا۔

”بے وقت آمد۔“ وہ چونکی مگر ظاہر نہیں کیا۔

”السلام علیکم! دھیرے سے سلام کیا“ کھانا لگاؤں؟“

ہوں! جواب پچھ دیر کے بعد آیا تھا۔
”چکن اور وال بنائی ہے میں نے۔“ یہ غیر ضروری
معلومات تھیں۔ رضا کا شمار ان لوگوں میں تھا جو کھانا
کھانے کے لیے زندہ نہیں رہتے۔ وہ کچھ دیر وہیں
بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کے چل پڑی۔
کمرے سے نکلے وقت اس نے دیکھا وہی انداز
برقرار تھا۔

اس نے اس کے سلام کے جواب میں کچھ نہیں کہا
تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس نے کس
رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ لا حاصل جب حاصل بن
جاتا ہے تو شاید اسی طرح بے مزہ ہو جاتا ہے۔ نعمت مل
جائے تو اس کا شکر ادا کرنا یاد نہیں رہتا۔
عفت اس کی دوست تھی مگر وہ بھی مینا کو کبھی سمجھ
نیں پاتی تھی۔

”یار! تم تو نری پاگل ہو۔ تم زیادہ ہی توقعات باندھ
لیتی ہو۔“

اس کو کبھی کوئی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ وہ بھی جو اس کے
دل کا دعویدار تھا۔ جو اس کی زندگی پہ حق ملکیت جتا
تھا۔ جو اس کے من کا بھیدی تھا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے زندگی میں جب نعمت ملے اور
شکراوانہ ہو تو پھر صدقہ دینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے
اور بعض اوقات صدقے میں وہ نعمت دے کر بھی
سیری نہیں ہوتی۔ سکون نہیں ملتا۔

آصفہ شام کی چائے بنا رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کو
فرصت کی انگلی تھام کر شام کی اور بڑھتے ہوئے سورج
کو دیکھ رہی تھی۔ حمزہ اور عبیدہ کو جگا کے وہ لان میں
چلی آئی۔ وہ دونوں اب قاری صاحب سے بڑھ رہے
تھے۔ سنری نرم دھوپ اور تمنا کی اپنی بانیں پھیلائے
اس کی منتظر تھی۔ وہ پھر لیے بیچ بچٹ کے بیٹھ گئی۔
لان میں لگے سفیدے کے درخت ہلکی ہوا کے ساتھ
اٹھ کھیلایاں کر رہے تھے۔ ہوم آئناکس کالج میں
گریجویشن کے دوران اس کی بایں دن کی ریزیڈنسی

(Residence) تھی۔ ان بایں دنوں میں رضا نے
بایں چکر لگائے تھے۔
”وہ دیکھو! تمہارا مجنون ہارن پہ ہارن دے رہا ہے
اس کو جھلک دکھا دو۔“ عفت اسے اطلاع دے کر
مفت مشورہ بھی دیتی۔

کیا دن تھے وہ بھی۔ ہم ہمیشہ ایسے دن جو نعمتوں کے
انمول خزانوں سے بھرے ہوتے ہیں بغیر شکر ادا کیے
گزار دیتے ہیں پھر حجب وہ دن رخصت ہو جاتے ہیں
تو ہم ان کو یاد کر کے آنکھیں نم کرتے ہیں۔ مگر کبھی
آنکھوں کی نمی نے بھی کوئی کی پوری کی ہے؟ اس نے
گھٹنوں کے گرد بولپیت رکھے تھے۔

”تم اس طرح کیوں کرتے ہو رضا! تماشا بن جاتا
ہے میرا سب کے سامنے۔“
وہ بھی کبھی بہت زنج ہو جاتی۔

”جنوں ہمیشہ نامراد ہے۔“ وہ سگریٹ کی راکھ خالی
فرش پہ جھاڑتا تھا اور پھر وہ اس راکھ کو اکٹھا کرنے کے
عمل میں ہلکا ہوتی رہتی۔

ایک دل ریا سامان تھا جس نے اسے اپنے حصار
میں لے رکھا تھا۔ نکل کے تین بولوں کے بعد وہ جنوں
بامراد تو ہو گیا تھا مگر اس کے حصے میں نامرادی آگئی تھی۔
حمزہ اور عبیدہ کی سیدائش کے بعد تو وہ صرف ان کی
مال ہی بن کے رہ گئی تھی۔ عیسیٰ خالہ کی ناقابل قبول بہو
مگر رضا کی بولی مینا چپ ہو گئی تھی۔

آصفہ چائے کے دو کپ اٹھائے چلی آئی۔ گفتگو کا
سن اور سوچ کا دھار ایک ایک بدل گیا۔

”امینہ! خود کو جینے دو پلیز تم مر چکی ہو تمہاری
میکینیکل موت ہو چکی ہے۔ تم جا چکی ہو۔ یہ عورت
”امینہ رضا“ ہے۔ اس کو زندہ رہنے دو۔“ سامنے لگے
درخت اس کا درد اور اس درد کا ہر اپنے اندر سمیٹ
رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بتا مل جاتا جیسے کہ رہا ہو کہ
میں تمہاری باتیں غور سے سن رہا ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ وہ
بھی سو گئے۔ اسے یوں لگا جیسے بھرے میلے میں وہ تنہا
رہ گئی ہو۔

دین

ماہنامہ دین جولائی 2012 کے شمارے کی ایک جھلک

اداکار ”خالد انعم“ سے شاہین ریشمی ملاقات

اداکار ”سربین حبیبانی“ دسکے پڑاے کے ساتھ

”راز کی دنیا سے FM-103 کے آکرے ”منہاج علی عسکری“

کی باتیں

”مجھ سے ملیے“ میں مسند ”انہلہ کان“ اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں

”دردن“ فیروز کا سلسلہ وار دل

”دست کوزہ گر“ فوزیہ یاسمن کا سلسلہ وار دل

”نایاب ہیں ہم“ فتنہ افکار کا دل

”میں دنیا تم ساگر“ فرح ناز کا مکمل دل

”زخم تازہ کی رازداں بارش“ فرہین اختر کا دل

”وہ الہ پری ہے“ ربیعا ناز کا دل

”یہ میری بھول تھی“ اہل گل کا دل

”اعتبار حاصل زیست“ میڈیکل کا دل

شرقی احمد ربک جیہ نر اور انڈی ماں تانیدان اور میر گل کے انساے

اور لپس سٹیل

اس شمارے کے ساتھ کتاب

کرن کتاب کرن کے ہر شمارے کے ساتھ طبع وے قیاس خدمت ہے۔
استفادہ کیجئے۔

ضرورت ہوتی ہے۔“ اس نے ہنسی بھری نگاہوں میں عفت اپنی بات پہ مصرعہ تھا۔
”یہ بات نہیں ہے عفت! دیکھو رضا کو شاید اب مجھ سے اتنی محبت نہیں ہے مگر میں اس کی ضرورت تو ہوں۔“ وہ عفت کی شانگ دیکھتے ہوئے بولی۔
”رضا کی ضرورت کی تم بات نہ کرو۔ وہ اپنی ضرورتیں کہاں کہاں پوری کرنا ہے، تمہیں پتا ہے۔ آج کل وہ اپنی سیکریٹری کے ساتھ کھوم پھر رہا ہے۔ تم دیکھو! تمہارے پاسنگ بھی نہیں ہے وہ۔ کالی بجننگ سی لڑکی ہے۔ نہ شکل نہ کچھ اور۔“

مینا کے ہاتھ سے چھوٹے کپڑوں اور اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کے اسے پتا چلا تھا کہ اس کے منہ سے غلط بات نکل گئی تھی۔
اپنے عشق پر نازاں، اپنے شکوک پہ تنہا مینا نے اسے سخت سے دیکھا تھا۔
”میں نے کہا تھا نا! وہ بادشاہ تخت نشین تمہارے حصے کی محبت بے دریغ لٹاتا پھر رہا ہے۔ تم اپنا کاسٹل دل سمیٹ کر بیٹھی رہو۔“

اس رات اس نے اپنا احتیاب خود کیا تھا۔ اس نے مینا سے معافی کی گزارش کی تھی۔ ہر وقت ”میں کون میں کون“ کی صدا لگانا بند کر دی تھی۔ طویل عرصے کے بعد اس نے امینہ رضا کو ایک مقام دیا تھا۔ اس نے عبیدہ اور حمزہ کی ماں کو مینا کی جگہ دے دی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ کبھی مینا تھی۔ اس کی یادداشت کے سارے خانوں میں یہ ہی تھا کہ وہ حمزہ اور عبیدہ کی ماں ہے۔ بس۔ دور راہوں پہ چلنے والے، بھی اپنے من کو سکون نہیں دے پاتے۔
کبھی آگے کی راہ، کبھی پیچھے پلٹنے کا عمل ایک روٹی اختیار کرو، من کو سکون مل جائے گا۔ اس نے خود کو ایک دور رس نصیحت کی تھی۔ اس نے تنہا ہونے کا عمل چھوڑ دیا۔ اسے مینا کے پلٹنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ مینا کی من گئی۔ وہ ہر وقت عبیدہ

اور حمزہ کے ساتھ لگی رہتی۔ پھر اسے ان کے درمیان رہنے کی عادت پڑ گئی۔
پھر ہوا کیا تھا۔
رضا کو اس سے شکوہ رہنے لگا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا تو لان میں اس کے انتظار میں بیٹھنے والی لڑکی اسے بچوں کے درمیان پڑی سو رہی ہوتی تھی یا شیم خاں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوتی۔ آصف بھی اسے گھر کی ہو چکی تھی۔ شیم خاں کی مخالفت برائے مخالفت کی پالیسی بھی اپنا اثر کھو چکی تھی۔ رضا کو اس کا وجود بہت ضروری دکھائی دینے لگا تھا۔ ”شکوہ جواب شکوہ“ کا خاموش عمل اپنی سمت بدل چکا تھا۔
”تم کہاں رہتی ہو مینا! میں جب گھر آتا ہوں، تم مصروف ہی ہوتی ہو اور یہ اپنے آپ کو دیکھا ہے۔ کبھی تین دن سے ایک ہی کپڑے پہنے ہوئے ہو۔“
”میں کیا باتیں کر رہی ہوں آپ سے؟“ وہ ہنس پڑتی۔
”اب اچھی لگتی ہوں اس عمر میں بچی سنو رہی؟“
وہ اس وقت دم بخود سا رہ گیا تھا، جب اس کی لائی ہوئی بہت خوب صورت نیلے رنگ کی ساڑھی کو اس نے عبیدہ کے لیے رکھ دیا تھا اور وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ نیلے رنگ کی کبھی وہ بولی تھی۔
”عبیدہ کا قد دیکھیں! مجھ سے بھی نکل رہا ہے۔“ وہ سہولت سے کہہ کے پلٹ گئی۔
”ابھی برتھ ڈے ٹویو مسز اربید روز کا مسکاتا ہوا ابو کے اور شاعری کی کتاب۔“
ایک وقت تھا، بھی وہ لفظوں کی دنیا میں باس کرتی تھی۔ گرمیوں کی گرم دھیریں بے اثر ہو جاتی تھیں۔ موسموں کی تلخی بے رحم نہیں لگا کرتی تھی۔ محض لفظوں کے سہارے وہ جی اٹھا کرتی تھی۔ وہ حمزہ کی شرٹس پیگ کر رہی تھی۔
اس نے بو کے میز پر رکھ دیا تھا۔ کتاب الٹ پلٹ کے دیکھنے کے عمل میں وہ بہت جلد اور بے حس نظر آ رہی تھی۔
”ہر جگہ محبت ہے۔“ اس نے عنوان کو زیر لب

پڑھا۔
”ایسا ہی ہے نا؟“ اس نے غور کیا تھا کہ رضا کی مسکراہٹ آج بھی جان لیوا تھی۔ جھٹکانے والی راستہ کھونا کرنے والی۔
”اب یہ مت کہنا کہ اب یہ کوئی عمر ہے ایسی باتیں کرنے والی۔“ اس نے اس کے ہاتھ سے حمزہ کی شرٹ لے کر لڑائی اور الماری کا پٹ سہولت سے بند کر دیا۔
”محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ بڑھاپے کی محبت تو واقعتاً جان لیوا ہوتی ہے۔“ مینا نے دھیرے سے کہا۔
”کیا مطلب؟“ وہ حمزہ کی بک ریکس کے پاس کھڑا کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا، یکدم چونکا۔
”اب کی بات کر رہی ہوں۔ اور ایک کہاں ہے؟“ وہ شگفتگی سے بولی۔
”ایک میں اس لیے نہیں لایا کہ تم خود بیک کرو گی۔“
”اما جانی، مماجی!“ حمزہ حسب عادت دور سے ہی آواز سن دیتا آ رہا تھا۔
”لو آ رہا ہے تمہارا لاڈلا۔“
”واؤ! پاپا! کیا حال ہیں آپ کے؟“ وہ رضا کے کندھے سے جڑ کے بیٹھ گیا۔
ان کی تنہائی چپ کی بیکل مارے بیٹھ گئی تھی۔ وہ آنے والی مبارک سیمینے کمرے سے باہر نکل آئی۔
اس منظر میں وہ پوری فیملی تھی۔ گلابوں کی خوشبو، ایک کی مٹھاس اور محبت کے ریلے زائقے سے بھرپور ایک خوشگوار تاثر ہر شخص کو اپنی پلیٹ میں لیے ہوئے تھا۔
رضا کے پہلو میں بیٹھے ہوئے اس کی نظر مینا پہ پڑی۔
اس کے لبوں پہ بہت تھکی تھکی سی مسکراہٹ تھی۔
بچوں والے لب سہولت تھے مگر امینہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔
سوختن پہ رنگ برنگے بلوسات چڑھالینے سے کیا من مطمئن ہو جاتا ہے؟ ٹوٹی پھوٹی بھر بھری عمارتوں میں موسمی پھولوں کی بھرمار ہو بھی جائے تو کیا وہ

عمار میں بہت خوب صورت دکھنے لگتی ہیں؟
جذبات کو توجہ کی ہوائ نہ لگے تو وہ رنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ اوس زہ لب پٹری کی تہہ تلے دب جاتے ہیں۔ گلابی گل خزان رسیدہ پتے بن جاتے ہیں اور دل دھڑکنے بھول جاتا ہے اور سسے دل کے ساتھ کیا بدن ج جاتا ہے۔
تم ہمارے نہیں تو کیا غم ہے ہم تمہارے تو ہیں یہ کیا کم ہے اس نے مینا کے سوالوں سے نظریں چرائیں۔
رضا نے اس کے چہرے کے بدلنے رنگوں کو غور سے دیکھا۔
بہت محنت درکار ہے۔ دل و جسم کے رشتے جوڑنے میں دلداروں کے ناتے جوڑنے میں سانس کی ڈوری باندھنے میں نقوس قزح کے رنگ چھانٹنے میں، محبت کی باڑیں لگانے میں، عینیں اور نکلے چاند کو اپنی چھت پر واپس لانے میں، روئے ہوئے دلدار کو منانے میں....
اس نے امینہ کی آدھی بوتل منہ سے لگالی۔ عمل بہت چھوٹا تھا، مگر اس کے اثرات دور دھمکے ہوئے کو قریب کر گئے۔ مینا کے کرب زدہ چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔ اور امینہ رضا کا شرٹیں چہرہ رضا کی آنکھوں میں چاند کی طرح اتر گیا تھا۔
”خدا کرے! وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ آباد رہیں۔“
ہمارے ارد گرد نجانے کتنے لوگ دو زندگیاں گزارتے ہیں۔ اندر کی چپ اور باہر کے شور کے ساتھ۔ نئے پن سے عاری دل اور جس زہ داخل میں مینا جیسے لوگ جیتے نہیں، محض زندہ رہتے ہیں۔
میری دعا ہے کہ مینا اور مینا جیسی لڑکیاں کبھی دکھ کی فصل نہ کائیں۔ اپنے پن کے چرنے پہ محبت کا پتی رہیں اور خوش رہیں۔ وہ اپنے وجود کے ساتھ آباد رہیں۔





فکار پاؤں میرے، اشک نارسا میرے
کہیں تو مل مجھے اے گمشدہ خدا میرے
”السلام علیکم صاحب، جی! منزل صاحب ملنے آئے
ہیں آپ سے۔“ وہ ابھی گہری نیند سے بے وار ہوا تھا
ملازم کی اطلاع پر منہ بنا کر رہ گیا۔
”ٹھیک ہے، اسے بٹھاؤ میں آتا ہوں تھوڑی دیر
میں۔“ ہاتھوں میں دبا تکہ سائیڈ پر پھینکتے ہوئے بستر
سے نکل گیا تھا۔ اگلے پچیس منٹ کے بعد وہ فریش
ہو کر منزل حسن کے سامنے بیٹھا تھا۔
”کیسے ہو، بڑے دنوں کے بعد نظر آئے۔“
”ویزے کے چکر میں پڑا ہوا تھا یار! تمہیں تو پتا ہے
آج کل جینا حرام ہوا ہے میرا۔“
”کیوں اب کیا ہوا؟“
”کیا ہوتا ہے، ابار رٹاڑ ہو گئے ہیں اور اماں ان کی
پیشن کے پیروں سے مجھے دینی بھوانا چاہ رہی ہیں اپنے
دور کے کسی رشتہ دار کے پاس۔“
”کیوں خیریت، میرا مطلب ہے تم جاب تو یہاں
بھی کر رہے ہو۔“
”دس ہزار کی جاب سے کیا ہوتا ہے یار! دو ماہ بعد
بشریٰ اور بیریٰ آپا کی شادی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا
کیا کروں۔“
”ہوں یہ تو بے، ناشتا کر آئے ہو یا ابھی کرتا ہے؟“
”گولی مارو ناشتے کو، میں اصل میں کچھ پیروں کے
لیے آیا تھا تمہاری طرف۔ میرے حالات کا تو تمہیں

پتا ہی ہے، اوپر سے اس نئی والی محترمہ کی فرمائشوں نے
پریشان کیا ہوا ہے۔ ابھی کل موصوفہ کامیابا کل چھپن
گیا۔ گھر والے لے کر نہیں دیں گے، اسی لیے مجھ
سے فرمائش کر دی، نیا نیا افر ہے، مع بھی نہیں
کر سکتا۔“ اس کی پریشانی کی وجہ جان کر اراقتنی کے
لبوں پر ہلکی سی مسکان کھڑ گئی۔
”تکنے پیسے چاہئیں؟“

”دس ہزار۔“ فرمائش یوں ہوئی تھی جیسے ادھار
لینا ہو۔

”ٹھیک ہے مل جائیں گے، مگر ایک شرط پر۔“

”مجھے پتا ہے تم واپسی کی شرط رکھو گے، یار! کروں
گا واپس، تمہارا ایک ایک پیسہ میرے دل پر لگھا ہے۔
جب تک واپس نہیں کروں گا، مرنوں کا بھی نہیں، نئی
پراس۔“

”مجھے پتا ہے، مگر تم واپسی کی شرط نہیں رکھ رہا۔“
”پھر؟“ وہ حیران ہوا تھا۔ اراقتنی نے نگاہیں اس
کے چہرے پر جمادیں۔

”پھر یہ کہ پاپا اپنی کسی کزن کی بیٹی کے ساتھ میرا
رشتہ فاسل کر رہے ہیں۔ مجھے ان کے فیصلے پر کوئی
اعتراض نہیں، مگر میں لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں، اے
قریب سے جانا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں وہ میرے مزاج
سے میل بھی کھاتی ہے کہ نہیں۔“

”وہ! تو تم اس لڑکی کا موبائل نمبر حاصل کرنا چاہتے
ہو۔“

”نہیں۔ میں ایسی خرافات میں نہیں پڑتا، اگلے
بہتے پاپا کی ان کزن کے بیٹے کی شادی ہے۔ اسی لیے پاپا
نے اسپیشلی مجھے پاکستان بھیجا ہے تاکہ میں لڑکی کو
دیکھ لوں اور تم اس شادی میں میرے ساتھ چل رہے
ہو۔“

”میں۔ مگر میں کیوں؟“

”بتا دوں گا یہ بھی، تم بتاؤ تمہیں دس ہزار چاہئیں یا
نہیں؟“

”سوچ کے بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے، جب سوچ لو بتا دینا، پیسے دے دوں

گا۔“

”مذاق کر رہا ہوں یار! اتنا بھی نہیں سمجھتے تم۔ یار
وہی جو یاروں کے کام آتے ہیں مشکل میں۔“ فوراً
سے پیشتر اس نے رائے بدلی تھی۔

وہ منزل کی ہوشیاری برکھری سانس بھر کر رہ گیا۔
مل کلاس گھرانے سے تعلق رکھنے والا منزل حسن
اس کے اسکول لائف کے دوستوں میں سے ایک تھا۔
اس کے حالات بدل گئے تھے مگر منزل حسن کی فیملی
اب بھی زندگی کے اسی مدارج پر کھڑی تھی۔ تاہم
اسٹیشن میں نمایاں فرق کے باوجود وہ بھی اپنے



دستوں سے نہیں بدلا تھا۔ شاید اسے بدلنا آتا ہی نہیں تھا۔

ہر بار یہی سوچا، ہر بار تم کھائی
اس بار نہ رو میں گے، دامن نہ بھگو میں گے
اے معنی گل لیکن جب موسم گل آیا
معموم شگوفوں کی معموم اداؤں نے
مجبور بنا ڈالا، ہر بار لاؤ ڈالا

”نمرو! اب سب ہی کرو اور کتنا روؤ گی، سمجھ لو
کہ وہ شخص تمہارے نصیب میں تھا ہی نہیں۔ اب
انسان نصیب سے تو نہیں لڑ سکتا۔“
”میں اس شخص کے لیے نہیں رو رہی۔ مجھے اپنی
بے بسی پر رونا آ رہا ہے۔ بچپن سے تائی امی میرے
ساتھ یہی کرتی آ رہی ہیں۔ وہ مجھ سے ہر چیز چھین
لیتی تھیں۔ مگر اچھ کوئی چیز نہیں تھا، مگنیتھ تھا میرا پانچ
سال اس کا نام میرے نام کے ساتھ منسوب رہا ہے۔
آج اگر میری امی ہو تیں تو کیا میرے ساتھ یہ سب
ہوتا؟“

اس نے اپنی چھو پھو زار کزن سعدیہ کی طرف
دیکھا۔ جواب میں وہ انفسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔
”یہ تو ہے، مگر قصور تو اچھ کا بھی ہے۔ وہ کیوں آیا
ممانی کی باتوں میں گیا اسے تمہارا نہیں پتا کہ تم کس
کردار کی ہو۔ اسے تو ممانی کی اس سازش میں تمہارا
ساتھ دینا چاہیے تھا۔ کجا کہ سارے تعلق توڑ کر چلا
گیا۔“

”تائی اماں کی چالوں کو سمجھنا عام ذہن کے بس کی
بات نہیں ہے۔ مرنے کے ذہن میں شک آجائے تو عقل
رخصت ہو جاتی ہے۔“

”اچھا ابھی تم اس بات کو بھول جاؤ پلیر، کل مہمان
آنا شروع ہو جا میں گے، خواہ تم شاہن جاؤ گے۔“
”تم شاہن تو بن گیا ہے۔ ایک لڑکی پر بد کرداری کا الزم
لگ جائے تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے۔“

وہ آزرہ تھی مگر اس سے پہلے کہ سعدیہ کوئی جواب

دیتی، کوئی دے پاؤں وہاں چلا آیا۔

”ایکسکیوز می! اچھے منزل حسن کہتے ہیں۔ کیا
مجھے ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“ اس کی کند پر
دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھیں۔
”جی۔ میں بتا دیتی ہوں۔“

نظروں ہی نظروں میں نمرو کو تسلی دیتے ہوئے
سعدیہ اس اجنبی شخص کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔
پیچھے نمرو دیر تک قریبی پودے کے پتوں کو نوچتے ہوئے
اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

ترندی ہاؤس میں دو گھرانے برسوں سے آباد تھے۔
ایک نواز ترندی صاحب کا، جن کی بیگم بلیقیں ترندی
تھیں اور ان کے دو بچے یا سمر اور ماریہ تھے۔ دوسرا
گھرانہ شہباز ترندی صاحب کا تھا۔ جن کی بیگم قمر
العین ترندی شادی کے پانچ سال بعد ایک بیٹی نمرو کو جنم
دے کر کچھ عرصہ پیار رہیں، پھر ملک عدم سدھار گئیں۔
ان کی رحلت کے بعد نمرو نے جس طرح اس گھر

میں پرورش پائی تھی اس کا بل ہی جانتا تھا۔ بلیقیں بیگم
یوں تو خاصی دین دار خاتون تھیں مگر نمرو سے انہیں خدا
واسطے کا ہر تھا اور اس بے پر کی ایک بڑی وجہ ہر معاملے میں
ان کی بیٹی پر نمرو شہبازی برتری تھی۔ ان کے گھر میں
جو بھی آتا تھا، نمرو کی خوب صورتی اس کی ذہانت اور
سلیقہ کی تعریف کرتا تھا، جس پر بظاہر وہ خوش کا اظہار
کرتیں لیکن اندر ہی اندر جل کر رہ جاتیں۔ ان کی بیٹی
ماریہ، نمرو کے مقابلے میں بہت خوب صورت تھی مگر
نہ جانے سب کیوں نمرو ہی کی تعریف کرتے سماں پاپ
کی آزادی اور بے جا چھوٹ نے ہی ان دونوں بہن
بھائیوں کو کسی لائق نہیں چھوڑا تھا۔

ان کے بیٹے یا سمر کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی
خوب زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ماں بیٹا
اور بیٹی بچہ ناشتا کر کے گھر سے نکلتے تھے اور شام کے بعد
رات کا کھانا تیار ہو جانے کی یقین دہانی کر کے ہی گھر
واپس لوٹتے تھے۔ پچھلے کئی روز سے ان کا یہی معمول

تھا مگر نمرو گھر کے سکون کے صلے میں سب ہوا داشت
کرتی رہی۔

اس روز اسے رات میں پیاس لگی تھی۔ تب ہی
ایک نظر سوئے ہوئے اپنے پیارے باپ پر ڈال کر وہ نیچے پکین
میں پانی پینے آئی تو ماریہ سیل فون کان سے لگائے
سرگوشی کے انداز میں کسی سے باتیں کرتے ہوئے
بیرونی کٹ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلے تو نمرو
ہکا ہکا دھستہ رہ گئی، پھر بھاگ کر تائی کے پاس آئی تھی۔
بلیقیں بیگم اس کی اطلاع پر حواس باختہ سی کمرے سے
ٹپکیں اور عین موقع پر بیٹی کو جالیا۔

نمرو کا دل اس لمحے بہت تیزی سی دھڑک رہا تھا۔
کیونکہ کل سے اچھ عباس گاؤں سے شہر آیا ہوا تھا ان
کے گھر۔ وہ اس کا مگنیتھ اور اس کے لبا کے بہت قریبی
دوست کا بیٹا تھا۔ بلیقیں بیگم کو اس گھر میں اس کی آمد
پسند نہیں تھی مگر وہ ہمیشہ بہت مجبوری میں کبھی کبھار
ہی اس طرف آتا تھا۔ کل رات بھی خراب موسم کے
باعث اسے تایا جانے نے زبردستی روک لیا۔

نمرو کو پوری امید تھی کہ تائی اتنے بڑے احسان
کے عوض ضرور اپنے دل سے اس کے لیے پلنے والی
ساری کدورتیں نکل دیں گی مگر اسی وقت تایا آیا
جاگ گئے تھے اور ان کو سامنے پا کر تائی اماں نے واویلا
کرتے ہوئے سارا الزام اس کے سر ڈال دیا۔ یہ کہہ کر
کہ وہ اپنے کسی آتش سے ملنے چوری چوری گھر سے
فرار ہو رہی تھی۔ ان کی بیٹی ماریہ کی آنکھ کھل گئی اور
اس نے اسے پکڑ لیا۔

مارے تھیر کے وہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ کوئی
پانچ وقت اللہ رب العزت کے حضور جو ساری کائنات
کا رب ہے، سر بسجود ہو کر ایک قطعی بے گناہ
مسلمان لڑکی پر اتنا بڑا بہتان بھی لگا سکتا ہے۔ اسے
یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت تایا نے اسے جن
لگا ہوں سے دیکھا تھا اس کا بس نہ چلتا تھا کہ زمین جھٹے
اور وہ اس میں سما جائے احمد نے بھی یہ ساری باتیں
سنی تھیں۔ اس نے اسے کوئی ملامت کی تھی نہ کچھ
کہا۔ تاہم چند روز کے بعد اس کی طرف سے منفی کا

سیلان ضرور واپس آیا تھا اور تب سے ہی وہ رو رہی
تھی۔

وہ بے قصور ہو کر بھی سب کی نظروں سے گر گئی
تھی اور جو اصل قصور وار تھی وہ اب بھی سارے گھر
میں پوری آزادی کے ساتھ دندناتی پھرتی۔ سعدیہ جو
اس کی کزن بھی تھی اور دوست بھی، اس کا درد سمجھتی
تھی کیونکہ اس کی طرح وہ بھی بلیقیں بیگم کی فطرت کو
بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

ٹی دی لاؤنچ میں اس وقت تایا آیا، تائی اماں ان کے
دونوں بچے اور وہ دونوں اجنبی مہمان بیٹھے تھے۔ جب
پوچھا لگاتے ہوئے نمرو نے تائی اماں کو کہتے سنا۔

”اقتضیٰ۔ میرے بچے! کاش میں تمہیں بتا سکتی
کہ اتنے سالوں بعد تمہیں یہاں اپنے گھر دیکھ کر مجھے
کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ جب تم چھوٹے سے
تھے تو اپنے بابا کی گود سے نکل نکل کر میری طرف آتے
تھے یہ اپنی ماریہ کے ساتھ بڑی دوستی تھی تمہاری ہائے
کیا وقت تھا وہ تھی۔“ مری سر وہ بھرتے ہوئے انہوں
نے ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ چومنا تھا۔

”اور ہاں! اب آئے ہو تو میں نے تمہیں دوبارہ سے
پہلے نہیں جانے دینا۔ بھائی صاحب اور بھائی سے
بات ہو گئی ہے میری وہ دونوں بھی خوش ہیں۔ تم یہاں
ہو گے تو گھر میں ذرا رونق بھی لگ جائے گی۔ یہ میری
نملانی بیٹی جو ہے، سارا دن گھر میں قید رہتی ہے، نہ دنیا
داری کا کچھ پتا ہے نہ دوسری چیزیں لڑکیوں جیسے کام آتے
ہیں اسے۔ کچھ کھائی پیتی نہیں ہے تو خون کی بھی کمی
ہے، ذرا سا کام کر کے ہی تنگ جاتی ہے، بہت ڈانٹتی
ہوں مگر اس پر اثر نہیں ہوتا، تم یہاں ہو گے تو اس کملی
کا دل بھی بہل جائے گا۔“

نمرو کا دل ان کے ایک ایک لفظ پر کٹ رہا تھا مگر وہ
خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔ تائی کی ایک
شیعہ مکمل ہو گئی تھی اور اب دوسری شروع کر رہی
تھیں۔

”بیٹا! برا نہ مانا۔ تمہارے ساتھ تمہارا دوست بھی ہے۔ اس لیے تیار ہی ہوں۔“ نمو میرے دیور کی بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی ماں وفات پا گئی تھی۔ میں نے زیادہ سچی اس لیے نہیں کی کہ بن ماں کی بچی ہے لوگ کیا کہیں گے، شاید اسی کو تانی کی وجہ سے اس نے ہمیں ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سچ پوچھو تو میں اپنا بیٹا بھی اسی لیے جلدی بیاہ رہی ہوں کہ جن لڑکیوں کی حیا مرجانی ہے وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں بیٹا! اس لیے ڈرتی ہوں۔ کھنٹ کو اپنے باپ کی بیماری کا احساس ہے نہ تایا کی عزت کا۔ سارا دن کام میں مصروف رہتی ہوں پھر بھی کہیں نہ کہیں سے موقع نکال لیتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں پانچ سالہ منگنی ٹوٹ گئی۔ تو یہ تو ہے۔“

نمو کو لگا اگر وہ اب بھی چپ رہی تو اس کے دل غ کی شرمائیں پھٹ جائیں گی، تب ہی پونچھ پھینک کر وہ تانی کے سامنے اٹھڑی ہوئی تھی۔

”اللہ کا خوف کریں تانی! ایسا نہ ہو کہ بیٹھے بیٹھے آپ پر اس کا عذاب نازل ہو جائے حد ہوتی ہے جھوٹ اور بہتان تراشی کی بھی ہے۔“ تانی کو شاید اس سے اس جرأت کی امید نہیں تھی تب ہی ان کی آنکھیں حیران سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”دیکھا۔ دیکھا سر کے ابا! اس لڑکی کی بد زبانی کو۔ ارے اللہ کا غضب نازل ہو غم پر جسے اپنی بے حیائی اور بے شرمی پر بلا سالاں بھی نہیں۔ باپ سے بڑھ کر تایا کی عزت کا کوئی خیال نہیں۔“

بلقیس بیگم کے زور زور سے پونے کی آواز سن کر فوراً سعدیہ بھاگتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ ”نمو! اچھو کمرے میں ہزار بار سمجھایا ہے بھوں کے سامنے اس طرح بات نہیں کرتے۔“

”کیوں۔ بڑے چاہے گلا کاٹ دیں؟“

”تم چلیو یہاں سے۔“ زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے وہاں سے لے آئی۔ نمو کمرے میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ”مصر سے کامو نمو! اس طرح چیخ چلا کر تم خود کو

دورست ثابت نہیں کر سکتیں۔“

”تو پھر کیسے ثابت کروں میں خود کو درست؟ وہ جس کے سامنے چاہتی ہیں مجھے بے لباس کر کے رکھ دیتی ہیں۔ صرف اس لیے کہ میری سائیڈ پر بولنے والا کوئی نہیں۔ میرا کیا تصور ہے اگر میری ماں نہیں ہے اور باپ چارپائی پر پڑا ہے تو۔ میری بھی عزت ہے سعدی! کیوں اللہ اس عورت کو اس کے کیے کی سزا نہیں دیتا؟ کیا میرا رب نہیں ہے وہ؟ کس سے مانگوں جا کر میں؟“ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ وہ پھٹ پڑی تھی۔ سعدیہ گہری سانس بھر کر سر جھکا گئی۔

”میں سے بات کروں گی کہ وہ ممانی کو سمجھائیں، تم پلینیا سر بھائی کی شادی تک صبر سے کام لے لو، پھر اللہ نے چاہا تو ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی تمہاری سرخروئی کی۔“

”نہیں۔ اللہ صرف اختیار والوں کی سنتا ہے، بے بس لوگوں کے لیے اس کے پاس بھی کوئی وقت نہیں ہے۔“

”ایسے نہیں کہتے، یاویں کفر ہے۔“

”کافری تو ہو جاتا ہے انسان مسلسل اذیت سہ سہ کر۔“

آنسو پونچھ کر کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ سعدیہ اس کی اذیت پر کڑھتی رہ گئی۔

ترفی ہاؤس میں مایوں کی تقریب جاری تھی مگر وہ دونوں تیار ہونے کی غرض سے ایک ہی کمرے میں گھسے پچھلے آدھ گھنٹے سے اس گھر کے مینوں پر تبصرہ کر رہے تھے۔

ار تفتنی سر کے نیچے بازو رکھے چت لیٹا تھا جبکہ منزل حسن کو دس تکیہ رکھے اس کے برابر بیٹھ کے کراؤں سے ٹیک لگائے بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔ ”جی جناب! ایسے کیسی لگی آپ کو اپنی مستقبل کی ہوم منسٹر محترمہ ماریہ نواز صاحبہ۔“

”مچھی ہے، خوش شکل، خوش مزاج، ماڈ اور سب

سے بڑھ کر کردار کی صاف لڑکی، تمہیں پتا ہے میں عورت ذات کی ہر خامی برداشت کر سکتا ہوں، مگر کردار میں جھول نہیں۔ بے شک پیانے میرے لیے ایک بہترین لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔“

”پھر کیا خیال ہے، صبح بتا دوں آپ کی خالہ جی کو کہ میں جسے وہ ار تفتنی سمجھ رہی ہیں ان کا مستقبل کا داماد نہیں ہوں۔“

”نہیں، ابھی نہیں، ابھی مجھے بہت کچھ پرکھنا ہے۔“

”مثلاً۔“

”مثلاً، ابھی بتا دوں گا۔ فی الحال تو جیسا کہتا ہوں دیا کرتے جاؤ۔ بس۔۔۔“

”ٹھیک ہے، بس ایسے نمرو بھی اچھی لڑکی ہے۔“

”ہوگی۔ مگر مجھے پسند نہیں ہے۔“

”کیوں۔ مائد مت کرنا، مگر مجھے وہ بد کردار نہیں لگتی، ایک عجیب سی معصومیت و نور چمکتا ہے اس کے چہرے پر، جو دیکھنے والے کو دور سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔“

”چہروں پر مت جانا میرے دوست! چہرے اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ نور کی جہاں تک بات ہے وہ تو بلقیس خالہ کے چہرے پر بھی جھلکتا ہے مگر اندر سے وہ کیسی خالون ہیں میں جانتا ہوں۔ ماریہ میں یہ بات نہیں ہے، وہ کھنی نہیں ہے، کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتی، نہ اپنی کوئی غولی نہ خالی۔“

”چلو ٹھیک ہے یا راشادی تو تم نے ہی کرنی ہے۔ میں تو یوں ہی دس ہزار کے عوض قربانی کا کبریا بن کر آیا ہوں۔“

تکیہ سائیڈ پر گراتے ہوئے جوں ہی منزل حسن نے کہا، ار تفتنی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”قربانی کے کمرے، ار تفتنی سمجھ کر جتنی اس گھر میں تمہاری خاطر داری ہو رہی ہے، نا تمہارے گھر والے دیکھ لیں تو بے ہوش ہو جائیں۔“

”ہوں یہ تو ہے، کل میں سوچ رہا تھا تمہیں اب واپس جھجھو ہی دیتا ہوں، بلقیس خالہ کو اس گھر میں

تمہارا اونڈنا تے پھر بنا لیں بھی پسند نہیں۔“ وہ اسے چھیڑنے کو کہہ رہا تھا۔ جواب میں ار تفتنی نے ہنستے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی۔

”جہاں لے لوں گا تمہاری اگر ایسی کوئی بے ایمانی کی تو یہ یاد رکھنا۔“

”اوکے، چلو تیاری پکڑو۔ نیچے تمہاری بلقیس خالہ بے نالی سے ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

فوراً اسے پیٹھر تھیرا دالتے ہوئے وہ بستر سے نکلا تھا۔ جواب میں ار تفتنی بھی مسکراتے ہوئے بیڈ سے اتر کر کواش روم میں گھس گیا۔

مجھ سے جدا ہوئے نہ تیری ذات میں رہے ہم یوں ہی شام غم کی حوالات میں رہے کس عرصہ فریب کی وحشت میں تھے کہ ہم دن میں ہی رہ گئے، نہ کہیں رات میں رہے اک شہر خواب ہم نے بلایا تھا اور پھر اس میں رہے نہ اس کے مضامات میں رہے کیوں چھینتا ہے مجھ سے میرا سایہ وجود سوچ سے کوئی کہہ دو کہ اوقات میں رہے میں جس کے روز و شب میں زمانوں سے قید ہوں مرجائے وہ اگر میرے حالات میں رہے ہر بار کوئی بات ادھوری رہا کرے ہر بار بخشی سی ملاقات میں رہے زخمی چڑیا کو ہاتھ میں دبوچے وہ اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب ار تفتنی چائے کی طلب میں وہاں چلا آیا۔

”ایکسکووزی۔!“ نمو نے آنکھوں کے گوشے میں نمی لیے پلٹ کر اسے دیکھا، پھر رخ پھیر لیا۔

”جی۔“

”ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“ ”جی ہاں۔۔۔ مگر بستر ہو گا کہ یہ فرائش آپ اپنے دوست کی ہونے والی مگر تیرے کریں۔“

”یوں آپ لوچائے بنائی میں آئی؟“
”نہیں۔“

”ویری سیڈس۔ صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی ہیں اور چائے بنائی نہیں آتی۔“

”کہہ دیا نہیں، اب جا میں یہاں سے۔ میں مزید کوئی نیا اسکینڈل انورڈ نہیں کر سکتی۔“ تنہی سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے وہ خود ہی پکٹن سے نکل گئی تھی۔

ماریہ کو شاپنگ کرنی تھی۔ لہذا منزل جو ارتضیٰ عباس بنا ہوا تھا اسے مارکیٹ لے گیا تھا۔ اس نے بھی ساتھ جانا چاہا مگر بلقیس بیگم نے اسے ساتھ جانے سے منع کر دیا تھا۔ تب ہی وہ چائے کی طلب میں پکٹن کی طرف آ گیا تھا مگر نموہ کے رخ روئے پر حیران رہ گیا تھا۔

اسے یہاں ایک بات بہت بری لگتی تھی کہ اس گھر میں انسان کی عزت نہیں تھی۔ انسان کی حیثیت اور مرتبے کو سلام تھا۔

سارا گھر بلقیس بیگم کی رائے اور احکامات پر چلتا تھا۔ ان کے شوہر اور بچوں کو ان کے کسی معاملے میں بولنے کا اختیار نہیں تھا۔ شہناز ترفی فاج کے انیک کے باعث اٹھنے بیٹھنے یہاں تک کہ بولنے سے بھی معذور تھے اور ان کی بیٹی نموہ عجیب خاموشی اور اداسی کے لہاوے میں لپٹی سارا دن کو لمبے کیل کی مانند گھر کے مختلف کاموں میں جتی رہتی یا پھر اپنے معذور باپ کے کمرے میں گھسی رہتی۔

اگلے روز برات جانی تھی۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو اچانک بیڑھیوں کے دہانے پر گھڑی نموہ سے ٹکرا گیا۔

”سوری۔ مجھے نہیں پتا تھا آپ برے وقت کی طرح کسی بھی جگہ مل سکتی ہیں۔“

”اگر میں برا وقت ہوں تو ریاست کے نواب آپ بھی نہیں ہیں۔“

اس کی ساری شخصیت کا غور اس کے منہ پر بارتی ہوا کے یک رو جھونکے کی مانند ایک پل میں وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ارتضیٰ اس کی اس درجہ بدتمیزی پر سر کھچا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس روز نموہ کی تقریب تھی۔

شہر کے سب سے مٹنے میں جہاں میں مہمانوں کے لیے دعوت دہانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ منزل حسن کے برادر تفضی عباس بنا ہوا تھا ماریہ نے صبح ہی کپڑے استری کر دیے تھے۔ ہمہ وقت وہ اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی مگر حقیقی ارتضیٰ عباس جو منزل حسن بنا ہوا تھا، کو کوئی کھاس بھی نہیں ڈال رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی نموہ کے سپرد کر دیے گئے تھے۔

سعیدی کی بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ لہذا اگر کا سارا کام نموہ کے کندھوں پر ہی آ رہا تھا۔ صبح افزا تقریب میں ناشتا تیار کرتے ہوئے اس کی کٹائی پر تیل اگر اٹھا۔ جس سے فوراً ”آلمہ بن گیا اور اب اس کے آبلے سے ٹھیس اٹھ رہی تھیں۔“

ناشتے کے بعد ریتوں کا ڈھیر دھو کر وہ ابھی فارغ ہوئی تھی کہ ماریہ نے اسے کپڑوں پر لگا دیا۔ شادی والے گھر میں کسی قسم کا تماشا مزید نہ بننے کے لیے وہ خاموشی سے ان کے ہر حکم پر سر بھکا رہی تھی۔ ارتضیٰ حسن کے کپڑے استری کرتے ہوئے ابھی اس نے استری شلواری کی ایک سائیز پر رکھی ہی تھی کہ وہاں سوراخ بن گیا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ہو کیا ہے؟ جانے نہ کس قسم کا پڑا تھا یا اس کی قسمت ہی خراب تھی۔

منزل جس وقت اپنے کمرے سے نکل کر آیا۔ ماریہ اس کا جلا ہوا سوٹ ہاتھ میں لیے نموہ پر برس رہی تھی۔ وہ ابھی بیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جب نموہ کی وضاحت پر ماریہ نے اسے زبانی دار پھٹوے مارا۔

”اسٹوپیڈ۔ تم چاہتی ہو کہ میری بے عزتی ہو۔ سب سمجھتی ہوں میں، مجھے خوش دیکھ کر آگ لگی ہوئی ہے تمہارے اندر۔“

”تو کیوں سپرد کر کے گئی تھیں میرے جہاں ہونے والے شوہر کے کیے وہاں اس کے دوست کے بھی کر دیتیں۔“

نموہ اس کے تھپر پر خاموش نہیں رہی تھی۔ ماریہ

کو مزید ناؤ گیا۔

”دیکھا! نکل رہی ہے ناندر کی جلن باہر، ذرا شادی پٹ جائے، پھر کرتی ہوں تمہارا کوئی نہ کوئی بندوبست۔“

”ماریہ۔“ منزل حسن اچانک وہاں آیا تھا۔ ”کیا ہوا؟ کیوں شور کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں ارتضیٰ! میں تیار ہو رہی تھی تو منزل بھائی کے کپڑے اس فضول لڑکی کو دے دیے پر پس کرنے کے لیے، مگر یہ موبائل پر کسی کے ساتھ مصروف تھی۔ لے کر سوٹ جلا دیا اتنا قیمتی۔“

”کوئی بات نہیں۔ وہ دوسرا سوٹ پہن لے گا۔ اس میں اتنا شور مچانے والی کون سی بات ہے؟“ ماریہ کو نموہ کے لیے اس کی حمایت پسند نہیں آئی تھی اور یہی بات اس رات اس نے اپنی ماں کو بتائی تھی۔ انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں نموہ اپنی مظلومیت سے ارتضیٰ کو بھاس نہ لے۔ ماریہ تو اذکی زندگی سے نموہ کا کانٹا نکالنے کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔

یا سر کی دامن گھر آچکی تھی۔ ولیمہ کا فنکشن بھی ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مہمان بھی اپنے گھروں کو سدھار گئے تھے۔ بلقیس بیگم اب ارتضیٰ پر (جو حقیقت میں منزل حسن تھا) نکاح کے لیے زور ڈال رہی تھیں مگر وہ ٹال رہا تھا۔

بلقیس بیگم کی نظر میں اس کی اس ٹال مٹول کے پیچھے بھی نموہ کی جگہ وہ حقیقت میں ارتضیٰ کے فیصلے کا شکار تھا۔ اوہ اس کے پاپا نے فون کر کے ماریہ کے لیے اس کی رائے لی تھی اور ارتضیٰ نے اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اگلی صبح بلقیس بیگم کو ساری حقیقت بتانے والا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ٹیرس پر کھڑے ہوئے اس کی نگاہ نیچے لان پر پڑی تھی اور وہاں کچھ ایسا تھا جس نے اسے چونکا دیا تھا۔

”وہ انسانی ہونے اس کی تمام تر توجہ کھینچ گئے تھے۔ اسے شک نہیں مکمل یقین تھا کہ ضرور نموہ شہناز پھر کوئی گل کھلا رہی ہوگی۔ تاہم پھر بھی وہ خود کو دبے پاؤں

وہاں گھر کے پھجواڑے میں آنے سے نہیں روک سکا تھا۔

”حرام تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ابھی میرا تم سے ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ پلے ابھی تم واپس جاؤ، کل صبح میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر تمہارے گھر آ جاؤں گی، قسم سے۔“

”اگر نہ آؤں تو؟“

”نہ آؤ تو جان سے مار دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، اس بار لگتا ہے یہی کرنا پڑے گا۔“ وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً اس سے نموہ کے گھرے مراسم تھے۔ تب ہی متنبہ کرتا ہوا وہ گیٹ چھلانگ گیا تھا۔ نسولی ہولا اس شخص کے فرار کے بعد جوں ہی واپسی کے لیے پلانا، ارتضیٰ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

”دوسرے تو اصل کہانی یہ ہے تمہاری۔ بلقیس آئی نے بالکل صحیح تعارف کروایا تھا تمہارا۔ شکل مومنوں کے تر قوت کا فرار۔“

”ٹھٹ اپ۔“ اس کے طنز کے جواب میں ماریہ چلائی تھی اور نہیں اسے کرنٹ لگا تھا۔ ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ پیچھے ارتضیٰ اس دیدہ دلیری پر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

اگلے چندہ منٹ اور بھی حیران کن تھے۔

ٹی وی لاؤنج میں یا سر کی دامن سمیت سارا گھر اکٹھا تھا اور انہیں اکٹھا کرنے والی ماریہ نواز تھی۔ منزل حسن بھی وہیں موجود تھا اور ارتضیٰ کے وہاں بیٹھنے تک وہ رو کر اسے بتا رہی تھی۔

”میں پہلے دن سے آپ کے دوست کے یہاں قیام پر مطمئن نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا کچھ نہ کچھ ہو گا اور آج وہی ہوا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے آپ کے دوست کو انتہائی شرم ناک حالت میں وہاں لان میں نموہ کے ساتھ دیکھا ہے۔ اف ارتضیٰ! میرا دل اس منظر کا تصور کر کے کانپ رہا ہے۔ ہمارے گھر میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں خبر ہی نہیں۔“

ارتضیٰ کی طرح منزل بھی ہکا بکا کھڑا تھا۔ جبکہ

ار تفضی کے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے والی نمروہ کے
جو اس جیسے خود ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ اپنے بابا کے پاس
تھی مگر بستر مرگ پر بڑا وہ فاج زدہ شخص کسی بھی طور
سے بول کر اس کی پائیکری کی کوئی دینے کے قابل
نہیں تھا۔ تب ہی ار تفضی نے بولنے کی کوشش کی
تھی۔

”آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں سوائے بکواس کے اور
کچھ نہیں ہے۔ میں بتاتا ہوں حقیقت کیا ہے۔“

”چپ کر بے غیرت لڑکے مجھے تو شروع سے
تمہاری نیت پر شک تھا۔ میں نے ار تفضی سے کہا بھی
تھا اور یہ نمروہ۔ اس کا تو میں خون پی جاؤں گی۔ کتنا رسوا
کرے گی تو۔ بول۔“ بلقیس بیگم دھاڑ کر اسے چپ
کرواتے ہوئے نمروہ پر بڑی تھیں۔

”یہ غلط ہے آئی! آپ کی بیٹی جھوٹ بول رہی
ہے۔ نمروہ کا کوئی قصور نہیں اس میں۔“ ار تفضی نے
کہنا چاہا۔

”بکواس بند کر اپنی۔ بڑا آیا نمروہ کا ہمدرد، میری بیٹی
نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اتنی ہمدردی ہے
مجھے نمروہ سے تو کل ہی نکاح پر دھوا دیتی ہوں تیرا اس
سے۔ لے جا اس بلا کو اپنے ساتھ، ہم بھر پائے ایسی
معصوم بیٹی سے۔“

”آئی! آپ میری بات تو سنیں۔ حقیقت وہ نہیں
ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“

”بس چپ۔ خوار جو آگے ایک لفظ بھی مزید کہا
تو، ار تفضی بیٹا! میں کل ان دونوں کا نکاح کروا رہی
ہوں۔ یہ بد بخت اس طرح ہماری عزت سے کھیل کر
نہیں جاسکتا۔“ نواز صاحب نے حسب معمول اپنی
بیگم کی تائید زور و شور سے سر ہلا کر کی تھی۔

”ٹھیک ہے خالہ! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔
میں خود بھی اپنے دوست کی حرکت سے شرمندہ ہوں۔
میرا بھی یہی خیال ہے کہ کل یہ نکاح ہو ہی جانا
چاہیے۔“

ار تفضی کو امید نہیں تھی کہ وہ ایسا کچھ بولے گا۔
تب ہی اس نے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی

طرف دیکھا تھا مگر وہ خاموش سا واپس پلٹ گیا۔
ار تفضی کے لیے وہ رات قیامت کی رات تھی۔ بار
بار اس نے اپنے گھر کا کل کئی چابی بھی مگر کامیاب نہ
ہو سکا تھا۔ اگلے روز اس کے لاکھ احتجاج کے باوجود نمروہ
شہباز اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ نکاح کے ساتھ ہی
رخصتی کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ خاموش سا اندر ہی اندر
طوفان دبائے سب برداشت کرتا گیا۔

اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو گیا تھا مگر بلقیس بیگم
کے ساتھ اب جو ہونے والا تھا وہ سوچ کر اسے دلی
تسکین ہو رہی تھی۔



ترندی ہاؤس کے ٹی وی لاؤنج میں اس وقت موت
کا سنا سنا پھیلنا ہوا تھا۔

ار تفضی عباس کے والدین سمیت وہاں نواز ترندی
صاحب کی پوری فیملی موجود تھی مگر سب بول دکھائی
دے رہے تھے گویا سانپ سو گھ گیا ہوا۔ بلقیس بیگم
کے تیج کے دانے گراتے ہاتھ واضح چمکیا رہے
تھے۔ بڑے صوفے کے پیچھے ماریہ نواز یوں سر جھکائے
کھڑی تھی۔ گویا اس نے ایک بھی لفظ زبان سے نکالا تو
اس پر گھر کی دیواریں چھت سمیت گر پڑیں گی۔

مزل حسن سر جھکائے تار ہا تھا۔
”میں آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں مگر

حقیقت یہی ہے کہ میں ار تفضی عباس نہیں ہوں۔ میرا
نام مزل حسن ہے۔ ار تفضی میرا دوست ہے۔ اس کے
کہنے پر میں یہاں آیا تھا۔ مجھے نہیں پتا اس کی پلاننگ
کیا تھی مگر مجھے حقیقی طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ
ار تفضی کو ایک اچھی اور نیک لڑکی زندگی بھر کے لیے
بہترین ہم سفر کی صورت مل گئی ہے۔ ایک چال انسان
چلتا ہے اور ایک چال کائنات کا رب چلتا ہے۔ پھر ہوتا
وہی ہے جو اللہ رب العزت چاہتا ہے۔“

بازی پلٹ گئی تھی۔ بلقیس بیگم نے اپنے طور پر نمروہ
کا پتا صاف کرنے کے لیے جو چال چلی تھی وہ ان ہی پر
الٹ گئی تھی۔ وہ یہ بات بھول گئی تھیں۔ بے شک

اللہ جسے چاہتا ہے، سرخو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے
ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتا ہے۔ آج سالوں بعد وہ
سب کے سامنے بے نقاب ہو گئی تھیں۔ انہوں نے
کیا چاہا تھا، مگر ہو گیا تھا۔ کائنات کے بڑے مصنف
کے سامنے ان کی ساری چالیں دھری کی دھری رہ گئی
تھیں۔

نمروہ شہباز کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ یہ تشکر
کے آنسو تھے۔ اسے ار تفضی عباس جیسے امیر کبیر خور
مرد کی بیوی بننے سے زیادہ اپنی پار سانی ثابت ہونے کی
خوشی تھی۔ بے شک اس کے مہرمان رب نے اس پر
بڑا کرم کیا تھا۔

کرم تو اللہ نے ار تفضی عباس پر بھی کیا تھا۔ دس ہزار
کے عوض ہونے والی ار تفضی عباس کی پلاننگ نے
اسے ایک بہت بڑے غلط فیصلے سے بچا لیا تھا۔



وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ نمروہ واش روم سے نکلی تو
ار تفضی کو سوتے دیکھ کر بیڈ کے قریب آگئی۔

”ار تفضی! اٹھ جائے، آج آٹس نہیں جانا کیا؟“
جب دو تین بار پکارنے پر بھی اس کی نیند نہیں ٹوٹی
تو اس نے بیڈ کے قریب آکر زور سے اسے گیلے بال
جھٹکے، پانی کے چھیننے ار تفضی پر پڑے۔ وہ ہڑبڑا کر نیند
سے بے دار ہوا تھا۔

”یہ نیند سے جگانے کا کون سا طریقہ ہے؟“
”جب کوئی شرافت سے نہ اٹھے تو یومی بہترین
طریقہ ہے۔“ وہ ہنسی تھی۔ ار تفضی نے ہاتھ بڑھا کر
اسے خود پر گر لیا۔

”اچھا۔ اور جس روز لیٹ گھر واپسی پر تم سوئی
ہوئی ہو اور میں جگانا رہ جاتا ہوں تب۔۔۔؟“

”تب کیا مجھے تو سات خون معاف ہیں۔“
”اچھا کس نے کیے ہیں سات خون معاف؟“
”میرے، ہم سفر نے۔“

پڑی ادا سے کہتے ہوئے اس نے ار تفضی کی ناک دبا
دی تھی۔ تب ہی ار تفضی نے اسے خود میں جذب
کر لیا۔

”میں اتنی اچھی، ہم سفر کے قابل نہیں تھا نمروہ! بے
شک میرا مہرمان رب بہتر جانے اور کرنے والا ہے۔ پتا
ہے! ترندی ہاؤس سے تمہاری رخصتی کے بعد وہاں
ایک کے بعد ایک مصیبت نے گھر کا راستہ دیکھ لیا
ہے۔ تمہاری کزن ماریہ نواز شادی کے بعد طلاق لے
کر عیشہ کے لیے گھر واپس آگئی ہے۔ شاید شہباز بچا کی
رحلت کے پیچھے بھی ان ہی حالات کا عمل دخل ہے۔
بہر حال ہر انسان کو اپنا لوبہ تو کاشا ہی پڑتا ہے۔ یا سرکی
پیوی بھی سنا ہے الگ ہو گئی ہے۔ میں تو اللہ کا لاکھ لاکھ
شکر ادا کرتا ہوں کہ تمہاری ہنر تائی نے خود اپنے
ہاتھوں سے زبردستی ہمارا نکاح کروا دیا۔ وگرنہ حقیقت
کھل جانے کے بعد وہ کبھی نہیں میرے نکاح میں نہ
دیتیں۔“

”ہوں۔ اب تو مجھے بھی یہ سمجھ میں آ گیا ہے کہ
جب اللہ انسان کو کسی چیز سے محروم کرتا ہے تو یقیناً
اس کے پاس آپ کے لیے اس سے بہتر چیز موجود ہوتی
ہے۔ میں مزل بھائی کی ہمیشہ شکر گزار رہوں گی
ار تفضی! کہ ان کی وجہ سے آپ میرے نصیب کا حصہ
بن گئے۔“

ار تفضی کے بال بکھرتے ہوئے اس نے اپنا سر
اطمینان سے اس کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ بے شک
ار تفضی عباس کی رفاقت میں گزرے پچھلے پانچ سال
اس کی زندگی کے بہترین سال تھے۔



مقصودِ حیات



عبداللہ کے سائیکل اندر لاکے کھڑی کرنے تک دونوں بچوں نے اسے راستے میں ہی قابو کر لیا۔ وہ دونوں کو پیار کرتے اپنے ساتھ لیٹائے اندر آگیا۔ ”کہاں رہ گئے تھے آپ اتنی دیر کردی۔ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔“

سلام کے بعد وہ عبداللہ کے لیے پانی لے کر آئی تو فوراً ”پوچھ بیٹھی۔“

”اے، آپس تو پتا ہی ہے، دکان کے ساتھ ہی بچوں کا اسکول ہے۔ بس آج کسی شرارتی نے ٹائری ہوا نکال دی۔ اس کی وجہ سے کافی خوار ہونا پڑا۔ ایک تو ویسے ہی آج نکتے نکتے دیر ہو گئی اوپر سے سائیکل ٹھیک کروانے میں اتنا وقت لگ گیا۔“ عبداللہ کے لہجے میں واضح جھکن تھی۔

”آپ کیسے کچھ پیسے جمع ہوئے کیا؟“

”کیوں، تمہیں کچھ چاہیے؟“

”ہاں وہ عثمان بھائی کے بیٹے کے لیے کپڑے بنانے تھے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر آپ کے پاس پیسے ہوں تو مجھے کل بازار لے چلیں۔ چھوٹے کے لیے کپڑے جوئے اور کچھ ضروری چیزیں خرید لائیں گے سب بہن بھائی کچھ نہ کچھ دے دلا کر فارغ ہو چکے ہیں بس ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔“

موسم نے جواب دیا۔ اس کے چھوٹے بھائی کی پچھلے سال ہی شادی ہوئی تھی اور اب اس کا بھتیجا دو ماہ کا ہو گیا تھا مگر وہ ابھی تک اس کے لیے کوئی تحفہ لے کر نہیں چاکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ کچھ پریشان سی تھی۔

پورے پچاس ہزار تھے اس نے ایک بار پھر ان نوٹوں کو گنا اور پھر احتیاط سے اوپر رہینڈ چڑھا کر لفافے میں بند کیا اور صندوق کھول کر اس لفافے کو سب سے نیچے رکھ کر اوپر باقی سالانہ اور کپڑے وغیرہ رکھ دیے۔ مغرب کی اذان ہوئے دس پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ ہلکی ہلکی رات کا سا یہ چاروں طرف چھا گیا تھا۔ فضا میں ایک مانوس خاموشی ٹھہر گئی تھی۔ سرویوں میں تو رات بھی ایک دم سے ڈھل آئی تھی اور یہ خاموشی ایک کھٹکاسا دل میں پیدا کرتی تھی۔

عبداللہ ابھی تک گھر میں پہنچا تھا۔ دونوں بچے برآمدے میں اپنا اپنا بستر کھولے اسکول کا کام کر رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے صحن میں آگئی۔ صحن کے دونوں طرف کی دیواریں گارے اور اینٹوں کی بنی تھیں اور لمبائی بھی صرف آٹھ فٹ تھی۔ اگر کوئی دیوار پھلانگ کے آتا چاہے تو آرام سے آسکتا تھا۔

”اللہ نہ کرے یہ کیسا خیال میرے ذہن میں آیا ہے“ اللہ ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔“ اس نے صدق دل سے آمین کہا اور اس شیطانی وسوسے کو فوراً باہر دھکیل دیا۔

”بس آج عبداللہ آتے ہیں تو ان سے کہتی ہوں کہ کسی سے بات کریں اور فوراً ان دیواروں کو پکا کر دائیں اور کم از کم چار فٹ اور اونچائی کریں۔ یہ ہر روز کا خوف تو ختم ہو۔“

اس نے دل ہی دل میں پچاس ہزار کا ایک مصرف تلاش کیا۔ اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ بچے مخصوص آواز سن کے اندر سے دوڑے چلے آئے۔

”اب اٹھو اور کھانا لے کر آؤ۔ آج بھوک بہت لگی ہے۔“

عبداللہ نے بات کو سمیٹا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

”کچی دیواروں سے بھی تو کام چل ہی جاتا ہے بلکہ اچھا خاصا چل رہا ہے۔ کیوں نہ ان پیسوں کو عبداللہ کے حوالے کر دوں کہ وہ اپنے لیے کوئی موٹر سائیکل خرید لیں۔ ہر روز کبھی سائیکل پر اور کبھی لوکل گاڑیوں پر سفر کرنا ان کے لیے بہت ہی تھکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔“

وہ اپنی سوچوں میں غلطیاں تھی۔ غریب لوگوں کا یہ ہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔ ہاتھ میں پیسہ نہ ہو تو بھی پریشانی

”ٹھیک ہے، صبح لے چلوں گا۔“

عبداللہ نے رضامندی دی تو وہ پہلے خوش ہوئی اور پھر یکدم ہی بجھ گئی۔

”لیکن میں جاؤں گی کیسے۔ آپ کو پتا ہے اس حالت میں گاڑیاں بدل کر سفر کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔“ اس کی بات پر عبداللہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر فوراً ”بولو۔“

”چلو یہ تو ایسا مسئلہ نہیں ہے، کل تھوڑی دیر کے لیے نوید سے اس کی موٹر سائیکل لے آؤں گا اور تمہیں بازار لے چلوں گا۔“

نوید اس کا جاننے والا تھا۔ جس کی کپڑے کی دکان اس کے جزل اسٹور کے ساتھ تھی۔

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

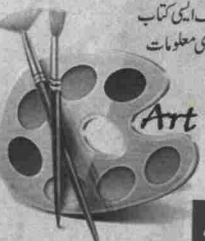
First Time in Pakistan
a Complete Set of
5 Painting Books
in English



Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

آپ آرٹ کے طالب علم ہیں یا پروفیشنل آرٹسٹ
برش پکڑنے سے، عمل پیشنگ تک آپ بن سکتے
ہیں ایک مکمل آرٹسٹ

اب پیشنگ سیکنا بہت آسان ایک ایسی کتاب
جس میں پیشنگ سے متعلق ساری معلومات



Art With You

شائع ہوئی ہے

قیمت - 350/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی فون: 32216361

رقم کہاں سے آئی؟ اب کی بار عبداللہ نے سنجیدی
سے پوچھا تو جواب میں اس نے ساری کہانی سنا دی۔
”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو صرف بیس ہزار ہیں۔“
عبداللہ کے کہنے میں یقینی حیرت تھی۔

”جی یہ تو میں نے آپ کو دیے ہیں کہ آپ اپنی
دکان میں اور سامان ڈالوا لیں تاکہ آمدنی اور بہتر ہو سکے
اور باقی کے پیسے ہم خالہ سیکنہ کو دے دیں گے تاکہ وہ
اپنی بیٹیوں کی شادی کر سکیں۔“ وہ مزید بولی۔
”پیسہ تو اتنی جالی چیز ہے کسی کے پاس آج ہے کل
نہیں ہوگا۔“

مورٹ سائیکل آپ بعد میں بھی خرید سکتے ہیں
دیواریں ہم بعد میں بھی اونچی کر والیں گے لیکن
سیکنہ خالہ یہ جو مشکل گھڑی آج آئی ہے اس کا
سدباب تو آج ہی کرنا ہوگا ورنہ کل کو وہ ایک ایسا
بچھتاوا بن جائے گا جو ہر صورت ڈستار ہے گا۔“

عبداللہ یک ٹک اپنی بیوی کو دیکھ کر جا رہا تھا وہ جانتا
تھا کہ مریم ایک اچھی اور صاف تھری سوچ کی حامل
ہے مگر اس کے اوروں کے لیے خیالات اور احساسات
استے پائیزہ ہوں گے یہ آج سے پہلے اور اک نہ ہوا تھا۔
”اور ویسے بھی لوگوں کی مدد کرنا اللہ کو بہت پسند ہے
اور ایسے لوگ جو نظا ہر تو خوشحال نظر آتے ہیں لیکن
اپنی عزت کی خاطر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے
ان کی مدد کرنے کا حکم تو اللہ نے ہمیں دیا ہے ناں۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ خاموش ہو گئی۔ وہ سچی
شاید عبداللہ کو یہ سب پسند نہیں آیا۔ وہ اپنے ہونٹ
چبانے لگی جب عبداللہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
”میں خواہشات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی مدد
کرنے والے اللہ کے پسندیدہ بندے ہوتے ہیں اور
مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میری بیوی بھی
ایسے ہی بندوں میں شامل ہے۔“

اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر
اس نے کہا تو مریم کے ارد گرد ٹھنڈی ہوا میں چلنے
لگیں اور شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے جنت کے باغوں
کی ٹھنڈی اور مازہ ہوا میں ہوتی ہیں۔

”سیکنہ بے چاری تو بہت پریشان ہے۔“ زینت
خالہ اس کے محلے میں ہی رہتی تھیں اور آج اس کے
ہاں آئی ہوئی تھیں۔ اس نے چائے کی ٹرے لا کر رکھی
جب انہوں نے بے بات کی۔
”کیوں خالہ! خیریت کیا ہوا انہیں؟“
”ارے بیٹا! خیریت کہاں؟ تم تو جانتی ہو آج کل
اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں بیٹیوں کے۔ سیکنہ کی دو
بیٹیوں کے رشتے تو پکے ہو گئے ہیں مگر اب ان کے
سرال والے جلدی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ بس یہی
بات اس کے لیے فکر کا باعث بن گئی ہے کہ اتنی جلدی
تفصیل بتائی۔“

”جی خالہ! سمجھتا ہوں ہے جس کے اپنے دل پر بھی
گزری ہو۔ ہماری ماں نے بھی بیوی کی چادر اوڑھے
جس طرح ہمیں پالا ہوا ہم ہی جانتے ہیں۔ کیسی کیسی
مشکلیں راہوں میں آئیں، تمہاری ان سے پنپنا ہونا
ہے گاڑی کا دوسرا پیسہ الگ ہو جائے تو زندگی چلتی
نہیں، گھسنا شروع ہو جاتی ہے۔“ وہ ماضی کی یادوں
میں کھو گئی۔

اس نے عبداللہ کے ہاتھ میں پیسے تھمائے تو وہ
حیرت سے اس کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کبھی
حیرت صاف بڑھی جاری تھی جس سے اس نے بہت
لطف لیا اور ہنسنے لگی۔ اپنے فیصلے نے اسے ویسے ہی
مطمئن اور سرشار کیا ہوا تھا۔

”یہ اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“
جب کافی دیر تک اس کی ہنسی نہ چھٹی تو اس نے پوچھ
لیا۔
”بس دیکھ لیں آپ کی بیوی کتنی سمجھ دار ہے۔
شکر ادا کریں خدا کا کہ اس نے آپ کو مجھ جیسی بیوی
عطا کی اور آپ کو پتا ہے نیک بیویوں خدا کا تحفہ ہوتی
ہیں۔“

”آپ اپنی تعریفیں کرنا بند کریں اور مجھے بتائیں یہ

اور جو چار پیسے ہاتھ آجائیں تو اور بھی مشکل کے ہزاروں
مسائل ناگ کی طرح منہ کھولے ان پیسوں کو ہرپ کر
جانے کی کوشش میں ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا
کہ کس ناگ کے منہ میں پیسہ ڈال کر اس کا منہ بند
کریں اور باقیوں کو تسلی دے کر خاموش کر دلائیں۔
گہری سانس لے کر وہ ڈونکے میں سامان ڈالنے لگی۔

وہ چار بن بھائی تھے۔ ابو کا بچپن میں ہی انتقال
ہو گیا تھا۔ یہ وہ ماں نے کپڑے سلائی کر کے اپنا اور بچوں
کا پیٹ پالا اور بڑی دونوں بیٹیوں کی شادیاں جلد ہی
کر دیں۔ مریم اور عثمان نے یونیورسٹی کر کے اپنی تعلیم
مکمل کی۔ میٹرک کے بعد مریم کی بھی شادی ہو گئی۔

بچت کرنا اور کچھ پیسے پس انداز کرنے کا گرا سے
عثمان نے ہی سکھایا تھا۔ وہ اکثر اسے سمجھاتا تھا کہ
”مریم! تم ایک عورت ہو، کل کو تم نے ماں بن کر بچوں
کی تعلیم و تربیت بھی کرنی ہے اور ایک گھریلو خاتون
ہونے کے ناطے تمہارا یہ ذمہ ہے کہ تم یہ طے کر دو کہ
کس طریقے سے زندگی گزارانی ہے۔ زندگی سبب اور
نتیجے کے گرد گھومتی ہے، جیسا سبب ہو گا ویسا ہی نتیجہ
بھی نکلے گا۔ اس لیے اچھی اور بہتر بات یہ ہے کہ
زندگی گزارنے کے لیے اچھے اسباب پیدا کرو تاکہ اس
کے بہترین نتائج نکلیں۔“

اور پھر اس نے یہی کیا۔ اس کے دونوں بچے ابھی
چھوٹے تھے۔ عبداللہ سبھا ہوا انسان تھا۔ بازار میں
کریانے کی دکان تھی، بہت اچھی تو نہیں مگر پھر بھی
اچھی چلتی تھی۔ سارا منافع وہ لا کر اسے تھماتا، جس
میں سے وہ گھر کا بجٹ بھی چلاتی اور کچھ نہ کچھ بچا بھی
لتی۔ اسی وجہ سے آج اس کے پاس پچاس ہزار جمع
ہو گئے تھے۔ آج کے منگانی کے دور میں یہ رقم معمولی
تھی لیکن جن لوگوں نے آٹھ دس ہزار میں پورا مہینہ
چلانا ہوا ان کے لیے یہ کافی زیادہ رقم تھی۔

لکھتے ہیں

”عشوہ بیٹی! ایک بات کہوں؟“ بھابھی بیگم پالک کے پتے چنے میں اس کی مدد کر رہی تھیں۔ وہ جو پڑی نفاست کے ساتھ باریک باریک پالک کاٹ رہی تھی، بھابھی بیگم کے لہجے کی سنجیدگی سے کچھ ٹھنک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیسی بات؟“

”کچھ خاص نہیں، کیا پتا۔ میرا وہم ہو۔“ صاف لگ رہا تھا۔ وہ بات ٹالنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اب کے عشوہ سچ ٹھٹکی۔

”بھابھی بیگم! بتائیے نا، یوں تو میں اب جتنی رہوں گی۔“ وہ چھری پر ات میں رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

”کام چھوڑ کر کیوں بیٹھ گئی ہو؟ ابھی بچیاں آجائیں گی، بھوک بھوک چلائی ہوئی۔“ انہوں نے چشمہ درست کرتے ہوئے چھری خود پکڑ لی تھی۔ ”عروسہ کب تک آتی ہے اسکول سے؟“

”اسکول کہاں، اب تو خیر سے کالج جاتی ہے۔“ عشوہ نے مسکرا کر تصحیح کی تھی۔



”ہاں! وہ ہی۔“ مواکھن۔۔۔ بھانے کون سا طلسم ہے، اس چار دیواری کے اندر، بچپن کے رنگ ڈھنگ ہی بدلنے لگتے ہیں۔ ان کی اپنی پوتی نوری بھی عروسہ کی کلاس فیلو تھی۔ عشوہ نے یہی سمجھا تھا کہ وہ اپنی پوتی نوری کی بات کر رہی ہیں۔

”خیر تو ہے؟“ وہ خواہ مخواہ مسکرا دی۔

”ہاں، بول سب خیر ہے۔“ وہ کلس کر بولیں۔

”بھابھی بیگم! صاف صاف کہیں نا۔۔۔ پہیلیاں میری سمجھ میں کہاں آتی ہیں۔“

”اسی سادگی سے مجھے اندیشے لاحق ہیں۔ بیٹی! جوان ہوتی بچی کی ماں ہو۔ ماشاء اللہ سے عہدہ نویس جماعت کے پرچے دے گی اس دفعہ۔ آنکھیں کھلی رکھا کرو۔ ارد گرد پر دھیان دیا کرو۔“ ان کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

”کیا کروں بھابھی بیگم! تین بچیاں ہیں۔ ان کے سو طرح کے کام۔“ اوپر سے میری بو بھل طبیعت میں تو اب مزید جاہتی نہیں تھی، مگر اللہ کی رضا۔۔۔ پھر بھی سوچ لیا کہ کیا پتا، وہ رحیم رب مہمانی کروے۔ تین بیٹیاں ہیں۔ کیا پتا، اس دفعہ بیٹا ہو جائے۔ آپ سے بھلا کون سی بات چھپی ہے۔ عمر نے کیسا طوفان اٹھادیا تھا کہ مزید بچہ نہیں چاہیے۔ گھر میں اتنے دن بد مرگی رہی تھی۔“ عشوہ نے بچھے بچھے لہجے میں بتایا۔

”تمہاری کون سا عمر یا بیت گئی ہے۔ ابھی سولہ کا سن بھی نہیں لگا تھا۔ جب داؤی نے بیاہ دیا۔ یوں لگتا ہے، ابھی کل کی بات ہے۔ کالج کے دوسرے سال میں تو عمر تھا۔ ادھر عمر کے ماں باپ تو تھے نہیں۔ خالہ جنت مکانی عروسہ کی ماں کلثوم کو شوق چڑھا تھا عمر کو دولا



بنانے کا ابھی تک یاد ہے مجھے۔ عمر شادی کے لیے ماننا ہی نہیں تھا۔ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکیاں تک دیں۔ مگر کلثوم نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ اس کے سر پر سہرا سجا کر ہی دم لیا۔ بھانجے کی ”خوشی“ دیکھنے کا شوق تھا۔ بھاری نے کلثوم کو چاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب تو کلثوم کو گئے ہوئے بھی کئی برس بیت گئے۔ دیکھو! وقت بیتے پتا ہی نہیں چلا۔ ”بھابھی بیگم نے تاسف سے آہ بھری۔ ”عشوہ خود بھی حیران حیران سی بیٹے اداہ سال کو سوچنے لگی۔

”اب تم پالک چڑھاؤ۔ بچیاں بھی آتی ہوں گی۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ چہرہ تو بالکل اتر گیا ہے۔ ان شاء اللہ اس نفع دینا ہی ہو گا۔“ فارغ غیبتنا انہیں کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ ”تو کرسی سے اُلوے آؤ، میں پھیل دیتی ہوں۔“

”جی۔“ وہ آٹو اٹھا کر لے آئی تھی۔ ساتھ ساتھ چائینیز رائس کے لیے بھی تیاری کر رہی تھی۔ عمر کوچ میں چاول کھانا پسند تھا۔ بچیاں بھی شوق سے کھا لیتی تھیں۔ وہ اپنے لیے آٹو پالک بنا رہی تھی۔ جبکہ اور کسی کو سبز یوں سے خاص رغبت نہیں تھی۔ ”خصوصاً“ عروسہ تو گوشت میں بھی سبزی دیکھ کر خوب ناک بھوں چڑھاتی تھی۔ اکثر جس روز وہ اپنی پسند کا مینو ترتیب دے لیتی تو عمر بچوں کو اور عروسہ کو باہر کھانا کھلانے لے جاتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی پسند کو اہمیت دینا ترک کر چکی تھی۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ عمر اور بچیاں گھر کے کھانے کو ترجیح دیں۔

”بھابھی بیگم! آپ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں؟“ وہ پالک چڑھا کر آئی تو کچھ یاد آنے پر پھر سے پوچھنے لگی۔ ”اے۔۔۔ ہاں۔“ بھابھی بیگم آٹو، پھیل کٹ چکی تھیں۔ اب کچھ ٹونٹنے والی نظموں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ بیشک کی طرح وہ کنفیوز ہو گئی۔

”عشوہ! یہ عروسہ بیٹی کچھ بدلی بدلی نہیں دیکھنے لگی؟“

”کیا مطلب؟“ عشوہ توقع کے عین مطابق پریشان

ہو گئی۔

”بیٹی! برا مت ماننا۔ بچی پر دھیان رکھو، یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ عمر کی خالہ زاد ہے۔ تم اس کی بھابھی ہو۔ ماں جیسا پیار بھی تم ہی نے اسے دیا ہے۔ یہ بننے اور بگڑنے کی عمر ہوتی ہے۔ بچی کی سی عمر۔ ہر چنگی چیز جی کو بھاتی ہے۔“ انہوں نے عام سے لہجے میں بہت خاص بات کی تھی۔

”جی۔“ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”تمہارے بھائی کی کوئی خبر خیر آئی؟“ بھابھی بیگم کو کچھ خیال آیا تو پوچھنے لگیں۔

”نوں تو تقریباً“ پندرہ بیس دن میں کئی مرتبہ کرتا ہے۔“ عشوہ کی آواز بھرا سی تھی۔ فانیق اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اسے لیول کے بعد باہر گیا تو پھر ملنے کو دل ہی نہ چاہا۔ اس کے چلے جانے کے بعد پہلے جان چھڑکنے والی داوی چل بیٹیں۔ پایا بھی نہ رہا۔ اب میکے کے نام پر صرف ایک بھائی کا آسرا تھا اور وہ بھی پردیس میں نجانے کون کون سی ڈگریاں اکٹھی کر رہا تھا۔ نجانے یہ جنوں، یہ شوق، یہ علم حاصل کرنے کی پیاس، یہ کتابوں سے عشق اس نے خاندان میں سے کس ”علم دان“ سے چرایا تھا۔ عشوہ کے پایا اور امی تو واجبی سے تعلیم یافتہ تھے۔ خود عشوہ کی اس وقت شادی کر دی گئی تھی جب نو بں جماعت کی نئی غور کتابوں اور بیگم کو دیکھنے اور برتنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

پایا اور داوی کو جانے کی جلدی تھی۔ شاید اسی لیے عشوہ کو گھریار کا کر گئے۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ پایا اور داوی کا یہ فیصلہ اس کے حق میں بہتر ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ تھیں اور دھیال میں اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ”عشوہ بیٹی! کہاں کم ہو گئیں؟“ بھابھی بیگم نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ وہ سوچوں کے بھورے سے باہر آئی۔

”کچھ نہیں۔ آپ بتائیے، نوری کے رشتے کا کیا بنا؟“

”میرا بس چلے تو شام سے پہلے اسے نمنا دوں، مگر نوری کی ماں کو اسے پڑھانے کا ”چاہ“ چڑھا ہے۔“ بھابھی بیگم کے بھی اس کی داوی جیسے خیالات تھے۔ انہیں بھی اس کی شادی کی بہت جلدی تھی۔ آئے دن رشتے کروانے والیوں کی مٹھی گرم کیے رکھتی تھیں۔

”تم بھی عروسہ کے سلسلے میں ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے، فرض ادا کرو، یہی بہتر ہے۔“ ان کا انداز نا صاف تھا، بہت کچھ جتنا ہوا مگر عشوہ کی سادگی۔

”میں اکیلی تو کچھ نہیں کر سکتی۔ عمر کو بھی تو دیکھنا چاہیے۔ اپنے دفتر میں دوستوں میں۔۔۔ حلقہ احباب میں۔“ عشوہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم عمر سے بات کرو۔ ابھی سے کوشش کرو گی تو بات کہیں بنے گی۔“ انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

”رنگ روپ بھی کیا غضب کا ہے۔“

”ناشاء اللہ سے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اسی پل عمیمہ اسکول سے آئی تھی۔ عموریہ اور ایمن اس کے پیچھے تھیں۔ صبح تو عمر ہی ان چاروں کو اسکول کالج ڈراپ کرتا تھا۔ آج کل بچیوں کے ٹیٹ ہو رہے تھے۔ سو وہ تینوں ہی گیارہ بجے دین پر آ جاتی تھیں۔ عروسہ تقریباً تین بجے عمر کے ساتھ واپسی آئی تھی۔ عمر عمو“ بچیوں کو دین پر آنے جانے نہیں دیتا تھا۔ یک ایڈ ڈراپ اسی کی ذمہ داری تھی مگر جب بچیوں کے ماہانہ ٹیٹ شروع ہو جاتے تو پھر روٹین ڈسٹرب ہو جاتی تھی۔

”خیر سے پڑھ آئی ہو؟“ بھابھی بیگم نے عمیمہ کے سلام کا جواب دے کر محبت سے پوچھا۔

”جی، داوی بیگم! وہ ان کے قریب اچک کر تخت پر بیٹھ گئی اور اپنے جو کر زاتار نے لگی۔

”ناشاء اللہ سے عمیمہ بھی عروسہ کے برابر دیکھنے لگی ہے۔ رنگ روپ اور اٹھان اچھی ہے۔ عشوہ! تو تمہاری دوسری تصویر ہے۔“ بھابھی بیگم کو خوبصورتی

بہت بھاتی تھی۔ بچن میں مصروف عشوہ مسکرا دی۔ عمیمہ منہ ہاتھ دھو کر یونیفارم بدلنے کے بعد چھوٹی بہنوں کے کپڑے تبدیل کروا کر اس کے پاس بچن میں آئی تھی۔

”اما! کچھ ہیلپ کروا دوں؟“ وہ بڑی ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں میری جان! میں کر لیتی ہوں۔“ عشوہ کو اپنی بیٹی کے خیال رکھنے کے انداز بہت پسند تھے۔ وہ عادتوں اور مزاج میں اپنی ماں جیسی تھی۔ حساس، نرم دل۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، ”بیٹیاں ماؤں کا پرتو ہوتی ہیں۔“

صبح کا آغاز جس افزا تقریر کے عالم میں ہوا تھا۔ تنہا عشوہ بوکھلا کر رہ جاتی تھی۔ اوپر سے طبیعت بھی بوجھل۔ عروسہ تو خود نجانے کیسے تیار ہو کر ناشتے کی میز تک آئی تھی۔ بچن میں مدد کا تو سوال ہی ناممکن تھا۔ چھوٹی دونوں کو ہلکا سا کھانا بھی جان جو کھوں کا کام تھا۔ اور اب تو یہ ذمہ داری خود بخود عمیمہ نے اٹھالی تھی۔ ایمن اور عموریہ کو برش کرنا، منہ ہاتھ دھلوانا، یونیفارم الماری سے نکال کر دینا، پال بنانا اور اس کے بعد وہ بچن میں ماں کے عین پشت کے پیچھے آکھڑی ہوتی تھی۔

”اما! کچھ ہیلپ کروا دوں؟“

”ہاں، میری جان! پاپا کے لیے آلیٹ پلیٹ میں نکال کر لے جاؤ۔ بہنوں کیلے دودھ بھی گلاس میں ڈال کر مائیکرو ویو میں رکھو۔“ اس پل عشوہ کو اپنی بیٹی پر ٹوٹ کے پیار آ جاتا تھا۔

”اما! سلاڈ کے لیے سبزیاں میں کاٹی ہوں۔“ اسے سوچوں میں گم دیکھ کر عمیمہ نے چھری اس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

”کیسی ہوتی ہیں بیٹیاں!“ بھابھی بیگم بچن میں نجانے کب آکھڑی ہوئیں۔ ”بن کے ہر درد ہر تکلیف کو جان لینے والی بیٹیاں، احساس اور خیال کرنے والی، اللہ آگن میں چستی ان تخیلوں کے بخت

بھی بلند کرے۔ انہوں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے تھے وہ گھر جانے کے لیے کھڑی تھیں۔
 ”داوی بیگم! کھانا کھا کر جائیے گا۔“ عمیمہ نفاست سے کھیرا کاتے ہوئے بولی۔
 ”داوی صدقے جائے اب چلتی ہوں بیٹا! اس وقت کی تیری ماں کے پاس آئی بیٹھی ہوں۔ اب دیکھو! گھڑی تین بجانے والی ہے۔“ بھابھی بیگم نہال ہو کر بولیں۔

”آپ کی وجہ سے ہی تو میری اماں کا دل لگا رہتا ہے۔ آخر پندرہ سالوں کا ساتھ ہے۔“ عمیمہ نے سمجھ داری سے کہا۔ اوسر عشوہ حیران ہی تو رہ گئی یعنی اس کی بیٹی اس حد تک ماں کو جانتی تھی۔ اسے خبر تھی کہ بھابھی بیگم سے ملاقات اور بات چیت عشوہ کو ہلکا پھلکا کر دیتی ہے۔ وہ ذرا سا بھی پریشان ہوتی تو پچیاں دوڑی دوڑی بھابھی بیگم کو بلا لاتی تھیں۔

”یہ آلو بالک تو لیتی چاہیے۔“ عشوہ نے جلدی جلدی تمکھن کا دودھیا پیڑونے کے پالے میں رکھا اور گرم گرم سالن سے بڑے کو چھاپا دیا۔
 ”ہاں! نوری کے لیے دے دو۔ ابھی برتن اٹھا کے“ خوشبو سو گھنٹی آدھمکے گی۔ ”وہ بوتی کی مانگنے مانگنے کی عادت سے سخت عاجز تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے پیالا انہیں پکڑا دیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد عمیمہ برتن میز پر لگا رہی تھی جب عمر اور عروسہ بھی آگئے۔

”جلدی کرو“ مجھے واپس بھی جانا ہے۔“ عمر نے ہمیشہ کی طرح آتے ساتھ ہی جلدی جلدی کا شور مچا کر اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

”بھئی لائی۔“ وہ پھلکے اتار رہی تھی۔
 ”کیا کرتی ہو پورا دن۔ ابھی تک کھانا بھی نہیں بنایا۔“ عمر کا رہ ہمیشہ چھڑا رہتا تھا۔
 ”بھابھی بیگم سے نشست رہی ہوگی۔“ عروسہ نے شرارتاً ”عشوہ کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی گھیت کر بیٹھ رہی تھی۔

”وہ تو بال بچوں سے فارغ ہو چکی ہیں۔ تم ہی کچھ خیال کر لیا کرو۔“ عمر کو تو غصہ کرنے کے لیے بہانہ چاہیے ہوا تھا۔ عشوہ پھلکے اتار کر باہر آئی تو عمیمہ ڈپٹی میں چاول، رائتہ اور سلاو وغیرہ میز پر رکھ رہی تھی۔

”کون؟“ عشوہ کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔
 ”بھابھی بیگم اور کون۔“ وہ طنز پر بولا۔
 ”یہ روٹی لیں آپ۔“ عشوہ نے تین گرم گرم پھلکے اس کے سامنے رکھے۔

”روٹی چاول کے ساتھ کھانی ہے؟ سالن کہاں ہے؟“ عمر کے طنز عشوہ کو پانی پانی کر دیتے تھے۔
 ”ایسا! آلو بالک ہیں۔ لے آؤں؟“ عمیمہ اسی طرح عشوہ کے سامنے ڈھال بن جاتی تھی۔
 ”لے آؤ۔“ وہ چائیز رائس کی طرف متوجہ تھا۔ مگر روٹی بھی اسے ضرور چاہیے ہوتی تھی۔
 ”فروٹ سیلڈ نہیں بنایا؟“ عروسہ نے بھی منہ بنا لیا۔

”سیلڈ تو ہے نا۔“ عمیمہ نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”نہ فروٹ سیلڈ نہیں ہے نا۔“ وہ مزے سے رائس کھا رہی تھی۔

”عروسہ! ہماری چاکلیٹس؟“ عروسہ اور ایمین نے ٹھنک کر کہا۔ صبح شاید عروسہ نے انہیں چاکلیٹس کا لالچ دے کر اپنے جوتے صاف کروائے تھے۔ وہ اسی طرح بچیوں کو مختلف لالچ دے کر کام نکلواتی تھی۔
 ”سوری سوٹھی! مجھے یاد نہیں رہا تھا۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح حذر تراشا۔

”عروسہ! آپ ہمیشہ چیٹ کرتی ہیں۔ ہم آپ سے نہیں بولیں گے۔ کئی ہے ہماری طرف سے۔“ عروسہ اور ایمین کے پھولے پھولے سرخ گال چپ اٹھے آنکھوں میں معصومانہ سا اشتیاق ماند رہ گیا۔
 ”اوکے۔“ عروسہ نے ہتھیار پھینک دیے۔ ”عمر بھائی! شام کو واپسی پر کٹ کیٹ کے پیکٹس لے آئیے گا۔“

”آپ نے کہا تھا۔ اپنی پاکٹ منی سے لائیں گی۔“ ایمین نے آنکھیں منکا کر عروسہ کو یاد دلانا چاہا۔
 ”آف۔“ کتنی تیز ہو تم دونوں۔“ عروسہ قل قل ہنسنے لگی۔

”آپ کی طرح۔“ عروسہ برحسہ بولی تھی۔ عمر کو یہ برجستگی قطعاً نہیں بھائی تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک ناگوار سلوٹ ابھرتی۔

”مبوں سے بات کرنے کی تیز نہیں۔ اپنی کھٹس اور مینوز تمہیں چھو کر نہیں گزرے۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے چونچیں بند رکھا کرو۔“ عمر نے بچیوں کو بری طرح سے ڈنٹا تھا اور وہ دونوں سورتے ہوئے اپنی اپنی پلیٹ پر جھک گئیں۔
 ”کیا تربیت کر رہی ہو تم ان کو۔“ عمر کی توپوں کا رخ اب عشوہ کی طرف تھا۔
 ”عمر! پچیاں ہیں۔“ وہ مننا کر رہی۔

”یہ پچیاں کل کو بڑی ہوں گی۔ عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں۔“ سمجھایا کرو انہیں۔ یہ فرض تمہارا ہے۔“ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ فیکٹس سے ہاتھ پونچھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اپنے جیسا گزار ہی بنانا۔ یہی امید ہے مجھے تم سے۔“

”عمر!“ عشوہ کے حلق میں نوالہ پھنس کر رہ گیا۔ وہ پھر سے آفس چلا گیا تھا۔ بچیاں باپ کی ڈانٹ کو اس کے جاتے ہی بھلا کر کھیل کود میں مصروف ہو گئی تھیں۔ عروسہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی جبکہ عشوہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ لیے گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ بڑے شوق سے تیار کیا گیا آلو بالک کا سالن جوں کا توں میز پر رکھا تھا۔ اس کی بھوک مر گئی تھی۔

اور یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ان پندرہ سالوں میں اسے اب تک عادی تو ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ اس حساس دل کا کیا کرتی جو ہر گھبراہٹ سے سرے سے تڑپ اٹھتا تھا۔ عمر کے سر پر روئے کو سوچتے سوچتے وہ کچھ سال پہلے چلی گئی تھی۔



عشوہ کا تعلق متوسط طبقے کے ایسے گھرانے سے تھا جن کا کنبہ قدرت کی طرف سے بہت مختصر رہا تھا۔ مرنگئی کے اس دور میں داوی کو اپنے بیٹے کے وسائل سے نہ صرف اگلی بھی بلکہ وہ خراجات کی اس جنگ میں بیٹے کا ساتھ بھی بھر پور دیتی تھیں۔

داوی بہت سختی خاتون تھیں۔ جلد سازی کا کام بہت مہارت سے کرتی تھیں۔ بہت سلیقہ مند اور کفایت شعار خاتون تھیں۔

ای اور بابا کی ایک ہی خواہش تھی اپنا گھر بنانے کی، جو کبھی نہ پوری ہوئی۔ اسی فائق کی پیدائش پر کچھ پیچیدگی ہو جانے پر وفات پا گئی تھیں۔

یوں عشوہ اور فائق، داوی کی مہمان گوئی میں سما گئے تھے۔ داوی کی تربیت نے عشوہ کو حد درجہ صابر، قانع اور سنجیدہ مزان کر دیا تھا۔ جس عمر میں لڑکیاں جنکونوں اور تنکیوں کے پیچھے بھاگتی تھیں، وہ اس عمر میں فائق کے لیے لپکان رہتی۔ داوی اسے بھگائے رکھتیں۔
 ”فائق! کل میں نکل گیا ہے۔ اسے پکڑ کر لاؤ۔“

یا پھر۔
 ”فائق کے کپڑے سرف میں بھگوئے ہیں۔ انہیں دھو دو۔“ وہ بوڑھی داوی کی ناتوانی محسوس کر کے خاصی ذمہ دار ہو گئی تھی۔ فائق کو نسلاتی۔ کپڑے پرستانی۔ اس کے لیے آلو کے چپس بناتی۔ چھوٹے چھوٹے کام کرتے۔ وہ بہت طاق ہوتی چلی گئی تھی۔ داوی آلو کی بھیجا بنانے کا طریقہ بتاتیں اور وہ شقائق سے مسالے ملائی۔
 ”وادی تخت پر بیٹھے ہوئے آواز لگا کر بتاتی جاتیں۔
 ”آدھا چچہ نمک۔ ایک چچہ مرچ۔“ آدھی چنگی زیرہ اور مٹھی بھر کٹا ہوا ہرا دھنیا ڈال کر زور اور کوڑھک دو۔“

روٹی پکانے کی باری آئی تو داوی نے چوہے کے کپاس کھڑا کر دیا۔ ”یوں پیڑہ بناؤ۔ اب میلن سے بیٹی جاؤ۔ ذرا دیر کا بیلو۔ اب احتیاط سے اٹھاؤ اور تو بے پروا لو۔“
 آخوس تک وہ گھر کے سارے کاموں میں طاق ہو گئی۔ داوی سینا پرونا بھی سکھا دیا۔ گھر سنبھالنے کا سارا سلیقہ خود بخود آچلا گیا۔

ابھی نویں کی کتابیں بابا لائے ہی تھے کہ وادی نے جھٹ پٹ اس کا رشتہ طے کر دیا۔ اس نے نانا کو تم صم ہی رہ گئی۔ بابا بھی اس رشتے کے حامی تھے۔

وادی نے بالائی بالا تمام کام نمٹا لیے۔ بیٹیاں اور صندوق کھلنے لگے۔ نجانے کب کب کی خریدی گئی چیزیں برآمد ہوئیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی چیز۔ فرنیچر، کرائی اور الیکٹرونکس کا سامان۔

وادی کی کفایت شعاری کام آئی تھی۔ کبھی کی محفوظ رقم سے شادی کے سارے اخراجات با آسانی پورے ہوئے۔

آس پڑوس کی خواتین نے وادی سے دبی زبان میں کہا بھی۔ ”ابھی عشوہ کی کڑیاں کھینے کی عمر ہے۔ دو چار سال اور ٹھہر جائیں۔“

”آپ نے سچ کہا۔“ وادی نے بڑے نئے تے انداز میں جواب دیا تھا۔ ”آج میں ہوں۔ کل آنکھیں بند کر جاؤں گی۔ زندگی کا بھلا بھروسا کیا ہے۔ گو میں کھیلے بچوں کو ان کی ماں چھوڑ گئی۔ یہ تو میں تھی۔ ان بچوں کو سمیٹ لیا۔ اگر میرا دم بھی نہ رہا تو یہ بھول سے بچے کہاں جائیں گے۔ رسول اللہ کا بھی یہی حکم ہے۔ بیٹیوں کو جلد از جلد گھر بار کا کرو۔ میں نے عشوہ کا بھلا سوچا ہے۔“

اور یہ سچ ہی تھا۔ وادی کی دور اندیشی نے ثابت کر دیا تھا کہ اس وقت کا یہ فیصلہ کتنا بہتر نہ رہا۔

کلیاں توڑنے اور جنگو پکڑنے والی کچی عمر تھی۔ اس کی آنکھیں حیرانی سے چمکتی دیکتی چیزوں کو دیکھا کرتیں۔ گلابی، دودھ جیسے گالوں پر زری کے کام والے پھل کرتے پکڑوں اور زیورات کو دیکھ کر شفق اتر آتی۔ شکرنی ہونٹ آپوں آپ مسکراتے۔

ایک روز وادی اسے بازار لے گئیں۔ دوپٹے رنگوائے، جو تے خریدے۔ پھر محمد بوٹا کے گھر لے گئیں۔ وادی کا دور بڑے کا بھانجا تھا۔ ان کی بیوی بھابھی بیگم نے چٹا چٹا عشوہ کے رخساروں کو چوما۔ ”خالہ جی! آپ کی پونی تو رنج کے سونہی ہے۔“

تب ہی میں کموں، کلثوم نے آپ کی چوٹ کیوں پکڑ لی ہے۔“

بھابھی بیگم کی تعریف نے عشوہ کو بری طرح سے شرمایا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب وادی نے بھابھی بیگم کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ سو اب اس آئیں تو ہاتھ میں مٹھی سی سوئی تھام رکھی تھی۔

وادی نے بسم اللہ کے بعد کچھ اور پڑھ کر سوئی پر پھونکا، پھر دوبارہ بھابھی بیگم کے ہاتھ میں سوئی تھامادی۔ ”لو، حلیمہ! اب ناک میں چھید کرو۔“

”ہائے، نہیں۔۔۔ عشوہ دہل کر رہ گئی۔“ وادی اہا! اٹھتے درد ہوگا۔ میں ناک میں چھید نہیں کرواؤں گی۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھرا لائی۔

”نہ میری بچی! درد کا بے کلام حلیمہ کے ہاتھ میں تو جادو ہے۔ ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔ فافٹ سوئی اندر چلی جائے گی۔“ وادی نے عشوہ کو خوب ہی پکڑا۔ ”نتھہ کے بغیر دوسن سبھی کہاں ہے۔“ بھابھی بیگم اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے پیار سے عشوہ کی ناک پر انگلی رکھی۔ ”لو، ناک تو خوب سچکی۔ مٹھی سی ناک پر اوپر کو اٹھی ہوئی۔“

”بھابھی بیگم! عشوہ نے خوف زدہ ہو کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔“

”میں تو ناک دیکھ رہی ہوں۔“ بھابھی بیگم نے اسے تسلی دی تھی اور پھر اس بل سوئی مطلوبہ نشان سے ایک جھٹکے میں اندر چلی گئی تھی۔ عشوہ کو ہانسی سی چھین کے علاوہ قطعاً درد نہیں ہوا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اس کی ناک میں بغیر تکلیف کے سوراخ ہو گیا ہے اور اس بات پر بہت خوش تھی کہ اب وہ چھوٹی سی نتھ پن سکتی ہے جو چھٹی دنیا میں بند پڑی تھی۔

محمد بوٹا، وادی کے بھانجے ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی گھر کی پہلی سوبہ نہیں اس محلے کی بھی پہلی سوبہ تھیں۔ چار دیوڑوں اور چار منڈوں کی بھابھی کے علاوہ اہل محلہ کی بھی ”بھابھی“ بن گئیں۔ یہ لقب اتنا مشہور ہوا کہ لوگ بھابھی بیگم کا اصل نام ہی بھول گئے تھے۔

بچے تو سچے بڑے تک ”بھابھی بیگم“ کے نام سے ہی پکارنے لگے۔ اکثر تو شوہر کے منہ سے بھی بھابھی بیگم ہی پھسل جاتا تھا۔ جس پر وہ خود کو لعین طعن کرتے۔

بھابھی بیگم فطرتاً بہت سادہ مزاج ہر ایک کے دکھ درد کو دل سے محسوس کرنے والی خاتون تھیں۔ ساس کے مرنے کے بعد سب دیوڑوں اور منڈوں کو پر نہایا لکھایا تھا۔ شادیاں بھی کیں۔ اس دوران اپنے بچے بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ پچھلے سال وادی بھابھی بیگم کے دوسرے بیٹے کی شادی میں شریک ہوئی تھیں۔ عشوہ بخار کی وجہ سے جانیں سکی تھی۔ ویسے بھی وہ کم کم ہی گھر سے نکلتی تھی۔ اس طرح بھابھی بیگم سے عشوہ کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ عشوہ کو یہ میدے سے گندھی خاتون بہت پسند آئیں۔

وادی نے اسے بتایا تھا۔ ”یہ تمہاری پڑوسن ہوں گی۔“

”جی۔۔۔ عشوہ کے خاک بھی تلے نہیں پڑا تھا۔“

”لو، دیکھو!“ رکشے میں بیٹھنے سے پہلے وادی نے بھابھی بیگم کے برابر سے دو مندر کو بھی نما مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ عمر کا گھر ہے۔ یعنی تمہارا گھر۔“

”وادی اہا! عشوہ کے دل میں خوب ساری گدگدائی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیلنے لگے۔ مگر وہ ”مسی“ کی آواز کے ساتھ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئی۔

”چچی! رہو۔ بولو گی تو درد ہوگا۔ بھو گی تو اور بھی درد ہوگا۔“ وادی نے تنبیہ کی تھی۔ گھر آئے تو فائق نے بتایا۔

”وادی اہا! مہمان آئے ہیں۔“ وہ گلی میں کھیل رہا تھا۔ کپڑے اور ہاتھ مٹی میں تھڑے تھے۔ عشوہ ناک میں آنکھنے والی ٹیپسیں بھلا کے فائق کو زبردستی گھسیٹ کر گھر لائی تھی۔ وادی تو مہمانوں کا سنتے ہی اندر چلی گئی تھیں۔

”کون آیا ہے؟“ وہ فائق کا منہ اور ہاتھ دھلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق جنتوں کے خوش نوا شاعر



کے سترہ مکمل اڈہ کر گیتوں کا تازہ مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

سوہن راہی گیت نگاری میں ایک بڑا نام ہیں، انہوں نے گیت کے کیوں کو بڑی وسعت اور کشادگی عطا کی ہے، انہوں نے شریعت کے سونوں سے گیت کی نئی دنیا میں تخلیق کی ہیں۔

افتخار عارف

گیتوں کی قدیمی روایت میں نئی نظر گیتوں کے دل کی دھڑکن اور معاشرتی شعور کا نرم و نازک اسلوب سوہن راہی کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فخر حسین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361
Idara-e-Adab London
63 - Hamilton Avenue Surbiton,
Surrey, KT67PW. U.K.
Phone: 0044-0208-397-0974

”تمہاری ساس ہیں اور ان کی گود میں بھال بھال کرتی بنی۔“ فائق نے منہ بنا کر بتایا۔ اسے روتے دھوئے بچے پسند نہیں تھے۔

”خالہ جی! آپ ہیں۔“ کلثوم عمر کی سگی خالہ اور چچی بھی تھیں۔ عروسہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور ان کی شادی کے تقریباً چودہ برس بعد ہوئی تھی، مگر بد قسمتی سے باپ کی شفقت سے محروم رہی تھی۔ عمر کے چچا عروسہ کی پیدائش سے دو ماہ پہلے وفات پا گئے تھے۔ خود عمر بھی والدین کے معاملے میں بد قسمت رہا تھا۔ اسے کلثوم چچی نے ہی پالا پوسا تھا اور اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر شفقت اور محبت دی تھی۔

اس نے جلدی جلدی فائق کو کپڑے پہنا کر بال بھی بنا دیے تھے۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی تب کلثوم باورچی خانے میں اس سے ملنے چلی آئیں۔

”ارے! ناک چھید والی ہے۔“ انہوں نے اس کی سوچی سوچی بے حد سرخ ناک کو بغور دیکھا۔ ”بیمیری پٹی کو درد تو بہت ہوا ہوگا۔“ ان کے لہجے میں واضح فکرت تھا۔

”جی خالہ جی! بہت درد ہوا۔ مگر ناک میں سوراخ بھی ضروری تھا۔“ انہوں نے لیے۔ ”اس کی معصومیت پر کلثوم نہال ہو کر رہ گئیں۔“

”اندرو تو آؤ۔ تمہیں شادی کا جوڑا دکھاؤں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وسطی کمرے میں لے آئیں۔ پینک پر ڈھیر سارے شاپر اور ڈبے رکھے تھے۔ خالہ جی نے ایک بڑا سا ڈبا کھول کر اس کے سامنے کیا۔ عشوہ کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے خیرہ ہو گئیں۔ اتنے خوبصورت کام والا منگلا۔ بہت ہی نفیس اور منفرد۔ کپڑا اتنا ملائم اور ہلکا تھا گویا ریشم۔ دوپٹے پر جھللاتا کام۔ عشوہ کا دل بری طرح سے دھک دھک کرنے لگا۔

”یہ میں پہنوں گی۔“ اس کے دل نے گویا سرگوشی کی۔

”یہ دیکھو۔“ کلثوم ایک ایک ڈبا اسے کھول کر

دکھاتی چلی گئیں۔ ”میں نے سوچا تھا کہ عشوہ کو ساتھ لے جاؤں گی مگر پھر یہ بات کچھ مناسب نہیں لگی۔“ وہ واوی کو بتا رہی تھیں اور واوی کا کنبشت میں ہلنا سر کلثوم کی سوچ کی تصدیق کر رہا تھا۔

”اب چلتی ہوں۔ عمر گھر آیا ہوگا۔ بھوک بھوک چلانے لگا ہے۔ بہت غصہ بھرا ہے اس لڑکے میں۔“ کلثوم اب سلمان سمیٹ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے عشوہ سے کہا۔ ”یہ ڈبے اٹھا کر رکھ لو بیٹی!“

”عمر سے کہا تھا۔ حاجی صاحب سے تو ارٹرز کا کرایہ پکڑ لائے۔“ نجائے گیا بھی ہے یا نہیں۔ ”وہ گویا خود کلابی کر رہی تھیں۔ جو ہر کلابی میں چھ کوارٹرز پر مشتمل بلڈنگ عمر کے والد نے آدھے وقتوں میں تعمیر کروائی تھی جس کا ماہانہ کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ کلثوم کو اخراجات پورے کرنے میں کبھی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

”بہت شوق تھا عمر کی شادی کرنے کا مجھے۔ حالانکہ سب ہی نے عمر کی شادی کا سن کر حتی المقدور مشوروں سے نوازا تھا کہ عمر ابھی نا سچھ ہے۔ شادی کی عمر کہاں ہے۔ ذمہ داریاں کیسے اٹھائے گا اور بھی نجائے کیا کیا۔ مگر میں نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرے۔“ وہ واوی کو دھیمی آواز میں بتا رہی تھیں۔

”کلثوم! عمر کا بھی سنا تھا کہ شادی کے لیے مان نہیں رہا۔“ واوی کی آواز کلثوم کی آواز سے بھی دھیمی تھی۔ عشوہ کے استور کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔

”خالہ جی! اب فکر مت کریں۔ صرف اسی بات پر ضد کر رہا تھا کہ اس کی تعلیم نامکمل ہے۔ کیمر پر بنانا ہے۔ بہت سا پڑھنا ہے۔ اس کے علاوہ تو کوئی اعتراض نہیں اسے۔“ کلثوم نے واوی کی فکر اور پریشانی کو کم کرنا چاہا۔

”آپ جی کو غم بالکل نہ لگائیں۔ ایسی موبہنی صورت ہے عشوہ کی۔ دیکھ کر سارا غصہ و صدمہ بھول جائے گا۔“ کلثوم نے نرمی سے واوی کے دونوں ہاتھ دبائے۔ واوی کے خدشات شاید کم ہو گئے تھے تاہم

عشوہ کے دل میں پکڑو حکم شروع ہو گئی۔ ”ہائے! انہیں تو بہت غصہ آتا ہے۔ مجھے ڈانٹیں گے۔“ وہ تنکے کے نیچے رکھی عمر کی تصویر کو پھر سے بغور دیکھنے لگی تھی۔ یہ تصویر کلثوم اسے دے کر گئی تھیں۔ ”تصویر میں تو بہت اکھڑا کھڑے لگتے ہیں۔“ اس نے خوف زدہ ہو کر سوچا۔ یہ تصویر ایک لالبا لال سے کالج بوائے کی تصویر تھی تاہم تصویر کے برعکس وہ خاصا ذمہ دار بھی تھا۔ چھوٹی عمر سے خجیدگی اور تھائی ساسھی بن گئی تھی۔ ہاں! وہ بے حد غصیلا تھا۔ اس کو بہت غصہ آتا تھا اور یہ اس کی شخصیت میں واضح کی تھی۔ شاید والدین بہن بھائی نہ ہونے کی وجہ سے یا پھر کلثوم اس کی ہرجائز ناجائز زبان لیا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ بے حد ضدی ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خود پسند بھی۔ اپنی ”میں“ سے لگنا اسے گوارا نہیں تھا۔ اور اسی ”میں“ نے اسے پیشہ عشوہ سے ایک فاصلے پر رکھا تھا۔ اول روز سے قائم اس فاصلے کو پندرہ سالوں کی رفاقت بھی پات نہیں سکی تھی۔

حالانکہ شادی کے روز پہلی مرتبہ اسے دیکھ کر وہ ٹھنک کر رہ گیا تھا۔ سرخ عروسی لباس میں سنی سنوری سی عشوہ نے دھڑکنوں میں تپتا ملائم چار کھاتا۔ تنکے نفوش رکھنے والے قدرے اکھڑا کھڑے عمر فاروق کے چپکے چپکے عشق میں مبتلا عشوہ کو اسے رو رو دیکھنے کا تجربہ خاصا مشکل ترین لگ رہا تھا۔

”بچی سے نرمی سے بات کرنا اور یہ پکڑو۔“ انہوں نے ایک درمیانے سائز کی ٹمپلی ڈبیا زبردستی اس کے ہاتھ میں تھامی۔

”یہ کیا ہے؟“ عمر نے برا سامنے بنا کر پوچھا۔ ”عشوہ کے لیے چپن ہے۔“ چچی امی نے دلار سے کہا۔

”تو خود ہی مہارانی صاحبہ کو دے دیجئے گا۔“ اس نے صاف جھنڈی دکھائی۔

”لنگے! لہن کو یہ تحفہ تم ہی کو دینا ہے۔“ چچی امی کو ایسے نازک وقت میں جی بھر کے ہنسی آگئی۔

”میں کیوں دوں۔ خواہ مخواہ سر جڑھ جائے گی۔“

دوستوں کی پر بھائی بیٹیاں بھی یاد آگئی تھیں اور وہ ان کی جلن اور حسد کو مجھے بغیر سب کچھ ذہن نشین کر کے آیا تھا۔ خصوصاً اس کا قریبی دوست اور کلاس فیلو دانش تو مل بھن کر کباب ہو گیا تھا۔

”ہماری ماؤں کو تو ہمارا احساس تک نہیں۔ ورنہ ہم بھی ایک حد درجہ کی شوہر ہوتے۔ تم خوش نصیب ہو۔ کل کو تمہارے جتنے ہی تمہارے بیٹے ہوں گے۔ بڑے بھائی لگو گے ان کے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی خالد کی طرح۔“ وہ سچ کباب بنا جا رہا تھا۔ پہلی مرتبہ عمر بھی کچھ اتر آیا۔ وہ جو سمجھ رہا تھا کہ اس کے دوست خوب ہی اس کا مذاق اڑائیں گے ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ الٹا وہ حسد و رشک سے مغلوب ہو کر رہ گئے تھے۔ عمر کو اپنی یہ اہمیت خاصی بھائی تھی۔ اس کی انا اور ”میں“ کی بھی بہت تسکین ہوتی۔

”دیکھو! پیوی کے غلام مت بن جانا۔“ دانش نے اس کے کان بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اوپر چچی امی نجائے کیا کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”جھل سے بات کرنا بچی سے۔“

”پھر بچی! وہ بھنا اٹھا۔“

”بچی ہی تو ہے۔“ چچی امی بھی ناراض سی ہو گئیں۔ ”اب جاؤ بھی۔“ انہوں نے زبردستی اسے کمرے میں دھکیلا۔ جب وہ چلا گیا تو وہ سوپنے لگی تھیں۔ ”خود بھی تو بچہ ہے۔ عمر خیر! اس کی عمر میں بھائی صاحب (عمر کے والد) ایک بچے کے باپ بن گئے تھے۔ منجھل جائے گا آہستہ آہستہ۔“ وہ اسی بات پر مسرور تھیں کہ انہوں نے اپنے سارے ارمان جی بھر کے پورے کیے ہیں۔ جب سے انہیں کینسر تشخیص ہوا تھا۔ تب سے وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ ہر وقت دھڑکا سا لگتا رہتا تھا۔

اس گھر کے لیے انہیں عشوہ جیسی نرم، حلیم اور ہر سانچے میں ڈھل جانے والی لڑکی چاہیے تھی اور انہیں یقین تھا کہ عشوہ ان کے بعد نہ صرف اس گھر کو بلکہ عمر اور عروسہ کو بھی سنبھال لے گی کیونکہ وہ جو ہر

شناس تھیں۔ اور انہوں نے سیپ میں ہند ”مموئی“ کو پرکھ لیا تھا۔

”ہمت شوق تھا تمہیں شادی کرنے کا۔“ ان الفاظ کو سن کر عشوہ دھک سے رہ گئی۔ وہ اس کے سامنے ہی تو بیٹھا تھا شوق نظروں سے دیکھتا ہوا۔ عشوہ کو ایک تسلی تو ہو چکی تھی یعنی کہ وہ یا کو بھائی تھی۔ کیا یہ اس کے جیسی قناعت پسند لڑکی کے لیے کم تھا؟

”جی۔۔۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے گویا جڑ کر رہ گئے تھے۔“

”نہ تو میں بھاگا جا رہا تھا اور نہ تم۔ پھر بچانے کیوں چچی امی نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اس نے منہ کے زاویے بگاڑ کر کہا۔“

”دو چار سال بعد کر لیتیں تو کیا حرج تھا۔ میں بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا۔“ عمر کا تاسف کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا۔ اور عشوہ نے بے حد خوف کے عالم میں بے ساختہ جھک کر عمر کے پیروں کو دیکھا تھا جو کہ بیڈ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ عمر اس کی نظروں کے تعاقب میں خود بھی ذرا سا جھک گیا۔

”یہ پیر سلامت ہیں۔ ان کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ گویا سمجھ گیا تھا۔

”تو پھر؟“ اس کی آنکھوں میں واضح سوال تھا۔

”میری اسٹریز اور جاب کی بات کر رہا ہوں۔ خیر! چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ لو تمہارا گفت۔“ ایک دُنيا اچھاتی ہوئی اس کی گود میں آگری تھی۔

”ایسے خفہ دیا جاتا ہے۔“ اس کی نم آنکھوں نے سوال کیا۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ اب نکالو جلدی سے۔“ وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔

”کیا؟“ اس کے لب بے ساختہ وا ہوئے۔

”میرا گفت۔“

”مگر میں تو نہیں لاتی۔“ وہ گھبراہٹ سے کہتی تھی۔

”کیوں؟“ عمر کو غصہ آگیا۔ ”تمہیں کسی نے

نہیں دیا؟“

”نہیں۔“ وہ اس کے طعنے سے خوف زدہ ہو گئی۔

”تو پھر چچی امی کو بھی یہ چین نہیں دینی چاہیے تھی۔ اور ہر واپس دو۔“ عمر نے جھپٹنے کے انداز میں دُنيا کو پکڑا۔

”کیا کرنے لگے ہیں۔۔۔؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ وہ دُنيا کھول کر ڈیرائن دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس نے چین کلاک کھول کر اپنے گلے میں پہن لی۔

”مجھے سوٹ کر رہی ہے؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اس نے ٹلی میں سر ہلایا۔

”اچھا۔“ عمر نے نظریہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”جیو لری عورتوں کے لیے ہوتی ہے۔“ بچانے کیسے عشوہ کے لبوں سے پھسل گیا۔

”اتنا کچھ تولدار کھا ہے ابھی بھی بس نہیں ہے۔“ عمر نے تاسف سے کہا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ قدرے منہ پھٹ۔

”نہیں۔۔۔ میں اس لیے نہیں کہہ رہی۔“

”مجھے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ عمر کو اسے ڈرانا اور خوف زدہ دیکھنا خوب بھلا لگ رہا تھا اور وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہا تھا جو عشوہ کو خوف زدہ کر تیں۔

بلند آواز میں بول کر اسے تنک کرنا، دہلانا عمر کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ دھیرے دھیرے بے عادت پختہ ہوئی چلی گئی۔ عشوہ کی بوکھلاہٹیں اسے غضب ناک کر دیتی تھیں۔ ہمہ وقت اس کی پیشانی پر سلو میں رہنے لگی تھیں۔

چچی امی نے اپنی تمام تر نفاست عمر میں کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ ویسے بھی وہ تنہا اتنے سال تک چچی امی کی محبتیں سمیٹتا رہا تھا۔ پہلے عروسہ اور پھر عشوہ نے اس محبت کو تقسیم کیا تو عمر کچھ اور اکھڑ گیا۔ چچی امی اسے گھر لاکر کچھ بے فکر ہو گئی تھیں۔ زیادہ تر عروسہ کو سجانے سنوارنے میں لگی رہتی تھیں۔ وہ بیمار تھیں۔ مگر عشوہ نے دیکھا تھا جب تک وہ زندہ رہیں ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہیں۔ خود کو بیمار سمجھ کر بستر پر بھی

لیٹ کر انہوں نے خواہ مخواہ نہ خود کو پریشان کیا، نہ دوسروں کو۔ چچی امی اس کے لیے بہترین ساس اور رہنما ثابت ہوئی تھیں۔ جو محبت اور توجہ انہوں نے عمر کو والدین کی وفات کے بعد دی تھی اسی محبت سے انہوں نے عشوہ کو بھی نوازا تھا۔

گھر میں مختصر سے افراد تھے۔ چچی امی، عمر اور عروسہ۔

عمر صبح کالج روانہ ہو جاتا تھا۔ عروسہ یا تو سوتی تھی یا پھر کھیتی کودتی۔ چچی امی عروسہ کو اپنے نبھاپے کی اولاد سمجھتی تھیں۔ اکثر عشوہ کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتیں۔ چونکہ عمر کی والدہ اور چچی دونوں سگی بہنیں تھیں اور دونوں میں بلا کا اتفاق تھا۔ اسی لیے چچی امی اور اس کی امی دونوں نے ایک گھر میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ گھر عمر کے والد نے تعمیر کروایا تھا۔ تب ان کے حالات بہت اچھے ہو کر تے تھے۔

عمر کو تعلیم سے دلچسپی تھی۔ اور اسے پڑھنا دیکھ کر عشوہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتی تھی۔ خود وہ بھی بہت سا پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر وقت نے کچھ اور انصاف پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

شادی کے دسویں مہینے عجمہ اس کی گود میں آگئی۔ ابھی عمر کو سمجھنا اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ عمر کو جاننے کی کوشش ہی کی تھی جب عشوہ کی مصروفیت کا دائرہ کچھ پھیل گیا۔ چھوٹی سی بچی گھر کی ذمہ داری چچی امی کی بنیادی۔ عروسہ کی الگ سے دیکھ بھال اور پھر عمر کے سدا کے نچرے، دس دس منٹ بعد، جوس، اسکوائش اور الم علم کی فرمائش۔ پڑھنے کے دوران اسے کچھ نہ کچھ چاہیے ہوتا تھا۔

عروسہ کی اسکولنگ بھی عشوہ کے لیے بڑا امتحان تھی۔ وہ ایک ضدی اور خرمیلی بچی تھی۔ بالکل عمر کی طرح۔ بچ کے وقت عمر اور عروسہ اسے پھر کی طرح گھما ڈالتے تھے۔ اور سے عجمہ بھی اگر کبھی وقت سے پہلے اٹھ جاتی تو عشوہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ حالانکہ عجمہ بہت صابر بچی تھی۔ عمر چیخ کر اسے بوکھلا کر رکھ دیتا تھا۔

”آج میرا میسٹ ہے۔ مجھے وقت پر کالج پہنچنا ہے۔ تم دھنک کا ناشتا بھی بنا کر نہیں دے سکتیں۔ میں نے اس لیے تو شادی نہیں کی تھی۔“ ہر بات کی تان شادی پر آکر ہی ٹوٹی تھی۔ اگر کپڑے ٹھیک سے پرئیں نہ ہو پاتے یا پھر جوتوں کو پالش کرتے ہوئے چمک نہ آتی تب بھی عمر کے یہی بیان جاری ہوتے تھے اور اب تک اس کی یہ عادتیں اتنی پختہ ہو چکی تھیں کہ چاہ کر بھی کچھ تبدیلی آنا ناممکن تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ عمو ریت اور امین نے عشوہ کی مصروفیات کچھ اور بڑھا دی تھیں۔ عمر یونیورسٹی سے فراغت کے بعد خوش قسمتی سے گورنمنٹ جاب سے منسلک ہو گیا تھا۔

عمر کی بے رخی بے اعتنائی کا وہ ہی حال تھا۔ اور جو وقت کے ساتھ ساتھ گریڈ بھی بڑھ رہے تھے تب ہی تو اس کی گردن میں مستقل سریا فٹ ہو گیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے سرکنا چارہ تھا۔ بچوں کی مصروفیات اور گھریار کے جھمیوں میں کم ماہ و سال کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔

ان چندہ سالوں میں عمر کے تلخ کڑوے، تکیے ہر طرح کے روئے اس کے دل پر کیسے کیسے نشان چھوڑ گئے تھے۔ عمر کو بھی ایسی فرصت کے لمحات میسر نہیں آئے تھے کہ وہ اس کے دل پر پڑے آبلوں کی میچائی کر لیتا۔

اب تو خیر سے عمر کو وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ دو گھڑی ٹھہر کر وہ اس کی بات ہی سن لیتا۔ اس کے سر پر ہمیشہ عجالت سوار رہتی تھی۔ عشوہ کو کوئی بھی گھر کا مسئلہ یا بچوں کی کوئی پرانیلم ڈسکس کرنا ہونی پاشیر کرنا ہوتی تو وہ بچانے لگتی دھم تہمد باندھنے کی کوشش کرتی تھی۔

جوں ہی وہ اصل مسئلے کی طرف آتی، عمر کو کوئی نہ کوئی ضروری کام یاد آ جاتا تھا۔ اور وہ بغیر اس کی بات سننے بھاگ نکلتا۔ عشوہ بے چاری اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی تھی اور یہ تو ہمیشہ سے ہوتا تھا۔ کون سا نئی اور انوکھی بات تھی۔ ہمیشہ عمر کو اپنی کہنے اور اپنی منوانے کی عادت تھی۔ مقابل کی بات کو تو بھی اس نے سننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

دل سے بڑے بوجھ کو مٹانے کے لیے وہ بہت سرسری انداز میں بھائی بیگم سے بہت سی باتیں کہہ سن لیتی مگر پھر بھی دل میں بیش ایک حسرت پھانس بی چھین دیتی رہی تھی عام عورتوں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا شوہر اسے بہت نہ سہی تھوڑی سی اہمیت تو دے مگر اہمیت تو وہاں جنم لیتی ہے جہاں دل میں محبت کی کچھ گنجائش نکلتی ہو۔

ان چندہ سالوں میں بابر عشوہ کو احساس ہوا تھا کہ عمر کے دل میں وہ رانی برابر جگہ نہیں بنا سکی یا پکی بات تو صرف بوند برابر تھی۔ دل تو صرف ایک نظر التفات کا طلب گار تھا۔ چند ایک شیریں بولوں کا خواہش مند تھا۔ وہ تو جھوٹ موٹ بھی اوپر کی دل کے ساتھ کسی نازک احساس دل کا احساس کرنے کا روا دار نہ تھا۔ بقول عمر کے منافقت تو اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ بھلا اسے عشوہ کا دل رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اور وہ جوان چندہ سالوں میں عمر کے پیچھے بھاگ بھاگ کر بلکان ہو رہی تھی اپنے لیے دو گھڑی چند لمحے اور کچھ ساعتیں مانگ رہی تھی۔ مگر ہوا کیا؟ بارہ سال بعد اس کے پھر سے پرگنٹ ہونے کی خبر نے عمر کو نہ صرف ٹھکانا تھا بلکہ حیدر جہ بولکھا بھی دیا۔ ایمن خیر سے بارہ سال کی ہو رہی تھی اور عشوہ تو دل میں بیٹھنے خواہش پر بھی حسرت کے آنسو ہما کے صابر ہو چکی تھی جب اللہ نے اس کے مرجھانے اور بجھے بھجھل کو پھر سے پر امید کر دیا۔ اور وہ شکرانے پڑھنے نیاز بانٹنے قرآن خوانی کے بعد سیرہ شکر ادا کرتے نہ تھک رہی تھی جب عمر کے پھر لیے فیصلے نے عشوہ کا نازک دل کرجی کر جی کر دیا۔ وہ نہ صرف سخت بنایا ہوا تھا بلکہ کچھ بولکھا بھی رہا تھا۔ اگر دکھا جائے تو جس عمر میں وہ چوٹی مرتبہ باپ بن رہا تھا اس عمر میں تو آج کل لڑکوں کے سر پر شخص سہرا سجانے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ بیس، تینتیس سال کی عمر میں بہترین جاب کے ساتھ وہ ایک کامیاب زندگی گزار رہا تھا۔ خوب صورت نازک اندام کی بیوی تین ذہین اور

بیاری بیٹیاں گھر میں ہر طرح کا سکھ خوش حالی اور اس کے باوجود عمر جیسا نا شکر انسان ماضی میں اپنی بچی کے لیے گئے اس فیصلے پر پچھتا رہا تھا۔ ویسے بھی بھائی چاہ اور شوخ کے جو چیزیں میرا جانی ہے۔ اس کی اہمیت اور حیثیت پانے والے کی نظر میں زہر بھر نہیں رہتی تھی۔ یہ سب کیا ہے عشوہ! وہ اس کی رپورٹیں دیکھ کر چیخ اٹھا تھا اور اسے ایسی نظروں سے گھور رہا تھا گویا اس سارے معاملے میں وہ اکیلی تصور وار ہے۔

”کیا ہے؟“ عشوہ کا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ بے مسرور تھی۔ اسے گویا یقین تھا کہ دل میں دبی رہی دل کی خواہش اس دفعہ تو ضرور پوری ہو جائے گی۔ وہ اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہوتی تھی۔

”ختم کروادو اس سلسلے کو۔ تمنا نہ اٹھانا ہے کیا؟“ اور چار سال بعد عمیمہ کو اگلے گھر بھجوانے کی تیاری پکڑو۔ اب اس عمر میں یہ سب نڈب دیتا ہے؟“

اس کا لہجہ انتہائی کڑوا تھا۔ اور وہ محض اس سلسلے سے چھٹکارا پانے کے لیے جواز ڈھونڈ ڈھونڈ کے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ خود کو تین بیٹیوں کا باپ بھی قحطا نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ اس بات پر اسے فخر بھی تھا اور کتنا تو وہ ٹھیک ہی تھا۔ اگر کبھی بچیوں کے اسکل چلا جاتا تو عمیمہ کی فرزند تو کیا نیچرز اور پریل تک ٹھک کر پوچھتی تھیں کہ کیا آپ عمیمہ کے بھائی ہیں؟ اور کچھ ایسا ہی خیال پر پریل صاحبہ کا عشوہ کے بارے میں بھی تھا۔ مگر عشوہ کی تعریف سننا تو عمر کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ یوں سن کر انجان ظاہر کرنے لگتا تھا گویا کسی اجنبی کے بارے میں بات کی جا رہی ہے۔ عشوہ تو کیا اب تو بہت حساس سی عمیمہ بھی باپ کے رویے پر چونکنے لگی تھی۔

”عمر! عشوہ گویا دھک سے رہ گئی۔“ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ صد کے کی شدت سے اس کی آواز پھٹ سی کی۔

”کانوں میں روٹی ٹھونسی ہوئی ہے؟ جو کہہ دیا ہے؟“ اچھی طرح سے سمجھ لو۔“ وہ سخت ٹھٹھلا رہا تھا۔ عشوہ پھر بھی بے یقین کھڑی تھی۔

”مگر کیوں؟“ عشوہ کے بھل بھل آنسو گرنے لگے۔ ”کتنے ظالم ہیں آپ عمر! کوئی اپنی اولاد کے بارے میں اس طرح بھی سوچتا ہے؟“

”یہ رونا دھونا بند کرو۔ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ آنسوؤں سے کس قدر چڑ ہے۔“ عمر نے ناگوار سی سے سول سول کرتی عشوہ کو ٹوکا۔ اسے آفس جانے کی جلدی تھی ورنہ وہ عشوہ کے چودہ طبق روشن کر دیتا۔

”آپ بھی اچھی طرح سے سن لیں۔ میں ہرگز بھی یہ بد عمل نہیں کروں گی۔“ وہ بیڈروم کی چیزیں ٹھکانے لگا رہی تھی۔ عمر آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ صرف ٹائی کی ناٹ لگانا تھی اور یہ کہ لگانا عمر کو آتا تھا نہ عشوہ کو۔ عشوہ کو تو وہ اتنا بولکھا دیتا کہ وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔

”بد عمل؟“ عمر الماری میں سے شرٹ کے ساتھ بیچ کرٹی ٹائی نکالتے ہوئے چونکا۔ ”یہ برا عمل ہے؟“ اور جو تم ملک کی آبادی بڑھانے کے پلان بنا رہی ہو۔ محکمہ منصوبہ بندی والوں کے لیکچر کی طرف تم بھی کبھی دھیان دے لیا کرو۔“ اس کا انداز صاف جھارٹے والا تھا۔

”ہونہ! اور جو ستورہ اٹھارہ کروڑ تک کی اس ملک کی آبادی ہے۔ وہ میں نے ہی تو بڑھائی ہے۔“ وہ سلگ اٹھی۔

”تمہارے جیسی جاہل عورتوں کی بے عقلی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ آج پاکستان کس قدر خوش حال ہوگا۔“ اسے کوئی بھی ٹائی بند نہیں آ رہی تھی۔ بیڈ پر اس نے ہر رنگ کی ٹائی کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ اب اس ڈھیر کو سمیٹنا تو عشوہ کو ہی تھا۔ اگر وہ عمر کو زرا سا بھی ٹوک دیتی تو وہ پوری الماری ٹپٹ کر کے ہی آفس سدھارتا۔ عشوہ کا سمجھنا سمجھانا مشورہ دینا تو عمر کو زرا بھی نہیں بھاتا تھا۔ وہ اسے کم فہم اور جاہل سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ ہی عورت دانش مند، فرومند اور فہم و فراست والی تھی جس کے پاس ڈھیر ساری تعلیمی اسناد جمع تھیں۔ علاوہ ازیں بھائی بیگم سے لے کر عشوہ تک سب عورتوں کو اس نے ایک ہی لسٹ میں شمار کر رکھا تھا۔

”غیر کسی معمار کے پاکستان کیسے خوش حال ہو سکتا ہے؟“ اور آپ جیسے معمار بھی جاہل عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ بہت دور جانے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ گھر میں مثال موجود ہے۔ آپ خود کو اور فائق کو ہی دیکھ لیجئے۔“ عشوہ کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر پھر بھی عمر گویا بل کھا کر رہ گیا۔

”بہت جلنے لگی ہے تمہاری زبان۔ یہ نہ ہو، کسی دن کاٹ کر پھیل پر رکھ دوں۔ بھابھی بیگم کی کپنی میں بیٹھنا کم کرو۔ ساری پٹیاں ان ہی کی سکھائی پڑھائی ہیں۔“ عشوہ کے منہ سے کوئی بھی سمجھ داری کی بات اگر پھسل ہی جاتی تو عمر سے برداشت کماں ہوتی تھی۔

وہ ایک ٹائی پسند کر چکا تھا اور اب عروسہ کو آواز اس دے رہا تھا۔ چند سال پہلے عمر کی ٹائی کی ناٹ لگانے کی ذمہ داری عروسہ کے سر آن پڑی تھی۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ عروسہ جیسے تیسے بھی ناٹ لگا دیتی، عمر نے کبھی اعتراض نہیں کیا تھا، جبکہ عشوہ بے چاری کی تو وہ درگت بنا کر رکھ دیتا تھا۔

”جس عورت کو ٹائی کی گرہ تک لگانا نہیں آتی۔ اس عورت کا بھلا فائدہ ہی کیا؟“ وہ بھنا کر ٹائی کے دفتر چلا جاتا تھا۔ عمر کے روز روز کے جھگڑے سے تنگ آکر اس دن عروسہ نے ٹائی اٹھائی اور ان دونوں کے قریب آگئی اور پھر یہ اس کا معمول ہی بن گیا۔

”بیٹے، عشوہ جی! آپ کو تو خواجواہ بولکھا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ بھلا کون سا مشکل کام ہے۔“ اس نے جھٹ پٹ ٹائی کی ناٹ اس قدر نفاست سے لگائی کہ عمر ٹوکیا عشوہ تک حیران رہ گئی۔

”یہ جینٹیشن ہر لحاظ سے آگے ہے۔“ اس نے سر ہلا کر گویا تسلیم کر لیا۔ عمر عروسہ کے اس کارنامے پر دل کھول کر داد دے جا رہا تھا۔

”خالی خولی تعریف سے کام نہیں چلے گا۔ باتوں سے صرف عشوہ جی بہل سکتی ہیں میں ہرگز نہیں۔“ نکالے ہمارا انعام۔“ وہ بڑے شاہانہ انداز میں کہہ رہی تھی عشوہ کو ہنسی آگئی۔

”صبح صبح فقیروں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔ ایک

دفعہ بھائی بیلم کو لیتے سنا تھا۔ یہ لڑا پورے پچاس پیسے۔ ”عمر نے والٹ کے بجائے دروازے فالتو پڑے چند سکے نکال کر عروسہ کی ہتھیلی پر رکھنا چاہا۔ ”عمر بھائی! عروسہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ ”میں امین یا عمو ریہ نہیں ہوں۔“

”اچھا۔“ عمر سوچ میں گم ہوا۔ ”پھر کتنے چاہئیں؟“

”پورے نو تھوڑے۔“ عروسہ نے گلابی ہتھیلی پھیلا کر ان بھرے لہجے میں کہا۔

”نو تھوڑے؟“ اب بدکنے کی باری عمر کی تھی۔ ”عروسہ بی بی! ایک ذرا سا کام کیا ہے اور اتنی اجرت؟“

”یہ اتنا سا کام اپنی بیگم سے کروالیتا تھا۔“ عروسہ قل قل ہنسنے لگی۔

”اچھا مذاق ہے۔“ عمر نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”نکال لے بھی۔“ عمر پھر سے والٹ چیک کرنے لگا۔

”یہ نکال کر عروسہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے خیال آیا تو پوچھنے لگا۔

”بائی داوے! ابھی پچھلے ہفتے آپ نے پورے تین ہزار لے تھے وہ کہاں گئے؟“

”عمر بھائی! ایک تو آپ کو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ بتایا تو تھا میری فرینڈ کی برتھ ڈے تھی۔ گفت دیتا تھا اسے۔“

وہ نیلے نوٹ مٹھی میں دبا کر باہر بھاگ گئی۔ ابھی اسے کالج کے لیے تیار ہونا تھا۔ ادھر عمر بھی لا پرواہی سے لیپ ٹاپ کا بیگ اٹھائے باہر نکل آیا۔



”ہیلو سوئی!“ عمر نے لیپ ٹاپ کا بیگ درمیانی میز پر رکھا اور خود قدرے جھک کر چٹا چٹا چٹا امین کے کئی بوسے لینے کے بعد سیدھا ہو گیا۔ آج بوسے دنوں بعد اسے سب سے لاڈلی اور چھوٹی بیٹی کا خیال آیا تھا۔ عمر کے ”لاڈ“ بھرے انداز کو دیکھ کر بھی امین کے وجود میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ”امین بیٹا! کیا اسکول سے چھٹی مارنے کا ارادہ

ہے؟“ وہ امین کی ہر نبض سے واقف تھا۔ اگر اسکول نہ جانے کے لیے بھی وہ ہمارے بنائیتی تھی۔ پیٹ میں درد اٹھنے لگا اور بھی پورا جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ ”نہیں۔“ بالآخر امین نے سر کو دائیں یا بائیں ہلایا۔

”تو پھر؟“ عمر استفہامیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کے سرخ سرخ گالوں کے ڈھیل بھی خاموش تھے۔ آنکھیں بھی خفا خفا سی تھیں۔ عمر کے دل کو

ہونے لگا۔ ”بیٹا! ہماری آپ سے کئی ہے۔“ امین نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”شہزادی عالیہ! کیا وجہ جان سکتا ہوں؟“ اس نے کہا۔ ”قطعا مختلف لگ رہا تھا۔ اپنی اکثر فطرت کے باوجود برعکس۔ بیٹیوں میں سے بھی صرف امین کو ایسی اور محبت سے نوازا جاتا تھا۔ بچن کی کھڑکی میں سے منظر صاف دکھائی دے رہا تھا اور نہ جانے کیوں ہر روز

ہی یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ خوشی کے ساتھ دل کچھ کچھ بھی آتا تھا۔ آنکھیں نم ہو جاتیں اور ماضی کی بھلیوں میں وہ کسی ایک بھی خوشگوار منظر کی تلاش میں سرگرداں تھک سی جاتی تھی مگر وہ نہ کی اس کی ہنوز سیٹ رہتی۔ کوئی رنگہ ست چاہنے کے باوجود

دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ”آپ جانتے ہیں بیٹا! ہم کیوں ناراض ہیں۔“ امین نے بسور کر سامنے رکھا دودھ کا گلاس ہاتھ سے قدرے دور رکھ کر دیا۔

”اچھا۔“ عمر کو سوچنا ہی پڑا۔ مگر یہ کیا؟ امین کی ناراضی کی کوئی بھی وجہ اس کی یادداشت میں محفوظ نہیں تھی۔ ویسے بھی امین اور عروسہ دونوں کو روکنے کا بلکہ گھڑی گھڑی روکنے کا مرض لاحق تھا۔ یہ اور بات تھی کہ امین کسی نہ کسی وجہ سے اور عروسہ بغیر کسی وجہ کے بھی کئی کئی گھنٹے روکنے کا شغل فرماتی تھی۔ پھر عمر ان کو مٹاتا تھا۔

”بیٹا! آپ ہماری برتھ ڈے سیلیبیوٹ نہیں

کر رہے۔ آپ ہماری برتھ ڈے سیلیبیوٹ کریں۔“ امین نے کہا تو عروسہ کے ساتھ ساتھ آلیٹ اور پراٹھے رگبت سے کھاتی عروسہ بھی چونک گئی۔ ”امین! یہ کیا بے ہودگی ہے۔“ عروسہ نے سنبھل کر امین کو بری طرح سے ٹوٹا۔ ”خاموشی سے دودھ کا گلاس اٹھا کر پیو۔“ میں تم دونوں کے بیچ پاکسر لاتی ہوں۔“

”ہم نے کچھ غلط کہا ہے؟“ امین کی ہنر آنکھیں شفاف پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔ ”آپ نے کبھی ہمارا برتھ ڈے سیلیبیوٹ نہیں کیا۔ ہماری فرینڈز تھیک ہی کہتی ہیں۔“ وہ سول سول کرتے ہوئے بغیر کے بولتی چلی گئی۔

”دیکھا کہتی ہیں تمہاری بے ہودہ فرینڈز؟“ عروسہ جو کچن کی طرف مڑنے لگی تھی ٹیٹ کر واپس آگئی۔ ”میں کہی کہ ہم بیٹی کی جگہ غلطی سے آگے ہیں سو اس لیے۔“

”امین!“ عروسہ کے ضبط کا یہ ناز نہ ہو گیا تھا۔ اس کا اٹھنا ہاتھ دیکھ کر عمر درمیان میں بول پڑا۔

”تم اپنا کام کرو۔ یہ میرا اور امین کا معاملہ ہے۔“ اس نے رکھائی سے عروسہ کی طرف بغیر دیکھے کہا۔

”یہ آپ کا اور امین کا معاملہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ہم سب کا مشترکہ مسئلہ ہے۔“ اس کی بھرائی آواز اس کے جذبات کی شدت کو ظاہر کر رہی تھی۔

عروسہ چاہ کر بھی امین کی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ ایک دفعہ کوشش کی بھی تھی مگر اس وقت عمر غصے میں آ گیا تھا اور عروسہ نے بھی رو کر سارا گھر سر پر اٹھالیا تھا۔ اب بھی وہی ہوا تھا۔ عروسہ نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔ عمر رو بھی رو بھی امین کو بھول کر عروسہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عروسہ! فار گاڈ سبک! یہ کیا بچتا ہے؟ خاموش ہو جاؤ! امین تو بچی ہے کچھ بھی کہہ سکتی ہے، تم نے خواہ مخواہ دل پر لے لیا ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔“

”میں کب منع کر رہی ہوں؟ شوق سے بچی کی خوشی پوری کر دیجئے۔ میرا دل تو ویسے ہی بھرا گیا ہے۔“

عروسہ کے آنسوؤں میں مزید روائی آگئی تھی۔ اب کے عشوہ بھی بوکھلا کر رہ گئی۔

”عروسہ گریا! اب کونسا امین تو بس۔“ عمر اٹھ کر عروسہ کے قریب آ گیا اور گھٹنوں کے بل دواؤ بیٹھ گیا۔ عروسہ کے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اور وہ بہت نرمی بہت پیار سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ”چچی امی کی وفات کا دن ہمارے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے۔ تم دل چھو تا مٹ کر دو۔“

عمر کے سمجھانے بھلانے کا اتنا اثر ہوا تھا کہ عروسہ نے آنسو پونچھ لیے تھے اور اب وہ پھر سے چھوٹے چھوٹے نواں بنا کر کھانے لگی تھی۔ عمر بھی ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ امین بھی عروسہ کو رونا دیکھ کر اپنی ناراضی بھول چکی تھی۔ عمو ریہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی اور اسی خاموشی کے ساتھ ساتھ دوسرا برا اٹھاپلیٹ میں رکھے کھانے میں مصروف تھی۔ اس کے بارے میں سب کی متفقہ رائے تھی کہ وہ کھانے اور سونے کے لیے ہی دنیا میں آئی ہے۔ باقی کے معاملات اس کی بلا سے چاہے کچھ بھی ہو اسے وقت پر کھانا چاہیے ہو تا تھا اور نیند بھی بہت ضروری تھی۔ صبح معنوں میں وہ عمر کی ہو ہو کاپی تھی۔ نین نقوش سے لے کر عادتوں تک بالکل باپ کی طرح بے حس۔

عشوہ نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے اک گہری طویل سانس کھینچی۔ اس کی نظریں اب عمیمہ کے چہرے پر تھیں۔ پھل سا اداس چہرہ۔ آج وہ یونیفارم میں نہیں تھی۔ یقیناً ”اسکول سے چھٹی کارا دہ تھا۔ مگر وہ ناشتا بھی نہیں کر رہی تھی۔ اس کا براٹھا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دودھ کے نیم گرم گلاس پر بالائی کی تہ سی ابھر آئی تھی۔ انداز بھی جوں کا توں پڑا تھا۔ عین اس لمحے جب عشوہ نے اپنی بھوک مٹی محسوس کی تھی بالکل اسی بل اسی لمحے عمیمہ کی بھوک بھی خود بخود ختم ہو چکی تھی اور وہ محض دکھاوے کے لیے بھی ناشتا نہیں کر سکتی تھی۔ عمیمہ کی عادتیں ہی نہیں عمو راج بھی بالکل عشوہ کی طرح تھا۔

عروسہ نے کہا تو ویسے ہی بھرا گیا ہے۔“

عروسہ نے کہا تو ویسے ہی بھرا گیا ہے۔“

عروسہ نے کہا تو ویسے ہی بھرا گیا ہے۔“

ایمن باپ کی انگلی تھام کر کیا ہر نکل گئی تھی۔ عروسہ اور عروسہ بھی نہیں کھن سے ہاتھ پونچھ کر بلند آواز میں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ ڈانگ میز پر صرف عمیمہ تنہا بیٹھی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اس حد تک گم تھی کہ اسے کسی کے اٹھ کر چلے جانے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

”عمیمہ! عشوہ کو بولنا ہی پڑا۔ ارد گرد ناچتی اس خاموشی سے اسے شدید وحشت ہو رہی تھی۔ ”جی ماما! وہ میز پر آڑی ترچھی لیکر سر ہینچ رہی تھی۔ اس کی آواز اس حد تک مدہم تھی کہ عشوہ بمشکل ہی سن پائی۔

”ناشتا پھر سے ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ وہ ابھی ابھی اس کا ناشتا گرم کر کے لائی تھی۔

”دل نہیں چاہ رہا ماما! عمیمہ سخت بے زار تھی۔

”کیوں نہیں چاہ رہا؟“ وہ خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ عمیمہ بھی اپنے سامنے رکھی ٹرے کو اٹھا کر کچن میں آگئی۔ عشوہ کندے برتن سبک میں رکھے دھونے لگی۔ عمیمہ نے صاف اٹھا کر کچن کی سلیب صاف کرنا شروع کر دی۔

”پہلے ناشتا کرو عمیمہ! عشوہ نے برتنوں کو صاف بنانے لگاتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”تپ نے ناشتا کیا ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔ عشوہ نے بے ساختہ نظر چرائی تھی۔ اب وہ اسے اپنی خرابی طبیعت کا بھلا کیا بتانی۔

ایڈا، پرائیڈ اٹھانے کو تو بالکل ٹی نہیں چاہ رہا تھا۔ عمیمہ نے سلیب صاف کر کے چولے بھی رگڑ رگڑ کر ان کی چکناہٹ دور کر دی تھی۔ اب وہ ہاتھ دھونے کے بعد بریڈ کے پیس نکال کر سینٹنے لگی۔ ساتھ تازہ چائے بھی بنا رہی تھی۔ عشوہ نے سمجھا شاید وہ اپنے لیے کچھ الگ سا ناشتا بنانا چاہتی ہے۔ عمیمہ نے بہت اہتمام کے ساتھ سلاکس پر پیئر جام اور شد کی تہ لگائی تھی۔ چائے گک میں ڈالی۔ پھر وہ عشوہ کا گلیلا، ٹھنڈا اٹھا رہا تھا تمام کرسی تک لے آئی۔

”یہاں بیٹھیے اور ناشتا کیجیے۔“ وہ سلاکس۔ اس

کے ہاتھ میں زبردستی تھما کر بولی۔ ”گر دل نہ چاہے ایڈا پرائیڈ اٹھانے کو تو بھی کبھی اپنی پسند کے مطابق کچن میں ترتیب دے لیتے ہیں۔“

”اف۔ سیانی بی!“ عشوہ کھل کر مسکرا دی۔

”ویسے یہ پیئر اور جیم کاکس سچو کافی ٹسٹھی ہے۔“ اس نے بھوک نہ ہونے کے باوجود وہ سلاکس رغبت سے کھالیے تھے اور اب وہ تیسرا سلاکس اٹھا رہی تھی۔

”تم بھی لوٹا۔“ وہ بہت ہی میٹھی نظروں سے اپنی ہمدرد اور حساس طبیعت کی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ ایسے مضبوط ستونوں کے باوجود بھی وہ خود کو کمزور عمارت سمجھتی تھی۔ بھلا کیوں؟ اس قدر خلوص اور محبت کے باوجود بھی دل میں اور محبت کی طلب بھی بھلا کس لیے؟

”میں پرائیڈ اور ایڈا لوں گی۔“ وہ اپنی ٹرے اٹھا لائی۔ بہت دنوں بعد عشوہ نے ایسا مزے دار ناشتا کیا تھا ورنہ تو بچوں کا بچا کچھ اٹھا کر ہی صبر شکر کر لیتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ میں آئندہ آپ کو ناشتا کروانے ہی اسکول جایا کروں گی۔“ عمیمہ نے انانیک خیال ظاہر کیا تھا۔ چائے کے سب لیتی عشوہ مسکرا دی۔

”ماما! آپ کو اپنی ہیلتھ کے لیے ضرور کانٹنمنس ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ تو ہم ہیں۔“ عمیمہ بھی ماں کی فرحت بھری کپٹی کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔ عشوہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”یقیناً“ وہ بھابی بیگم کی مہربانی سے ماں کی موجودہ حالت سے اچھی طرح سے آگاہ ہو چکی تھی۔ تاہم فطری جھجک کے باعث وہ ماں سے کھل کر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ ان دنوں آرام کرے۔ وہ تو عشوہ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ ان دنوں میں وہ گھر رہنا چاہتی ہے، تاکہ ماں کا کھربو امور میں ہاتھ بٹا سکے۔

”ماما! ایک بات کہوں؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے عشوہ سے اجازت لینا چاہی۔

”بولو، ماما! اس میں پونچھنے والی کیا بات ہے۔“ عشوہ ناشتا کر چکنے کے بعد پھر سے صفائی ستھرائی میں مصروف

ہو گئی تھی۔ عمیمہ نے بھی ڈانگ والا کپڑا اٹھایا تھا۔ اب وہ رگڑ رگڑ کر ڈانگ میز صاف کر رہی تھی۔

”ماما! آپ کا خیال نہیں رکھتے۔“ عشوہ گویا دھک سے رہ گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ عمیمہ اپنی سوچ کو نظروں کا پیرا بن بھی پڑنا دے گی۔ بہت دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ عمیمہ کسی الجھن میں تھی اور آج اس الجھن کی وضاحت بھی ہو گئی تھی۔

”تنا خیال تو رکھتے ہیں۔ اور کیسے خیال رکھا جاتا ہے؟“ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عمیمہ کا معصوم ذہن ماں اور باپ کے درمیان موجود اس ان دیکھے فاصلے کو محسوس کرے۔

”ماما! کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ایمن کی منہ سی خوشی سیلیب سے نہ کر کے آپ کچھ غلط کر رہے ہیں؟“ وہ دیر سے دیر سے موضوع کی طرف آہی گئی تھی۔ اس کا انداز بلا کا پوسٹ تھا۔

”شاید ہاں۔“ عشوہ کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔

ایمن کی منہ سی اس خوشی کے لیے ایک دفعہ چند سال پہلے عشوہ نے اٹھا چکا سا اہتمام کیا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ یہ سوچنا ہی اذیت کے ایک سلسلے کو آواز بنا تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایمن کی پیدائش کا دن اور چچی ائی کی برسی کا دن ایک ہی تھا۔ سالگرہ منانا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ مگر جوں جوں ایمن بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس بات کو واضح محسوس کرنے لگی تھی۔

اپنی سیلیبوں کے علاوہ جب گھر میں عروسہ یا پھر عروسہ اور عمیمہ کی برتھ ڈے دھوم دھام سے منائی جاتی تو ایمن کا حساس ہونا بھی غما تھا۔ وہ کئی مرتبہ اس موضوع پر عشوہ سے معصومانہ سی لڑائی بھی کر چکی تھی اور اس کی اسی خوشی کو مد نظر رکھتے ہوئے عشوہ نے قرآن خوانی اور ناز و نیر ویاہٹنے کے بعد چیکے سے ایک بھی منگو الیا۔ چلت اور برائی کے ساتھ آٹس کریم کے علاوہ ایمن کا فیورٹ براد بھی منگو الیا تھا۔ عمر کے آنے سے پہلے ایمن بھی خوشی خوشی تیار ہو گئی۔ مگر ہوا کیا؟ سب سے پہلے تو عروسہ میز پر بچے چھوٹے سے پائوں

ایبل ایک کو دیکھ کر گنگ رہ گئی تھی۔ اور پھر جو اس نے رونا شروع کیا تو اس کے آنسوؤں میں عمو اور عشوہ دونوں ہی بہہ کر رہ گئے۔ ادھر ایمن ہکا بکا کھڑی تھی۔ عمر نے آؤ دیکھا نہ، تاہم اگر ایک زوردار قسم کا پھٹر عشوہ کے منہ پر دے مارا۔

”حق عورت! تمہیں ایک منگواتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ آج بچی ائی کی برسی کا دن ہے۔ دل ویسے ہی صبح سے بو جھل ہے اور تم نے یہ یہ تماشا لگا دیا ہے۔ حالانکہ منع کیا تھا کہ ایمن کا برتھ ڈے نہیں منایا جائے گا۔ تمہیں کم از کم عروسہ کے جذبات کا تو خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ محبت تھی تمہیں چچی ائی سے؟“ صبح سویرے سوگ مناکر وہ گھڑی لوگوں میں دکھلا کر لیا اور شام کو جشن منانے لگ گئی۔ افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری سوچ اور اس گھٹیا پن پر۔“

وہ بری طرح سے داڑ رہا تھا۔ ایمن باپ کے سخت لہجے کو سن کر تھر تھر کانٹنے لگی تھی۔ عمیمہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے اور عروسہ تو ویسے ہی دھواں دھار روئے جا رہی تھی۔

”عمرو! عشوہ تو بچیوں اور عروسہ کے سامنے اس عزت افزائی پر تھا اٹھی۔ آنسوؤں کی پیلخار اور توہین کے احساس نے اس کی آواز کو کپکپا کر رکھ دیا۔ اسی سے اپنے قدموں پر کھڑا رہا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ لرزتی ٹانگوں پر بمشکل اپنے وجود کا بوجھ اٹھائے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے روتے ہوئے۔

بو جھل بیٹوں والی سرخ آنکھوں کو کھولتے ہوئے بمشکل اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ تقریباً سوا گیارہ بجے عروسہ کی غرض سے کمرے میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر عشوہ کچھ حیران ہوئی تھی، مگر اس نے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”مگر تم اس خیال سے رو نمی بیٹھی ہو یا ناراضی کا ڈھونگ کر چاہا ہے کہ میں تمہیں مناؤں گا تو محترمہ! اس خوش فہمی میں جلا مت ہوں۔“ اس نے ہیٹھ والے

مخصوص مغرورانہ انداز میں کہا۔
”مجھے ایسی خوش فہمیاں لاحق نہیں ہوتیں۔“ وہ
سر سے لے کر پیروں تک سلگ اٹھی۔
”یہ برگر اور کوئلہ ڈنک تمہارے لیے ہے، کیونکہ
یہ تمہارے لیے عجمہ نے پک کروایا تھا۔“ عمر نے
صاف جتا بھی دیا تھا۔ اسے واقعی دل رکھنا نہیں آتا
تھا۔ عشوہ کے دل میں پھانس سی چھپی۔

”ظاہر ہے میری بیٹی کو ہی میرا خیال آسکتا ہے۔
بھلا آپ سے یا عروہ سے ایسی امید کی بھی نہیں
جاسکتی۔ عروہ کا اور آپ کا خون جو ایک ہے۔“ بہت
چاہنے کے باوجود وہ ان کے خون میں شامل خود غرضی کو
جتا نہیں پاتی۔

”ناگ تک کر حملے کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا
اپنے گریبان میں جھانکنا! کیا آج کا تمہارا عمل درست
تھا؟“ معا“ وہ اس کی طرف ٹرے کھکاتے ہوئے
قدرے سنجیدگی سے بولا۔

”کوئی گناہ سرزد ہو گیا تھا مجھ سے؟“ وہ گویا پھٹ
پڑی۔ ”بچپوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔“ اسے پھر سے اپنی
توپن کا خیال آیا۔

”نہ جانے کیوں مجھے غصہ آیا تھا۔“ وہ شاید
شرمندہ ہوا تھا، مگر یہ شرمندگی کم از کم عشوہ کو نظر نہیں
آسکتی تھی۔

”تم نے بھی تو ٹھیک نہیں کیا۔ عروہ کا دل دکھا
ہے۔ آج کے روز یک کاٹنا ضروری تھا۔ کل یا پرسوں
تک کامیں خود بھی پلان بنا رہا تھا۔ امین اور اس کی
فریڈز بھی خوش ہو جائیں۔“

”تو آپ مجھ سے کہہ دیتے مگر آپ بھلا کیوں
کتے۔ ناگ پیچی ہو جاتی آپ کی۔ مجھے کچھ بتانا یا مشورہ
کرنا آپ کو بھلا کیسے گوارا ہو سکتا ہے۔“

”ارے! جانے بھی دو، بس کرو، غصہ مت کھاؤ
کھانے کے لیے یہ برگر ہے نا۔“ عمر کا لہجہ کچھ
خوشامدی سا ہو گیا تھا اور عشوہ اچھی طرح سے جانتی
تھی کہ عمر کو اب کس وقت اپنی اناکے گنبد سے باہر
نکلتا ہے اور اپنی سطح سے کس وقت نیچے آتا ہے۔ سو وہ

جذبات کے اس دھارے میں بہہ کر اپنی اہمیت جتنا
کا موقع ہرگز بھی نہیں کھونا چاہتی تھی اور نہ ہی عمر
خوشامدی باتوں اور میٹھی نظروں کے جھانسنے میں
اپنی لمحہ بھرنے والی اہمیت کو ضائع کرنے کا تصور کر سکتی
تھی۔

”کھاؤ ناچار! وہ زبردستی پلیٹ اس کے ہاتھ میں
رہا تھا۔“ امین کا برتھ ڈے اگلے سال منائیں گے

ان شاء اللہ۔“ وہ اسے پھر سے باتوں کے بھلاوے میں
الچھانا چاہتا تھا۔ اور امین کو تو اس نے یقیناً ”خوش کر
دی دیا تھا۔ میوزیکل یا کس، کلرز اور نئے ٹور بیکس
کر دیے تھے۔ اوپر سے باہر کا ایک پلٹر بھی لگایا تھا۔
آؤنگ کا لونڈ بھی پورا ہو چکا تھا، سوا سے خانا خویو کی

خیال بھی آہی گیا تھا۔ جسے وہ ہمیشہ والی جلت کے تحت
اور غصے سے مغلوب ہو کر ناراض کر چکا تھا۔ اگرچہ
عشوہ کو منانا اتنا اہم بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے
اسلام آباد جانا تھا۔ پچی ای کی کوئی نصیحت یاد نہیں

تھی، مگر ایک بات اس نے ہمیشہ ذہن میں بٹھا رکھی
تھی کہ سفر یہ جاتے وقت گھروالوں اور اپنے سے
وابستہ لوگوں کی ناراضی دور کر کے — ہنسی خوشی

رخصت ہونا چاہیے، کیا پتا ہے آپ کا آخری سفر یہ ہو۔
”آپ نے مجھ پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟“ عشوہ سخت
مشعل تھی۔

”اسی بات کو بڑھانا چاہتی ہو؟“ وہ دونوں ہاتھ
کے نیچے رکھے بیڈ پر چت لیٹ گیا۔

”یہ اتنی سی بات ہے؟“ عشوہ گویا پھٹ پڑی۔
”جب چاہا بے عزت کر دیا، جب چاہا دھنکا دیا۔ جب
مرضی ہوئی تو پکڑ کر ہسپتال بٹھالیا۔“

”ہسپتال کہاں ہو، دس فٹ دور بیٹھی طٹر کے تیر
پھینک رہی ہو۔“ عمر نے مصنوعی آہ بھری۔
”تو آپ برکون سا اثر ہو رہا ہے؟“

”قریب آؤ گی تو اثر ہو گا نا۔“ اس کا انداز اب بھی
دل جلانے والا مغرورانہ قسم کا تھا۔ عشوہ کا دل بری
طرح سے راکھ ہوا۔

”ہو نہ! کسی کی خاندانی ملازمہ نہیں ہوں۔“ اپنی

توپن پر وہ اس طرح سے کڑھتی رہتی تھی۔
”میری حیثیت کا تم نے خود ہی تعین کر رکھا ہے۔ اگر
میں کچھ کہوں گا تو تمہیں یقیناً برا لگے گا۔“

”بغیر چاہ کے بیوی مل گئی، بغیر خواہش کے اولاد مل
گئی۔ بکا ہوا پھل جھولی میں آگرے تو اس کی قدر
معلوم نہیں ہو سکتی۔“ وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ عمر
ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔



عشوہ کو طبیعت کے بھاری پن نے کچھ چونکا تو دیا
تھا، مگر وہ پھر بھی بے یقین سی تھی۔ وہ مہلوں میں پڑی
تھی۔ بھلا بارہ سال بعد کسی خوش خبری کی امید کی
جاسکتی تھی۔ مگر مہمان رب نے اپنی مہربانی اور فضل کا
سایہ کر دیا تھا۔

”میں صبح جی بری طرح سے متلا رہا تھا۔ بچپوں کو
اسکول بھیج کر وہ بھابی بیگم کی طرف آگئی تھی۔ بھابی
بیگم تو فوراً تیار ہو گئیں، چہرہ ہل اٹھا تھا۔

ڈاکٹر سے تصدیق کروا کر ہی وہ گھر لوٹی تھیں۔
بھابی بیگم کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ عشوہ کو
تخت پر بٹھا کر خود وہ پکن میں گھس گئی تھیں۔ بچپوں

کے گھر آنے کا وقت بھی قریب تھا۔ عموہی اور امین
بھوک کی بہت کچی تھیں اور عروہ تو ان دونوں پر
بھاری تھی۔ بھابی بیگم کی مہربانی سے گھر میں موجود

سبزی تیار ہو گئی تھی۔ آٹا تو عشوہ سویرے ہی گوندھ لیتی
تھی، سو بھابی بیگم نے جھٹ پٹ پھلکے اتار دیے
تھے۔ پودینے کی چٹنی بھی پیس دی۔ البتہ سلاوا عشوہ

نے بنا لیا۔

اس کی طبیعت خاصی بے زار تھی۔ کچن کے کام
سے ہی ابا کی آنے لگتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آگے
چل کر نہ جانے کیسے وہ ساری گھر کر ہستی کو سنبھال

سکے گی۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی، جب بچیاں اور
عروہ بھی آگئی۔ بھابی بیگم نے تو علی الاعلان کہہ دیا
تھا۔

”چاروں لڑکیاں غور سے سن لو! اپنے اپنے کام اب

خود کرنے ہیں تم لوگوں کو۔“
”مگر کیوں؟“ سب سے پہلے عروہ نے حیرانی سے
پوچھا۔ ”عشوہ جی، کہیں جاری ہیں؟“ اس کا حیران
ہونا بھی فطری تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال ہی آیا
تھا کہ شاید عشوہ کہیں جاری ہے۔ اور عشوہ کا کہیں
بھی جانے کا تصور ان سب کے لیے سوان روح تھا۔
عروہ تو ان گنت کاموں کے متعلق سوچ کر ہی کانپ
کانپ گئی۔

”عشوہ کہیں بھی نہیں جاری۔“ بھابی بیگم نے
پھر سے اعلان کیا۔

”تو پھر ہمیں کس بات کی سزا سنائی جا رہی ہے؟“
عروہ نے فنی چہرے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ کام سے اس
کی جان جاتی تھی۔

”خیر سے عشوہ کو اب آرام کی ضرورت ہے۔“
بھابی بیگم کا لہجہ خود بخود دھیمہ ہو گیا۔ وہ عروہ کی
طرف متوجہ تھیں۔ تاہم سر جھکائے کھانا کھاتی

عجمہ کا پورا دھیان ان دونوں کی گفتگو کی طرف تھا۔
عشوہ ان کی باتوں سے بے نیاز نہ مانے کے لیے چل گئی
تھی۔ اسے سخت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہائے! بھابی بیگم! آخریت تو ہے؟“ عروہ عادتاً
دل اٹھی۔

”سب خیریت ہے۔“ بھابی بیگم نے نہال ہو کر
کہا۔

”تو پھر آرام کیوں؟ میرے تو ٹیسٹ ہونے والے
ہیں۔ مجھ سے گھر کے کام تو بالکل نہیں ہوں گے۔“
عروہ خواہ مخواہ روپا سی ہو گئی۔

”ارے لگتی کے دن ہیں۔ خیر سے فراغت کے بعد
اپنی گھر گھر ہستی خود ہی سنبھالے گی۔ کاہے کو مری
جاری ہو۔“ انہیں غصہ آ گیا۔ ویسے بھی ان کا غصہ

خاصا مشہور قسم کا تھا۔
”کیسی فراغت؟ عروہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔“
بھلا کیا ضرورت تھی اس جھجھٹ کی۔ پھر سے رس

رس کا سلسلہ۔ عروہ کو شدید کوفت ہوئی۔ وہ کلس کر
سوچتی رہی۔

”خیر یہ عمیمہ کا بھائی ہونے والا ہے، بس دعا کرنا، اللہ تم سب کو یشامیہ دے۔“ عروسہ کو بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ نہ صرف عشوہ کا ہاتھ بٹائے بلکہ اس کا خیال بھی رکھے۔

”یشامیہ؟“ عروسہ نے مصنوعی چوکنے والے انداز میں کہا۔ ادھر عمیمہ بھی ٹھٹک گئی تھی۔ دل میں اک انوکھا سا احساس جاگا۔
”تو اور کیا؟“ تین بیٹیوں کے بعد ہوگا۔ یشامیہ ہی ہوا۔ ”وہ پرانے خیالوں کی مالک تھیں۔ بیٹیوں کی آمد پر خوش ہونے والی۔“

”نوجی! پھر سے سیلا۔“ اس نے بے زاری سے سوچا اور نیند سے بند ہوئی آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی تھی۔ بھابھی بیگم انسا منہ لے کر رہ گئیں۔ ساری نصیحتیں بے کار تھیں۔ کھانے کے چھوٹے برتن گویا ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ یونیفارم اور کتابیں صوفے اور کارپٹ پر بالترتیب بکھری پڑی تھیں۔ ”یقیناً“ عشوہ کے علاوہ کسی اور نے اس پھیلاوے کو ہرگز نہیں سینٹا تھا مگر ان کی سوجھوں کے برعکس ایک نرم ہاتھ ان کے کندھے سے مس ہوا تھا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ عمیمہ دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”دادی بیگم! میں ہوں نا، اما کا ہاتھ بٹایا کروں گی؟“ آپ ان سے کہیے گا ہم کی فکر نہ کریں۔“
”دادی صدقہ۔“ بھابھی بیگم گویا نمل ہو کر رہ گئیں۔ ”یہی سعادت مند بیٹیاں، دل کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔“ اسی بل عشوہ بھی ناکر آگئی تھی۔ اور اب پھر سے برتن سینٹنے لگی۔ عمیمہ نے ماں کو روک دیا۔
”اما! رہنے دیں میں کرتی ہوں۔“

”نہیں! تم سو جاؤ، صبح کی اٹھی ہوئی ہو، میں برتن دھولتی ہوں۔“ عمیمہ باج بچے عشوہ کے ساتھ ہی اٹھ جاتی تھی۔ بہنوں کے کپڑے وغیرہ ریس کر دیتی۔ جو تباہ نظر نکال کر رکھتی۔ اسکول بیک کو کھول کر چیک کرتی۔ اگر کوئی چیز کم ہوتی تو خود ہی بیک میں لاکڑاؤں دیتی۔ عشوہ کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ عمیمہ اپنی نیند

دن کے وقت ضرور پوری کر لیا کرے۔
”آپ تو ہم سے بھی پہلے اٹھ جاتی ہیں۔ آپ کے لیے بھی دن میں کچھ کھٹے سونا ضروری ہے۔“ وہاں کی بات سنی انہی سنی کر کے پھیلاوا سمیٹنے کے بعد برتن دھونے لگی تھی۔

بھابھی بیگم کے چلے جانے کے بعد عشوہ بھی گیسٹ بند کر کے پکڑ میں آگئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ رات کے کھانے کی تیاری بھی کر لے۔ آج عمریچ کرنے نہیں آیا تھا۔ اب ڈنر تو لازمی اس کا من پسند ہونا چاہیے تھا۔ اور عمریچ پسندیدہ ڈشز بناتے ہوئے اسے دانٹوں بلینڈ آجانا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ عمر کو نہ صرف کھانا پسند آیا تھا بلکہ جناب کاموڈ بھی کافی خوشگوار تھا۔ اور اسی خوشگوار موڈ میں بچپوں سے گپ شب کی جاری تھی۔

”سرو دکشمنز میں ہم کہاں جائیں گے بھابھی! کھانا کھاتے ہوئے اچانک ایمن کو اپنی فرینڈز کے ساتھ ڈسکمیں کیا گیا؟“ آج کل کا سب سے بڑا مسئلہ یاد آگیا تھا۔ ”سو فوراً“ بے قراری سے پوچھنے لگی۔
”جہاں ایمن کے لیے وہیں جائیں گے۔“ عمر کی نہ کسی طور ایمن کا دل رکھ ہی لیتا تھا۔

”ایمن کو چھٹیوں کے یہ تین مہینے چڑیا گھر بھجوا دیں، یہ اپنے فرینڈز کے ساتھ خاصا انجوائے کرے گی۔“ عروسہ نے اس کی ننھی سی ناک دبا کر چھیڑا۔
”ZOO“ میں آپ کے بھی تو فرینڈز رہتے ہیں۔ ”وہ بھی تو ایمن بھی بلا کی حاضر جواب۔
”بہت بولنا آگیا ہے نہیں۔“ عروسہ نے اس کے گال زور سے پیچھے تھپتھپاتے ایمن بلبلا کر رہ گئی۔
”عروسہ گندی ہیں۔“

”ایمن تو بڑی اچھی ہے۔“ عروسہ نے طنز پر کہا۔ ”سوائے ٹھٹکنے کے اور کوئی کام نہیں۔“
”اور عروسہ کو باتیں بنانے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا۔“

ان دونوں کی ہمیشہ والی تکرار شروع ہو گئی تھی۔ جس سے عمر خاصا چڑتا تھا۔ اسی وجہ سے آئے دن عشوہ کی

بختی آتی رہتی تھی کہ ایمن اور عروسہ جو ننھی لڑائے سے باز نہیں آتی تھیں اور سارا قصور عشوہ کی تربیت کے کھاتے میں لکھ دیا جاتا، حالانکہ یہ تو ان کی معصومانہ سی لڑائیاں تھیں۔ جن کا آغاز ہمیشہ عروسہ کی طرف سے ہی ہوتا تھا، مگر عمر سے ڈانٹ کے وقت وہ صاف بچ جلیا کرتی تھی۔

”ایمن صاحبہ! آپ موضوع سے ہٹ رہی ہیں۔“ عروسہ سے بات نہیں بن پائی تھی۔ اپنی کام چوری کے متعلق وہ زیادہ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ”آپ سرو دکشمنز کے بارے میں گفتگو فرما رہی تھیں۔“

”تو اور کیا۔“ وہ پھر لاڈ سے عمر کے ساتھ چپکی۔ ”پاپا! ہم چھٹیاں گزارنے کہاں جائیں گے۔ نہ ہماری نانوں ہیں نہ ناٹائیں، نہ داؤد نہ دادا۔ ماموں ہیں تو اتنی دور ان کے پاس ہم جا نہیں سکتے پھر ہم کہاں جائیں؟ ہماری ساری فرینڈز اپنی آنٹھیز اور نانوں کے گھر جائیں گی۔“

”ہم آپ کو مری لے چلیں گے۔ پورے دن منتھ کے لیے اب خوش؟“ ایسی فیاضی وہ ایمن کے لیے بھی رکھتی دیتا تھا۔
”تھینکس بھابھی! ایمن خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اور اسی پر خوش انداز میں عروسہ سے چپک رہی تھی۔ جب عمیمہ کی ٹھہری ٹھہری سنجیدہ سی آواز سن کر چپکی رہ گئی۔

”اما کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اما کیسے جائیں گی؟“
”عشوہ جی کو کون سا ڈر لگے گا اور پھر بھابھی بیگم اور غوفیہ انٹی (نوری کی امی) ہیں نا، کیوں عمر بھائی؟“
عروسہ کے بھی دل کی مراد گویا بر آگئی تھی۔ سو وہ بھی خوب جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھی اور دل ہی دل میں فرینڈز پر دھاک بٹھانے کے بھی پروگرام بناتے جارہے تھے۔ وہ کافی شوخ طبیعت کی مالک تھی۔ بلے لگے کی شو فین، گھونسنے پھرنے کی دلدادہ۔ عمیمہ کو اچانک ہی عشوہ کی موجودہ حالت کا خیال آیا تھا۔ اسی لیے بچپوں کوئی الحال اس نے ٹال دیا۔

”ہم اگلے سال مری چلیں گے۔ کیوں پاپا! وہ اپنی پلیٹ صاف کر چکی تھی۔ اب نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی، ہٹراس کی ساری توجہ باپ کی طرف تھی۔ عمر نے عمیمہ کی طرف دیکھ کر سر ہلادیا۔
”نہیں! ابھی جانا ہے، اگلا سال بہت دور ہے۔“ ایمن نے بچوں جیسے خدی بن سے کہا۔

”ایمن! خاموشی سے کھانا کھاؤ، ورنہ بہت مار پڑے گی۔“ عشوہ کو بولنا ہی پڑا تھا۔ وہ صاف محسوس کر رہی تھی کہ ایمن کے علاوہ عروسہ کو بھی اگلے سال تک کے پروگرام پر سخت تاؤ آیا تھا۔ اس نے کھانا ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر اٹھ کر چلی بھی گئی۔ جبکہ عروسہ اور عمیمہ برتن سینٹنے لگی تھیں۔ وہ معمول کے کام ختم کر کے کھڑکیاں، دروازے اچھی طرح سے لاک کرنے کے بعد دودھ کا گلاس لے کر اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔



وہ بیڈ روم میں آئی۔ عمر اس کے کام میں مصروف تھا۔ عشوہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد معمول کی تسبیحات پڑھ کے واپس آئی۔ عمر نے اپنا کام سمیٹ لیا تھا اور اب وی دیکھ رہا تھا۔ دودھ کا گلاس بھی خالی ہو چکا تھا۔ سو پہلے وہ خالی گلاس اٹھا کر کچن میں دھو کر رکھ آئی۔ رات کو گندے برتن رکھنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ بہت چھوٹی عمر سے ہی دادی اماں نے اسے کر کے باتیں گرہ میں بندھوا دی تھیں۔ یہاں آکر بھی اس نے اپنا معمول ترک نہیں کیا تھا اور کلثوم کو اس کی یہی عادتیں پسند تھیں۔ کلثوم کو کبھی اسے ٹوکنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ وہ سارا سلیقہ اور قہر اپنی دادی اماں سے وراثت میں لے کر آتی تھی۔ کلثوم جب تک زندہ رہی تھیں، اس سے بیش خوش رہیں۔

”آپ بچپوں کو جھوٹا لارامت لگائے گا۔ ان کی چھٹیاں تو کچھ دنوں تک شروع ہو جائیں گی، مگر ظاہر ہے، میں سفر نہیں کر سکتی فی الحال۔ عید کی چھٹیوں

عشوہ چپ اٹھی۔

☆ ☆ ☆

جوں جوں اس کے دن قریب آرہے تھے عمر کا موڈ بھی بگڑتا جا رہا تھا۔ اس کی طبیعت کی بے زاری نے عمر کو بھی خاصا بے زار اور چڑچڑا کر دیا تھا۔ طبیعت کے بوجھل پن کی وجہ سے عشوہ پر عجیب سی سستی طاری رہتی تھی اور نیند بھی ہر وقت حاوی رہنے لگی تھی۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا تھا، سو عمر کا غصہ کرنا بھی بنتا تھا۔ انہی بوجھل اور اداس دنوں میں بچپن کی چٹھیاں ہو گئی تھیں اور عشوہ کا بوجھ خود بخود نکل گیا تھا۔ عمیمہ اور عموریہ دونوں مل کر صفائی ستھرائی بھی کر لیتی تھیں۔ برتن بھی دھو دیتی تھیں۔ کپڑے اگرچہ عشوہ کو خود دھونے پڑتے تھے۔ تاہم استری عمیمہ کر لیتی۔ حتیٰ کہ بڑی وغیرہ بھی بنا دیتی۔

بھابھی بیگم عمیمہ اور عموریہ کو خاصی ذمہ داری سے کام کرتے دیکھ کر بے حد خوش ہو کر عشوہ سے کہتی تھیں۔ ”دیکھو! اللہ نے بیٹیاں دی ہیں تو آج انہوں نے بوجھ بھی یونایت لیا ہے نا۔“

اس دن عشوہ نے کالے پنے صبح سے بھگو دیے تھے، تاکہ پکانے سے پہلے کچھ نرم ہو جائیں اور خود وہ کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی تھی۔ مگر اس کچھت نیند نے برے وقت میں حملہ کر دیا تھا۔ جب وہ اٹھی تو دھوپ کے دھج رہے تھے۔ عشوہ کے توارے خوف کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ عمر بس آنے ہی والا تھا، بلکہ آچکا تھا۔ لاؤنج میں سے عمر کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور بج میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر اس وقت وہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوانے کی بات کر بھی لیتی تو عمر نے زمین آسمان ایک کر دیتا تھا۔

”سارا دن بستر توڑتی ہو۔ اور کوئی کام نہیں ہوتا“ پھر بھی لڑنے تک تیار نہیں ملتا۔ آئندہ اس سے اٹھ کر نہیں آؤں گا۔“

وہ جانتی تھی۔ اس کا تھوڑی دیر آنکھ لگ جانے والا گناہ کم از کم آج کی تاریخ میں معاف نہیں ہو گا۔

میں بھی جانا ناممکن ہے، پھر کبھی سہی گھومنا، پھر نانا ضروری بھی نہیں۔“

”تو میں کون سا تمہیں ہنی مون پر لے جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔“ مجال ہے جو عمر بھی دل رکھنے کی بات کرے۔

”بندہ سال بعد مجھے ہنی مون پر جانے کا کوئی شوق بھی نہیں، جب وقت تھا تب لے کر نہیں گئے۔“ شکوہ لیوں سے پھیل ہی گیا تھا۔ اگرچہ عشوہ نے فوراً لب بھینچ لیے تھے، مگر کمان سے نکلتا تو بھلا واپس آ سکتا تھا۔ عمر نے ایک مرتبہ پھر سے گردن موڑ لی۔

”یہ بھی میرا ہی قصور ہے؟“ عمر نے طنزیہ نظروں سے اسے گھورا۔ ”جب بھی کیس آنے جانے کا پروگرام بنانے کا ارادہ ہوتا، کبھی عمیمہ بیمار ہو جاتی، کبھی عموریہ کو نمونیہ ہو جاتا اور کبھی امین کے آنے کی تیاریاں۔“

”نہیں جی! آپ بھلا کیونکر قصور وار ہیں، سارے فساد کی جڑ تو میں ہوں۔“ اس نے لوشن کی بوتل کو زور سے ڈرے تک پرچا۔

عمر ایک دفعہ پھر چینل سرچنگ میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ کو قبضے میں کر لیا۔

”پہلے میری بات سن لیجئے! مجھے سونا ہے۔ آپ بے شک پوری رات بیٹھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہیے گا۔“

”سونے کے علاوہ تو تمہیں کچھ اور سوچنا ہی نہیں۔“ وہ اس کے ہاتھ سے ریموٹ لیتا چاہتا تھا، مگر عشوہ نے غصہ کے مارے ریموٹ تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ دن بھر ایک بل کے لیے بھی کمر نہیں نکال سکتی تھی۔ عشوہ اس الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔ وہ جی ہی تو کہہ رہی تھی، صبح چار بجے کی اٹھی ہوئی رات گیارہ بجے بھی نہ سوتی۔

”یہ تم غور لوں گا ایک بڑا ہتھیار ہے، ٹھک گئے، ٹوٹ گئے، مر گئے۔“

عمر تکیے کے نیچے سے ریموٹ نکال ہی چکا تھا۔ اور ایک دفعہ پھر سے عمر کوئی کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ کر

لڑتے قدموں سے جوں ہی وہ باہر آئی، اسے باہر کا ماحول دیکھ کر خاصا جھٹکا لگا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں کارپٹ پر بیٹھے تھے۔ عمیمہ نے دسترخوان چن کر کھانا لگا رکھا تھا۔ وہ دو قدم چل کر مزید آگے آئی تو عمر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”شام تک سوتے رہنا تھا، اب تم کچن سے ریٹائرڈ ہو جاؤ، عشوہ! دیکھو تو عمیمہ نے یہ فورم اور چاول بنائے ہیں۔ اور اللہ کی قسم! اتنے فیسٹی ہیں کہ میاں جی کے ریسٹورنٹ کا فورمہ یاد آ گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، عمیمہ اتنی اچھی کوکنگ بھی کر سکتی ہے۔“

عمر نے عمیمہ کے ہاتھ پر ہوسہ دے کر ایسے بے ساختہ انداز میں تعریف کی تھی کہ عمیمہ کے ساتھ عشوہ بھی اندر تک مسرور ہو گئی۔ بھلا آج تک عمر نے کب کسی کی تعریف کی تھی۔ ہاں! نقص نکالنے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ عشوہ نے فورمہ اور چاول چھسے تو واقعی عمر کی بات پر یقین آ گیا۔ عمیمہ نے فرسٹ ٹائم بغیر کسی پوچھنے اتنا اچھا کھانا بنایا تھا۔ سو عشوہ کا ماں ہونے کے ناتے سے رول خون بڑھ گیا۔

”فورمہ کیسے بنایا ہے بیٹا! وہ عمیمہ کے قریب ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے بولی۔

”مالا! دادی بیگم سے پوچھ کر آئی تھی۔“ عمیمہ کو جھوٹ بولنا مناسب نہیں لگتا تھا۔ سو اس نے جیتا دیا۔ ”پھر بھی دیکھو عشوہ! فرسٹ ٹائم اس نے فورمہ بنایا ہے اور وہ بھی اتنا خوش ذائقہ۔“ عمر سارا کریڈٹ اپنی بیٹی کو ہی دینا چاہتا تھا۔ عمیمہ بہت خوش بھی تھی اور اپنی تعریف پر شرم بھی رہی تھی۔

”بیٹا! میں نے پہلپ کروائی تھی۔ پیاز میں نے کالی، ایتے، آٹو آئے تھے، اور مرچیں بھی میں نے کالی تھیں۔ ابھی تک انگلیوں پر لگ رہی ہیں اور باقی سب ایسا بنے کیا۔ روٹی بھی ایسا بنائی۔“ عموریہ بھی ٹھک کر کچھ تعریف وصول چاہتی تھی۔ عمر نے بھی پھر تعریف کرنے میں تنخواشی نہیں کی تھی۔ یہ ساری کنوئیاں صرف عشوہ کے لیے تھیں۔

”تب ہی میں کوں، بزمِ مرج اور پیاز میں الگ سا

ٹیسٹ کیوں محسوس ہو رہا ہے۔“ عمر آج واقعی موڈ میں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی بادشاہ سلامت کے موڈ بدلنے کا پتا نہیں چلتا تھا۔

”تو پھر آکس کریم تو کچی ہوئی۔“ عموریہ کھانے پینے پر تو مورتی تھی۔

”بالکل پکی۔“ عمر نے انہیں بے طرح۔ خوش کر دیا تھا۔

”بھیا جان! ہم بھی ایک بات سوچ رہے ہیں۔“ امین نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد بڑے مددگار انداز میں کہا تھا۔

”کون سی بات؟“

”ہم سوچ رہے ہیں کہ کوئی ڈش بنانا کیسے لیس، تاکہ آپ ہماری بھی تعریف کریں۔“ اس نے گال پر انگلی رکھ کر اتنے بے ساختہ انداز میں کہا تھا کہ عشوہ اور عمر ایک ساتھ ہنس پڑے۔

”ہم آپ کی ویسے ہی تعریف کر دیتے ہیں شہزادی عالیہ! آپ کچن کو رونق بخش کر اپنی ننھی سی جان پر ظلم مت کیجئے گا۔“ عمر نے امین کی ننھی سی ناک دبا کر کہا۔ وہ ہنس پڑی۔

عشوہ نے مسکراتے ہوئے بلا ارادہ ہی عروسہ کی طرف دیکھا تھا اور اس کے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ عجیب کھوٹی کھوٹی سی کیفیت طاری تھی اس پر۔ یوں لگتا تھا کہ وہ یہاں موجود ہونے کے باوجود بھی موجود نہیں ہے۔ کسی اور جہاں، کسی اور ٹگر میں محو پرواز ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سوچ کی پرچھائیاں تھیں، نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی، کس خیال میں تھی۔

عشوہ کو اس کا کھویا کھویا سا انداز بہت عجیب لگ رہا تھا۔ تاہم اس وقت اس نے اسے ٹوکنا یا بلانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی عشوہ نے بہت دفعہ اسے خاموش خاموش اور کھویا کھویا پایا۔ آج کل امین کے ساتھ اس کی کھٹی میٹھی لڑائیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

عروسہ کی بھی چٹھیاں ہو چکی تھیں۔ مگر ان دنوں وہ

صمم دیکھ کر ٹھٹکی تو ضرور تھی۔ تاہم اس نے اس قدر سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا تھا۔ مگر اس وقت تو وہ خاصی پریشان ہو گئی تھی۔ ابھی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”میں تمہیں کچھ دنوں سے کافی پریشان دیکھ رہی ہوں۔ اگر کوئی پرابلم ہے تو شیئر کرلو۔“ عشوہ کے لیے میں ہمیشہ والی نہایت تھی۔ عروسہ کچھ اور گھبرا گئی۔

”تمہیں بھابھی! پرابلم کیسی۔“

”پھر اتنی چپ چپ کیوں ہو؟“

”آپ کو ایسا قیل ہوتا ہے، میں تو پہلے کی طرح ہوں۔“ اس نے مصنوعی بے شاشت کا مظاہرہ کیا۔ مگر عشوہ پچی تو نہیں تھی جو بمل جاتی۔

”عروسہ! اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری ماں، بہن، بھابھی سب کچھ ہوں، کیا پتا تمہاری پریشانی دور کر دوں۔“

”آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں؟“ عروسہ کو غصہ آ گیا۔

”آپ بات کو غلط رنگ مت دو۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟“ عروسہ چڑھ گئی۔

”اعتماد کیوں نہیں، مگر نہ جانے کیوں دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔“ وہ ذریعہ پریشانی تھی۔

”چلو! انہیں بتانا چاہتیں، تمہاری مرضی۔ کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ سلاڈ بناؤ۔ اس طرح خاموش خاموش بیٹھو گی، پھر تو میں جو کچھ کی ضرور۔“ عشوہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔



بڑے دن ہوئے تھے بھابھی بیگم نے چکر نہیں لگایا تھا اور نہ ہی نوری یا پھر غوفیہ باجی ادھر آئی تھیں۔ عشوہ سوچ رہی تھی کہ کسی دن وقت نکال کر غوفیہ باجی کی خیریت معلوم کر آئے گی۔ غوفیہ باجی بھابھی بیگم کی دوسرے نمبر والی بہو تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ ان کا بیٹا عمر نوری اور شوزی سے

گھر میں ہونے کے باوجود گویا گھر میں نہیں تھی۔ اس کا سارا دن نوری کے گھر میں گزرتا تھا۔ جبکہ عشوہ چاہتی تھی کہ ان دنوں وہ بھی کچھ گھرواری سیکھ لے یا پھر کسی ٹریننگ سینٹر سے کوئٹہ یکننگ کا کورس وغیرہ کر لے۔ اس کا ارادہ تھا کہ عروسہ کے ساتھ عرصہ کو بھی دو تین گھنٹے کے لیے بھیج دیا کرے گی۔ جب اس نے عروسہ سے یہی بات کی تو وہ بے زاری سے بولی۔

”موڈ نہیں بن رہا بھابھی! ابھی فی الحال ریٹ کرنے کا ارادہ ہے۔ ابھی تو کالج سے جان چھوٹی ہے۔“

”دو تین گھنٹے کی تو بات ہے۔“ عشوہ اسے ہر صورت قائل کرنا چاہتی تھی۔

”عمر بھائی ماں جا میں گے؟“

”میں ان سے بات کر لوں گی۔“ عشوہ مطمئن تھی۔

”تو پہلے بات کر لیں، عین ممکن ہے کہ وہ انکار کر دیں۔“ عروسہ کا انداز کچھ استہزائیہ تھا۔ عشوہ کو برا لگا۔

”میں نے پچھلے سال بھی تمہارے لیے ان سے بات کی تھی۔ اس کام کے لیے وہ اعتراض ہرگز نہیں کریں گے۔“

”پھر بھی۔“ آپ کے مجازی خدا کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ عروسہ ایک میگزین کی ویرق گردانی کر رہی تھی، مگر اس وقت بھی عشوہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ عروسہ ذہنی طور پر یہاں حاضر نہیں تھی۔ وہ اس کی باتوں کے جواب بغیر سوچے سمجھے دے رہی تھی۔

”دیکھو بیٹا! اگلے گھر بھی جاتا ہے۔ یہیں تو نہیں بیٹھے رہنا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اپنی ماں نہیں بھی تو بچی کو کچھ سمجھایا، سکھایا بھی نہیں۔“ عشوہ نے مشین لگا رکھی تھی۔ مشین کا بزر بجا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کپڑے نکال کر کھنگالنے، نچوڑنے کے بعد اگلی پر پھیلا کر وہ واپس آئی تو عروسہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اب کے عشوہ بچ بچ ٹھٹک گئی۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا۔ اسے کیا پریشانی تھی؟ آج سے پہلے عشوہ اسے یوں گم

بڑا تھا۔ آج وہ ناشتے کے ساتھ ہی کچن کا کام سمیٹنے کے بعد سالن بھی پکانے لگی تھی، جب عمیمہ بھی چپکے سے آئی۔

”ماما! میں سالن بناتی ہوں۔“

”نہیں بیٹا! تم کچھ دیر بیٹھ کر پڑھ لو۔ اگر ہوم ورک کرنا ہے تو کرو، بس چکن تو پکانا ہے، فائف بنا لوں گی۔“ وہ باز کٹ رہی تھی۔ عمیمہ بس اٹھالائی۔

”میں بس چھیل دوں۔ سنا ہے بسن چھیلنے سے نیل بھی مضبوط ہوتے ہیں، ان میں چمک بھی آجاتی ہے۔“ عمو عمو مسکرا دی۔

”میری خواہش آپ جانتی ہیں بھلا کیا ہے؟“ وہ نفاست سے بسن چھیلتے ہوئے بولی۔ عمو نے بھنوس اچکا کر پوچھا۔

”کیا؟“

”آپ کی ساری خوبیاں میں چرا لیتا چاہتی ہوں۔“ عمیمہ نے ایک بہت اٹوکی بات کہہ دی تھی۔ وہ کچھ پل کے لیے تو بیٹھ کر چہرہ دیکھتے ہوئے ساکت ہو گئی۔

”مجھ میں بھلا کون سی خوبی ہے؟“ وہ سنہیل کر گویا ہوئی۔ عمیمہ کی اس عجیب سی خواہش نے اسے بے حد حیران ہی تو کر دیا تھا۔

”آپ میں اتنی خوبیاں ہیں جن کا کوئی حساب نہیں۔ ہم پراؤڈ فیل کرتے ہیں کہ آپ ہماری ماں ہیں۔ ہماری فرینڈز آپ کو اور پاپا کو دیکھ کر رشک کرتی ہیں۔ آپ ساری دنیا کی ماؤں سے زیادہ سوٹ ہیں ماما! عمیمہ نے بے حد بے ساختگی کے عالم میں اس کے رخسار چوم لیے۔ اس والمانہ انداز نے عمو کی آنکھوں کو پریم کر دیا تھا۔

”ہر بچہ اپنی ماں کے لیے ایسے ہی محوسات رکھتا ہے میری جان! وہ اس کے گل چوم کر اٹھ گئی۔

”اس بات سے انکار نہیں، میں مانتی ہوں مگر آپ پھر بھی بہت سوٹ ہیں۔“ عمیمہ نے بسن چھیل دیے تھے۔ اب وہ ڈھیروں سرخ سرخ نمائز کاٹنے لگی تھی۔ اسی پل عمو نے بچن میں جھانکا۔

”بھابھی! میں نوری کی طرف جا رہی ہوں، کھانا اور

ہی کھالوں گی۔ ایمن کو میرے پیچھے نہ بھیجے گا۔“ وہ چلی بھی گئی، جبکہ عمو اسے پکارتی رہ گئی۔

”عمو خفا ہوں گے عمو! واپس آجاؤ، یہ کون سا وقت ہے کسی کے گھر جانے کا، لوگ اپنے کام کاج میں مصروف ہیں۔ بھلا نوری ہمارے گھر دو دو تین تین چکر لگاتی ہے کیا؟“ عمو بھلا تھی کہاں، جو اس کی تقریر کا جواب دیتی۔ وہ پیاز گولڈن کرتے ہوئے مسلسل بڑبڑاتی رہی تھی۔

”میں روٹی پٹاؤں؟“ عمیمہ اب فرق سے آٹے کا پیالا نکال رہی تھی۔

”نہیں! میں کرلوں گی، تم اب جاؤ۔“ اس نے زبردستی عمیمہ کو کچن میں سے باہر نکالا تھا۔

اس نے کھانا بنا کر میز پر لگا دیا تھا اور پھر خود نماںے چلی گئی۔

ابھی تک عمر آفس سے نہیں آیا تھا۔ وہ بچ کے لیے لازمی گھر آتا تھا۔ مگر اس وقت گھر کی سیوئوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر عمو سے رہانہ گیا تو ایمن سے بولی۔

”جاؤ! عمو کا موبائل لے کر آؤ۔ عمر کو کال تو کروں۔ ابھی تک نہیں آئے۔“

”پناہیل عمو سے ساتھ لے گئی ہے۔“ ایمن نے کارٹون دیکھتے ہوئے بتایا۔ عمو جھنجھلا کر فون اسٹینڈ تک آئی تھی۔

”نروس میں جانا تھا۔ موبائل ساتھ لے کر جانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے عمر کے نمبر پر کال کی تھی۔ تقریباً ”چوٹھی تیل پر عمر نے کال ریسیور کی۔

”خیریت؟“ وہ کچھ جلدی میں تھا۔ اسی لیے چھوٹے ہی بولا۔

”آپ بچ کے لیے نہیں آئے؟“

”آج میں آسکوں گا۔ آفس میں کچھ کام ہے۔“ اس نے مصروف سے انداز میں بتایا۔ ”بچوں نے کھالیا؟“

”نہیں! آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔“ عمو نے وضاحت کی۔ ایمن تو بالکل بھی عمر کے بغیر کھانا

نہیں کھاتی تھی اور اس بات سے عمو اچھی طرح آگاہ تھا۔

”حق عورت! انہیں ابھی تک بھوکا بھڑا رکھا ہے۔“ حسب معمول عمر کو غصہ آ گیا۔

”آپ کو خبر تو ہے، ایمن آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاتی۔“ اس کا غصہ اس نے شربت کے ٹھونٹ کی طرح حلق سے اتار لیا۔

”ابھی میں نہیں آسکتا۔ بچوں کو کھانا کھلا دو۔“

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟“ عمو نے اس کی مصروفیت کے پیش نظر جلدی سے پوچھا۔

”بیس منٹ کی بریک ہوئی ہے، ابھی بس کھانے ہی لگا ہوں۔“

”جھا! پھر اللہ حافظ۔“ عمو نے فون رکھنے سے پہلے وٹری کی آواز کے ساتھ کچھ اور بھی آوازیں سنی تھیں۔ زنانہ اور مردانہ آوازیں۔ شاید عمو اپنے اسٹاف کے ساتھ کسی ہوٹل میں موجود تھا۔ سو عمو نے فون رکھ کر کھانا لگانا شروع کر دیا۔

بچیاں کھانا کھا چکی تھیں۔ عمیمہ نے برتن بھی سمیٹ لیے تھے۔ سو عمو ظہر کی نماز ادا کرنے لگی۔ معمول کی تسبیح تلاوت کے بعد وہ اٹھ کر باہر آئی۔

بچوں کے کمرے میں جھانکا تو بیٹوں کو سوٹا پکاروہ عمو سے کے کمرے میں آ گئی۔ وہ ابھی نوری کے گھر سے نہیں آئی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بیرونی گیٹ بند کر کے بھابھی بیگم کی طرف آ گئی۔ بھابھی بیگم اپنے مخصوص تخت پر بیٹھی تھیں۔ عمو کو دیکھ کر گویا کھل اٹھیں۔

”میری بیٹی کیسے راستہ بھول آئی ہے؟“

”راستہ تو اچھی طرح سے یاد ہے بھابھی بیگم! مگر فرصت کا لمحہ بھر میسر نہیں۔“ وہ ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

”یہ تو ٹھیک کہا۔“ انہوں نے فوراً ”تائید کی تھی۔“ عمو سے بھی تو ابھی ذمہ دار بپوں کو نہیں سمجھتی۔ بچوں کے ساتھ جو بھی بچی بن جاتی ہے۔“

”کالم تو کافی بٹ گیا ہے۔ عمیمہ اور عمو یہ خاصا خیال رکھتی ہیں۔ بس طبیعت کے بوجھل پن کی وجہ

سے میں گھر سے نکل نہیں پاتی۔“ اس نے سادگی سے وضاحت کی۔

”باشاء اللہ عمیمہ بہت سمجھ دار ہے۔“ عمو یہ بابتی کچن سے نمودار ہوئی تھیں۔ کچھ خفا خفا سی دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔ عمو نے بھی ان کے رویے پر زیادہ غور و فکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ورنہ عمو یہ بابتی کے تصور دیکھ کر ٹھٹک ضرور جاتی کہ ان کی پیشانی پر خاص ناواور سی سلوٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور وہ چہانے کیا تھی۔ اگر وہ غور کرتی تو پھر بوجھ ڈھونڈنے کا خیال بھی آتا۔

”بہت دن ہوئے ہیں۔ آپ نے چکر نہیں لگایا؟“ عمو بھی شکوہ کے بغیر نہیں رہ پاتی تھی۔

”بس بیٹی! کچھ گھبرو پریشانی تھی۔ دل ہی نہیں مانا کہیں آنے جانے کو۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیسی پریشانی؟“ عمو نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”نوری کے رشتے کی کہیں بات نہیں بن پارہی۔“

بس اسی وجہ سے خاص پریشانی ہے۔ انہوں نے صاف صاف بتا دیا تھا۔ ”آج کل لوگ بس اچھی شکل پر مر رہے ہیں۔ اخلاق، تمیز، خلوص سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔“

”نوری کی بات ایک جگہ چل رہی تھی؟“

”جواب دے دیا ہے ان لوگوں نے انہیں کوئی اونچی بلبی گوری جیٹی لڑکی پسند آ گئی تھی۔“ وہ مجھے لہجے میں بولی تھیں۔ ”آپ اپنی عمو سے کوئی دیکھ لو! ابھی بات چلاؤ۔ دس رشتے آپس گے۔ بس جی! اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔“

”اللہ بہتر کرے گا بھابھی بیگم! آپ فکر نہ کریں۔ جو کوئی اس کے جوڑ کا ہو گا۔ راستے بدل بدل کر ادھر آئے گا۔“ اس نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”بچوں کی فکر نے آنکھوں سے نیندیں چرائی ہیں۔ عمو یہ بھی کچھ پریشان ہے۔ اوپر سے بیٹا بھی مانو ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔“ ان کی مبہم سی بات عمو کے

پلے نہیں پڑی تھی۔

”نوری کہاں ہے؟“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ عروسہ بھی تو نظر نہیں آ رہی تھی۔

”میرے پٹرے سلائی کر رہی تھی۔ ابھی سونے کے لیے اٹھی ہے۔ میں نے سوچا کچھ آرام کر لے۔ سویرے کی مشین کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔“ بھابھی

بیگم نے ملل کے دوپٹے سے سر لپیٹے ہوئے بتایا۔ نوری بے حد سلیقہ مند، سکھ اور گھر گریہ سستی کو سنبھالنے والی لڑکی تھی اور کچھ بھابھی بیگم کے زیر تربیت اور بھی

ہر فن میں طاق ہو گئی تھی، مگر یہ دنیا اور اس کے ”معیار“ پر پورا اترا کہاں آسان تھا۔ وہ خود کو ہی اگر دیکھ لیتی تو حیران ہو جاتی۔ صورت، سیرت میں بے

مثال، ہر فن میں طاق، ہر کام میں ماہر، بس تعلیم کے معاملے میں کمی رہ گئی تھی اور یہ کمی گویا اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اگر تعلیم

یافتہ ہوتی تو ضرور عمر کے دل پر راج کرتی۔ بس اسی ایک کمی کی وجہ سے وہ خود کو اپنی چھٹی تصور کرتی تھی۔ اور ادھر نوری میں بھلا کیا کمی تھی۔ اچھے تعلیمی ادارے

سے پڑھ رہی تھی۔ سلیقہ مند، سمجھ دار، بس رنگ روپ میں خاصی کم تھی اور اسی وجہ سے ٹھکرانی جارہی تھی۔ عروسہ بس نصف سے سوتی رہ گئی۔

”عروسہ کیا کر رہی ہے؟ آج صبح کا اس نے چکر نہیں لگایا؟“ بھابھی بیگم، عروسہ کا پوچھ رہی تھیں جبکہ اس کا دل تو گویا دھک سے رہ گیا۔

”کیا مطلب ہے عروسہ یہاں نہیں آئی؟“ وہ گویا پوری جان سے کانپ کر رہ گئی، مگر بھابھی بیگم پر کچھ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ اس کے پورے وجود پر عجیب سی بے چینی چھائی تھی۔ دل تھا کہ فکر کے مارے سینے میں فلاں بایاں کھا رہا تھا۔

”عروسہ یہاں نہیں آئی تو پھر کہاں گئی ہے؟“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا گویا سر پر پیر رکھ کر صباگ نکلتی اور کہیں سے بھی اسے ڈھونڈ کر گھر لے آتی۔

”یا اللہ! میں کیا کروں؟ عمر تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے عروسہ اتنے گھنٹوں سے کہاں غائب

ہے؟“

وہ بھابھی بیگم سے معذرت کر کے اٹھ آئی۔ گھر آکر اس نے عروسہ کے نمبر پر کئی مرتبہ زرائی کیا مگر فون بھی بند تھا۔ پھر اس نے ”فرڈا“ ”اس کی ساری سیلیوں کے گھر فون کے“ مگر وہ بجائے کہاں تھی؟ بغیر بتائے

کہ گھر چلی گئی تھی؟ جوں جوں وقت آگے گزر رہا تھا۔ عروسہ کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ دل تھا کہ اندیشوں میں گھرا

اور بھی سہارا تھا۔ اپنی اس پریشانی کو وہ بھابھی بیگم سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ بھلا! میں بتاتی بھی کیا؟ وہ عروسہ کے پارے میں کیا سوچیں۔ گھر کی بات گھر سے

باہر نکل جاتی تو پھر کیا عزت رہ جاتی۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی چولیس پلنے لگی تھیں۔ پریشانی کے مارے چکر آ رہے تھے۔ تنگ آکر

اس نے عمر کے موبائل پر کال کر دی تھی مگر عمر کا نمبر بھی آف جا رہا تھا۔ وہ پھر سے عروسہ کے نمبر پر زرائی کرنے لگی۔ اب وہ کبھی عروسہ کو کال کرتی تھی اور کبھی

غیر کو۔ ہر تین منٹ بعد وہ یہی عمل دوہرا رہی تھی۔ ایک بار دوبار بار بار۔ پائی۔ بس ایک ہی شیپ شدہ جواب ”مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں

ہو رہا۔“ عروسہ کی تو گویا جان نکل جا رہی تھی۔ نمبر ڈائل کر کے اس کی انگلیاں کھسی جارہی تھیں۔ خوف کے مارے دل بند ہونے کے قریب تھا۔ جب اس کے

دشت زدہ دل میں ایک دوسوہ بالکل اچانک بیدار ہو گیا۔ اس دوسوے کے نمونے ہی گویا عروسہ پورے قد سے ڈھس گئی تھی۔

”کیا عمر اور عروسہ ایک ساتھ ہیں؟ دونوں گھر نہیں آئے۔ دونوں کے نمبر آف ہیں؟ دونوں سے بات نہیں ہو پارہی؟ کیلیہ بچ ہے؟“ اس کی ناگن جیسی سوچوں نے گویا اسے ہی ڈس لیا تھا۔ وہ ایک دم ٹیل ٹیل ہو گئی تھی۔

”کیا یہ بچ ہے؟ کیا یہ بچ ہے؟“ یہ سوال اسے کوٹوں کی طرح لگ رہا تھا۔ اور ہر کوڑے کی ضرب اسے کراہنے اور چلانے پر مجبور کر رہی تھی مگر وہ کسی

پتھر کی مورت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ گویا اس کے وجود میں جان تک باقی نہیں تھی۔ وہ سانس تک نہیں لے رہی تھی۔ اس کی دھڑکنیں تک خاموش تھیں

مگر وہ پھر بھی زندہ تھی۔ حالانکہ زندہ رہنے کو دل اب آمادہ بھی نہیں تھا، مگر پھر بھی اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنے ساتھ اس عظیم دھوکا دہی کے مرتکب لوگوں کے

گریبان تک پہنچا تھا۔ وہ ایسے منظر سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس طرح دنیا سے پردہ پوش نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے بچڑوں کی ہرجال میں رسوائی

چاہتی تھی اور اس کے لیے عروسہ عمر کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ اور جب وہ ان زہر آلود سوچوں کے سمندر میں غرق ہوتی یا پوسی کی آخری حد تک پہنچی ہوئی تھی تب بہت

چپکے سے عروسہ اس کے قریب آ کر۔ ”بھابھی!“

”تم۔“ عروسہ کے لہجے میں عجیب سی پھنکار تھی۔ ”کہاں گئی تھیں تم؟“

وہ گویا بل کھا کر اٹھی۔ غصے اور توہین کے احساس نے عروسہ کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ عروسہ کا خوب

صورت چہرہ فوج لیتا چاہتی تھی، مگر ایک دم گویا اس کی تمام تر ہمتیں کسی نے سلب کر لی تھیں۔ اس سے بولا

”ہی نہ گیا۔ کچھ پوچھا ہی نہ گیا۔ وہ بس فکر مکر عروسہ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک پورا پرچہ تیار کیے بیٹھی تھی۔ مغالطت کا ایک طوفان اس کے اندر

ٹھا تھیں مار رہا تھا، مگر اس کے ہونٹ گویا کسی نے سوئی کے ساتھ بے دردی سے سی دیے تھے۔

”میں اپنی ایک دوست کے گھر گئی تھی۔“ اس کے لہجے کی کپکپاہٹ میں جھوٹ صاف عیاں تھا۔

بولی۔ ”میرے بچ اور جھوٹ سے آپ کو کیا لیتا دیتا ہے۔ میرے معاملات میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی

عروسہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اس میں نہ ہمت تھی نہ حوصلہ بھلا وہ کیسے عروسہ اور عمر کے سامنے ڈٹ جاتی۔

دن چپکے سے گزرتے چلے گئے تھے۔ عروسہ کو گویا ایک چپ کی چاٹ لگ گئی تھی۔ دل میں خاموشیاں کیا اٹری تھیں۔ لب ہنسا اور بولنا ہی بھول

گئے تھے۔ ایسے ہی اداس اور دیران دونوں میں فائق کی فون کال گویا اسے پھر سے زندہ کر گئی تھی۔

اس دن بھی وہ معمول کے کام کاج میں مصروف تھی جب عروسہ نے بچ کر اسے آواز دی۔ ”ماما! جلدی آئیے۔ ساموں کا فون ہے۔“

”فائق کا فون؟“ اس کے ہاتھ سے وانہو گر گیا تھا۔ اور وہ نہ جانے کس طرح سے فون تک کا فاصلہ طے

کر کے آئی تھی۔ ریسپور ہاتھ میں لیا تو گویا اشکوں کی جھڑی لگ گئی تھی اور جب وہ رو رو کر دل کی ساری بھڑا نکال کر ملی ہوئی تو پھر فائق نے بولنا شروع کیا۔

”کمال ہے آپا! تم نے تو پہلے ہی رونا دھونا شروع کر دیا ہے۔ ماما میں اپنے آنے کا ارادہ بدل لوں۔

میری سونچوں دل آپا کا اللہ بھلا کرے۔ آپا! میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔ تم رو رو کر مجھے اپنی غیبت کی داستان سنانے کی تیاری مت پکڑو۔“ دوسری طرف

فائق اس کے بھرے بھرے دل کی وجہ سمجھے بغیر اپنی سنانے لگا تھا۔

”بیکے امیر اول تو تیری آواز سن کر بھر آیا تھا۔ سو بسم اللہ کر کے آؤ۔ میرا تمہارے بغیر بھلا اور ہے ہی

جان! کہیں پاکستان میں سیلاب ہی نہ آجائے۔“ فائق نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”مخبرے! یہ بتاؤ، کب آو گے؟“ سچ میرا دل بڑا اداس ہو رہا ہے، بس اپنی صورت آکر دکھا جاؤ۔“ اس کے حلق میں پھر سے آنسو اٹکنے لگے۔

”اپنے اداس دل کو ذرا خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ اور آؤں گا تو میں تب جب مجھے تم اچھی سی کوئی خبر سناؤ گی۔“

”یسی خبر!“ اس نے آنکھ کا کونا بے دردی سے مسل دیا۔

”میری دلن تلاش کرنے کی خبر، کوئی اچھی سی گڈ نیوز، یعنی کہ میری دلاری آیا اپنے جیلے بھائی کے لیے ایک فل ٹائم میڈر دیا فت کر چکی ہے۔ تاکہ میں آکر نکاح پڑھوا لوں۔“ وہ اپنے انہی شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

”کیا سچ؟“ میں تمہارے لیے لڑکی دیکھوں فائق؟“ عشوہ کا بھابھا اندیشوں میں گھرا دل گویا کھل اٹھا۔

”مگر میری تو نہیں بولی آیا! جو تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ فائق نے گویا دہائی دی۔

”اچھا! بتاؤ۔ لڑکی بھلا کیسی ہونی چاہیے؟“ وہ عروسہ اور عمر کی طرف سے دیے گئے کھاؤ کو بھول کر قدرے بے اشت سے بولی۔

”بس لڑکی ہونی چاہیے، کوئی شو پیس نہیں۔ گھر کا کام کاج جانتی ہو، مطلب کھانا پکانا۔“ فائق نے وضاحت کی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے، تم بے فکر ہو جاؤ۔“ عشوہ نے دل سے کہا۔

”میں تو ہمیشہ سے بے فکر ہوں۔ غریب لائے کا کام تمہارے ذمے لگا رکھا ہے۔ ویسے آپ! تم بھی زیادہ فکریں مت مالا کرو۔ نیشن ہمیشہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، لینے کی نہیں۔“

وہ اپنے لالباہی انداز میں کہہ رہا تھا۔ عشوہ کے دل میں کانٹا سا جھجھکا۔ دیمان ایک دفعہ پھر عروسہ اور عمر کی

طرف چلا گیا تھا۔ ہمہ وقت اسے بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر ایسا ویسا کچھ ہو گیا تو پھر اس کا اور اس کی بچیوں کا کیا بنے گا؟

”سچ آیا!“ فائق دلاڑ سے بولا۔ ”بہت یاد کرتا ہوں میں تمہیں۔“

”اب مٹھن مت لگاؤ۔“ عشوہ ہنس پڑی۔

”میں تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈوں؟“ وہ ایک مرتبہ پھر یقین دہانی چاہ رہی تھی کہ فائق بھی گر گئی کی طرح رنگ بدلتا رہتا تھا۔

”لڑکی کیس گم ہے، جو تم ڈھونڈنے کی مہم پر نکلنے کی اجازت چاہ رہی ہو آپ؟“ فائق بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”میری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کر لو گے؟ یہ نہ ہو۔ میں سارے معاملات طے کر لوں اور تم انکار کرو۔“ عشوہ اس سے ہر بات کلیئر کر لینا چاہتی تھی۔

ظاہر ہے وہ کسی کی زندگی کے ساتھ بھلا کیونکر کھیلتی۔ ”نہیں آپ! مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔“ اب کے فائق سنجیدہ ہوا تھا۔

”اچھا! ایک لڑکی ہے میری نظر میں۔“ عشوہ کچھ سوچ کر پر جوش ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی تمام تر فکر و پریشانی بھلا چکی تھی۔

”صرف ایک لڑکی؟“ فائق کو گویا دل کا دورہ پڑ گیا۔ ”نہیں۔“

”نہ جی۔ آپ خفایوں ہوتی ہیں، جیسے آپ کی مرضی۔“ فائق نے فوراً تابعداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

عشوہ کا دل دیر اس کی بوٹیکوں سے لطف اندوز ہوتی رہی تھی۔ فائق سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ جلتے دل کو گویا قرار آیا تھا۔ فون رکھ کر جوں ہی وہ ہٹی تو پہلی نظر عمر سے ٹکرائی تھی۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عشوہ کے دل میں عمر کے لیے نفرت ایک دم پھر سے اٹھ اُٹئی۔ وہ کتہہ اگر اس کے قریب سے گزر جانا چاہتی تھی، جب عمر کے سلگتے لہجے اور آواز کو سن کر ٹھٹھکی۔

”فائق کو کم از کم مینے میں ایک مرتبہ ضرور فون کر لینا چاہیے۔ تمہاری صحت کے لیے اس کے فون ناگزیر ہو گئے ہیں۔ پھر عید کے عہد نہیں، بلکہ ہر مہینے ہی تمہارے چہرے پر بھولی بھٹکی مسکراہٹ ہم مسکین لوگ بھی دیکھ لیا کریں گے۔“

”آپ نے مجھے دیکھ کر کرنا بھی کیا ہے؟ آپ کے دیکھنے کے لیے بے شمار سامان موجود ہے۔“ وہ سر سے لے کر پیر تک سلگ گئی تھی۔

”کبھی کبھی سمجھ داری کی بات بھی کر لیتی ہو۔“ اس نے عام سے انداز میں اسے چڑانا چاہا تھا۔ تاہم عشوہ نے بات کو اپنے ہی پیرائے میں لے لیا۔

”میں اور میری اوقات کیا ہے۔“

”میں نے لوگ اپنی اوقات پہچان ہی لیتے ہیں۔“ وہ طعنیہ بولا۔

”پورے پندرہ سال سے اپنی اوقات اور حیثیت کا تعین لگا رہی ہوں۔“ عشوہ نے بھرائی آواز پر بمشکل قابو پا کر کہا۔

”تو پھر نتیجہ کیا نکلا؟“ وہ ہنسیوں اچکا کر پوچھ رہا تھا۔

”نتیجہ صاف ہے۔ ہم تو نہ تین میں ہیں نہ تیرہ میں۔“ اسے ایک دم اپنی توہین کے احساس نے زرد کر دیا تھا۔

”بھائی! لطیفے سنا رہا تھا؟“ اب کے عمر نے موضوع بدل کر طنز کرنا شروع کر دیے تھے۔

”ہاں۔“

”ہمیں بھی سناؤ۔ ہم بھی تھوڑی دیر کے لیے ہنس کھیل لیتے ہیں۔ دو تین کلو ہمارا بھی خون بڑھ جائے گا۔“

”آپ تو آل ریڈی لوگوں کا خون چوس چکے ہیں۔ مزید خون بڑھا کر بھلا کرنا ہی کیا ہے؟“ اس نے کشش کے کورزا تار نے شروع کر دیے۔

”کچھ تمہیں اوصار دے دوں گا، آج کل تمہارا بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے نا۔“

”مگر بولوں تو پھر کیا کرو گی؟ اور اگر تمہاری ماما سے لڑائی کروں تو پھر کیا کرو گی؟“ وہ جان بوجھ کر ایمن کو چھیڑ رہا تھا۔

”تو ہم آپ کو گھر سے نکال دیں گے۔“ ایمن نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عشوہ کے ہاتھ سے جھاڑ پھونٹنے چھوٹے بچا۔

”ماں اتنی پیاری ہے کیا؟“ عمر نے صدمے کی شدت سے سنبھل کر پوچھا۔ اس کے اتنے لاڈ پیار کے باوجود روٹ مائی کی طرف ہی تھا۔

”جی۔ ہمیں ماما ساری دنیا سے پیاری لگتی ہیں۔ ہم اپنی ماما کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“ ایمن نے انکی اٹھا کر گویا وضاحت کی تھی اور سناٹ کھڑی عشوہ کو بیٹی پر گویا ٹوٹ کے پیار آگیا تھا۔ وہ اتنے مضبوط ستونوں پر کھڑی تھی اور اس کے باوجود کئی طرح کے خدشات نے اس کی راتوں کی نیندیں تک چرائی تھیں۔

وہ شک کے بیج کو دل میں جنم دے کر اپنے اور عمر کے درمیان فاصلے نہیں بڑھانا چاہتی تھی۔ اگرچہ فاصلے تو ان کے درمیان پہلے سے ہی بے شمار موجود تھے مگر رشتے کے اس بھرم کو وہ بغیر کسی ثبوت کے محض ایک شک کی بنا پر بھلا کیسے توڑ دیتی، سو وہ حل کے ساتھ تیل کی دھار دیکھ رہی تھی۔

بچیوں کی چٹھیاں ختم ہو چکی تھیں۔ عشوہ کی مصروفیت کا دائرہ پھر سے پھیل گیا تھا۔ وہی مصروف ترین روز و شب کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سچ سویرے ایک مخصوص رنگہ بھاڑتا۔ آج پھر عمر کو ٹائی نہیں مل رہی تھی۔ شرٹ کی استری بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ مسلسل صبح سے بڑھائے جا رہا تھا۔

”کبھی خود بھی استری کو ہاتھ لگالیا کرو۔ مفت کی نوکرانیاں مل گئی ہیں۔“

”کون؟ کن نوکروں کی فوج بھرتی کر رکھی ہے؟“ عشوہ نے پلٹ کر جھیکے چوتھوں سے اسے غور کر

پوچھا۔

”عمیمہ اور عروسہ اور بھلا کون؟“

”عروسہ کون سے پہاڑ توڑتی ہے؟“ عشوہ کا تو بارے اشتعال کے برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر کبھی پانی تک نہیں پیا تھا۔ کبھی کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ پھر بھی عمر کی ہمدردیاں عروسہ کے ساتھ تھیں۔ عشوہ تو پکے سے ہی بھری بیٹی تھی اسی لیے بھڑک اٹھی۔

”سارا دن کو لہو کے تیل کی طرح توجوتے رکھتی ہو۔“ اسے اشتعال دلا کر گویا عمر کو خوب ہی لطف آنے لگا تھا اسی لیے وہ عشوہ کو تاؤ دلانے کے لیے مزید طنز کرتا رہا۔

”اب عمیمہ سے برائے مہربانی بچن کے کام مت لیا کرو۔ اس کی اسٹڈیز کافی نف ہوئی جا رہی ہے۔ اسے پڑھائی کی طرف توجہ دینے دو۔ اپنی طرح اسے جاہل مت رہنے دینا۔“

”آپ کوئی عالم فاضل اپنے جیسی تعلیم یافتہ لے آتے تھے کم از کم یہ بھاس تو آپ کے دل میں سے نکل جاتی۔ اور میں بھی کوئی بھاگ کر نہیں آتی۔ اپنی چچی امی کو چاکر طعنے اور طنز سنایا کریں۔ یہ ان ہی کی جلد بازی کا نتیجہ ہے جو میں آج تک اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔“ وہ گویا پھٹ پڑی۔

”شادی تو میں اب بھی کر سکتا ہوں۔ تمہیں کیا خبر دن میں کتنی کو لیکز بچے پرو پوز کرتی ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ میں ایک سڑی ہوئی خاتون کا خوش مزاج، خوب رو شوہر ہوں۔“

”بڑی خوش فہمیاں ہیں اپنے بارے میں۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ عمر کو بھی ایلٹ کے ساتھ فریادی کر دیتی۔

”جناب! حقیقت پسند ہوں میں۔ اپنی تعریف خود سے نہیں کرتا۔ میری اسمارٹنس کی ایک دنیا تعریف کرتی ہے۔“ وہ گلے میں ٹائی لٹکائے اب عروسہ کو آواز دینے لگا تھا۔

”عروسہ! ذرا ٹائی کی ٹاٹ لگا جاؤ، شریکوں کو تو دیے

ہی الگ لگی ہوئی ہے، قریب آکر اور بھسم کریں گے مجھ غریب کو۔“

”آئندہ میں ناشتا بھی بنا کر نہیں دوں گی۔ عروسہ ہی سے بنوائے گا، کیا کچا، بد مزہ ناشتا۔“ آخری فقرے اس نے ذریعہ لب بد مزہ کر کے کہے تھے، تاکہ صرف عمر ہی سن سکے اور کسی کے کانوں تک آواز نہ جائے۔

”عروسہ کے ہاتھ کا ناشتا کر کے ڈاکٹروں کی جبینیں بھرنی ہیں کیا؟“ عروسہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے عمر نے جملہ کیا۔

”مگر میری کوکنگ کے بارے میں یوں ہی ارشاد جاری کرتے رہیں گے تو پھر میں ٹائی کی ٹاٹ نہیں لگاؤں گی۔“ وہ بھی عروسہ ہی فوراً دھمکیوں پر اتر آئی۔

”ٹیک ٹائی کی ٹاٹ کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے تمہیں؟ اور اسی بات پر محترمہ اکرٹی پھرتی ہیں۔“ بڑے خوشگوار موڈ میں عروسہ سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ حالانکہ یہ عمر کا معمول تھا، مگر آج کل عشوہ کو ہر بات ہی بری طرح سے کھٹکنے لگی تھی۔ اس وقت بھی عمر کا عروسہ کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا اس کے دماغ پر گویا تھوڑے کی ضرب کی طرح لگ رہا تھا۔

”جو کام مجھے آتا ہے وہ کسی اور کو نہیں آتا۔“ عروسہ صاف جتا رہی تھی کہ عشوہ کو ٹاٹ لگانے کا سلیقہ نہیں۔ ادھر عشوہ گویا بری طرح سے راکھ ہو گئی تھی۔

”کیوں نہیں۔ یہ کام عشوہ بہت اچھی طرح سے کر لیتی ہے، تم خوا خواہ سرچھنے کی کوشش نہ کرو۔“ عمر نے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے کر سیوٹی پر بیٹھے تھے۔ عمیمہ ان کے لیے میز پر ناشتا لگا رہی تھی۔

”بھی آپ بھی اٹھ کر برتن رکھنے کی زحمت گوارا کر لیا کریں۔“ عمر نے ہمیشہ کی طرح سے عروسہ کو ٹوکا تھا۔ مگر اس کا ٹوکنا عشوہ کو سراسر دھوکہ سلہ لگا تھا۔ ذرا ڈرا اور فریب۔

”عمر بھائی! کام کے علاوہ آپ مجھ سے ہر موضوع پر بات کر سکتے ہیں۔“ عروسہ نے تھک کر کہا۔ وہ سامنے

رکھے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس کا عمر بھائی کہنا بھی عشوہ کو صاف اپنا مذاق اڑاتا محسوس ہوا تھا۔ گویا عمر بھائی کہہ کر عروسہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مثلاً کیا کیا؟“

”کرکرت ہائی، ولی بالی، فلم، ڈراما، سیاست، سیاحت اور کچھ بھی۔“ اس نے کندھے اچکا کر کہا شروع کیا تھا۔

”انشاء اللہ! لگتا ہے یہی سارا کچھ گھول کر تم اس بدنصیب آدمی کو کھلاؤ گی جس کے نصیب تمہارے ساتھ پھولیں گے۔“ عمر نے دودھ کا گلاس خالی کرتے ہوئے مزے سے کہا تھا۔ عشوہ کے علاوہ اور سب کے لیے اس کی خوش مزاجی عروج پر ہوتی تھی۔

”میرا خیال ہے وہ دنیا کا خوش قسمت انسان ہو گا۔“ عروسہ نے شرارتی انداز میں چمک کر کہا تھا۔ اور اس کا چمکنا پسینے میں ترتر عشوہ کو بری طرح سے سلگا گیا تھا۔ اس نے غصے کے عالم میں برز زور سے بند کیا۔

”اس سے بڑا جھوٹ کوئی نہیں۔“

”یہی بڑا اور اصلی والا آج ہے۔“ عروسہ ہنسنے لگی۔ اس کی ٹنگنائی نہی کی آواز نے لمحہ بھر کے لیے عشوہ کو بھی مبہوت کر دیا۔

”یعنی اصلی دیسی گھی والا؟“ عمر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہی گھی کا نام مت لیں، عشوہ جی کو اب کائی آجائے گی۔“ وہ عشوہ کو باہر نکلتا دیکھ کر چھیڑنے والے انداز میں بولی۔

”عشوہ جی کی صورت ہی۔۔۔ خیر سے کیا کہیں، ہماری بات تو زہری طرح لگتی ہے جناب کو۔“

”صورت ہی منحوس ہے، بات مکمل کر لیتا تھی۔ بھلا ادھوری چھوڑنے کا فائدہ۔“ تپ تپ کر اس نے اپنی ساری پیش نکل دی تھی۔

”بھیا! اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔“ عیمہ کو بولنا پڑا۔ وہ ابھی ابھی یونیفارم پہن کر آئی تھی۔ ہاتھ میں

عموریہ اور ایمن کے اسکول بیک پکڑ رکھے تھے۔ ”اور مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے۔“ عروسہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئی تھی۔ عموریہ نے بھی اس کے پرانے کو لچائی نظروں سے دیکھنے کے باوجود کھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”میں آس سے لیٹ ہو چکا ہوں۔ کیا خیال آج سارے چھٹی نہ ماریں؟“ وہ ان سب کے کھلے کھلے چروں کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔ بس ان میں عشوہ کا چہرہ چد پڑا تھا۔ وہ جدوجہد بے زار دکھائی دے رہی تھی۔ بچوں نے فوراً ”نعو لگایا۔“

”نیکی اور پوچھ پوچھ، سب یونیفارم تبدیل کرنے اندر بھاگ گئے۔“

☆☆☆

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ شک ایک ناگ کی طرح ہوتا ہے جو آپ کی ہر خوشی کو ڈس لیتا ہے اور فکر آج کے دن کی چمکتی سنہری دھوپ پر آنے والے کل کے کالے بادلوں کے سائے پھیلا دیتی ہے۔ تنہا کڑھتے کڑھتے گویا وہ تھکنے لگی تھی۔ اس کا دل ایک ناسور بنا جا رہا تھا جو بس ہنسنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔

عمر اور عروسہ کی چھیڑ چھاڑ بے تکلفی پہلے کی طرح قائم دائم تھی۔ عشوہ سے اب یہ رنکین منظر دیکھے نہیں جاتے تھے۔

عشوہ صحن میں آکر تازہ ہوا کے لیے بیٹھ گئی تھی، جب برابر والے گھر سے غوفیہ باہی آئیں۔ بڑے دنوں بعد انہوں نے چکر لگایا تھا۔ وہ کچھ ابھی الجھی سی لگ رہی تھیں۔ ایسے ہی باتوں کے دوران انہوں نے دبی آوازیں عشوہ سے کہا۔

”عروسہ کی کہیں بات واد چلاؤ۔ یہ نہ ہو پانی سر سے اونچا ہو جائے اور تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے۔“

”جی! وہ ساکت رہ گئی تھی۔“

”پرانی لڑکی کی ذمہ داری بہت بھاری ہوتی ہے۔ مجھے عروسہ کے رنگ و دھنک ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ غوفیہ باہی بولے جا رہی تھیں۔

”کیا غوفیہ باہی بھی عمر اور عروسہ کے متعلق سن گن پا چکی ہیں۔“ اس کا دل گویا دھک سے رہ گیا تھا۔

اور یہی بات بہت واضح اور صاف لفظوں میں ماسی نے بھی گویا عشوہ کے منہ پر دے ماری تھی۔ ماسی کو ان دنوں عشوہ نے کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے رکھا تھا۔ پورے محلے کا کام کرتی تھی۔ بھابھی بیگم کی صفائی سنبھالنی بھی کرتی تھی۔ بلکہ زیادہ قیام اس کا بھابھی بیگم کے گھر میں ہی ہوا تھا۔ بیوہ عورت تھی اور بے اولاد بھی۔ بھابھی بیگم بلا کی خدا ترس خاتون تھیں۔ انہوں نے اسے ٹھکانہ فراہم کر دیا تھا۔

بات کچھ یوں ہوئی۔ عروسہ معمول کی طرح عمر کے کندھے سے لٹکی نہ جانے کیا فرمائش کر رہی تھی۔ پہلے پہل تو عمر انہیں رہا تھا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر عروسہ کو لیے باہر نکل گیا۔ حالانکہ ایمین نے بھی ساتھ جانے کے لیے ضد کی تھی، مگر عمر نے اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

”ہوم ورک کرو آرام سے بیٹھ کر۔ میں آکر تم تینوں کا ٹیسٹ لوں گا۔ جو تیار کی رہی ہے کرلو۔“

”وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا تھا اور عروسہ بھی اس کے پیچھے فلاپس بھرتی بھاگ گئی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر عشوہ کی آنکھوں میں دھواں بھر گیا۔

”عشوہ بیٹی! ایک بات کہو؟“ ماسی نے سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”بولو ماسی! عشوہ کو اندازہ نہیں تھا۔ ماسی کو ان دنوں دھماکا لگا۔ وہ اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہ دیتی۔ وہ یوں تو اس سے رہنے نہ اڑا کر جاتی۔

”بیٹی! اپنی عروسہ بننا تو مجھاؤ، وہ جو کر رہی ہے ٹھیک نہیں۔“

”کیا کر رہی ہے؟“ عشوہ چونک گئی۔

”بننا! منہ چھوٹا ہے، بات بڑی ہے۔“ ماسی تذبذب کا شکار تھی۔ عشوہ کے گویا پورے وجود میں بے چینیاں اتر گئی تھیں۔

”ماسی! بولو بھی۔“ اس نے دھڑکنے والے دل کے ساتھ بوجھا۔

”بننا! عروسہ کو کوہا بہ سب ٹھیک نہیں۔ میں نے خود عمر باؤ کے ساتھ عروسہ کو بہت دفعہ گاڑی میں بیٹھ کر آتے جاتے دیکھا ہے۔ کالج یونیفارم میں۔ عروسہ کی عمر کچی ہے، ماں، باپ کا سانس نہیں۔ بہتر یہی ہے تم ابھی سے سنبھال لو۔ معاملہ بگڑ گیا تو ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔“ ماسی تو چلی گئی تھی، مگر عشوہ کو گویا جیسے جی تار ماری۔

”عمر اور عروسہ۔۔۔ چھپ چھپ کر ملنا ملانا۔ کالج یونیفارم میں، یعنی وہ کالج کے بہانے عمر کے ساتھ چلی جاتی ہے، اور عمر کو دیکھو! میری ناک کے نیچے کون کون سے ڈرائے ترتیب دیے جا رہے ہیں۔ اور میں ابھی تک خاموش ہوں۔ کیا مجھے کسی بڑے نقصان کا انتظار ہے؟ میرے ہونٹ کب کھلیں گے، جب کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آگیا؟“ وہ گویا سن ہوتے دماغ کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ اور اس کے کانوں میں بھابھی بیگم، غوفیہ باہی اور ماسی کی آوازیں گویا پھٹکا ہوا سیمہ بنی اتر رہی تھیں۔

”عروسہ، اور عمر۔۔۔ ان کے میل جول، ملاقاتیں۔۔۔“

”نہیں! میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی، چاہے مجھے اپنی جان کی بازی کیوں نہ لگانا پڑے۔ میں اپنا گھر اجڑنے نہیں دوں گی، بلکہ اس ناگن کا سر چل کر اسے مار ڈالوں گی۔“

وہ گویا دیکھتے انگاروں پر رنگے پیر چل رہی تھی۔ اب تو شک نہ رہتا تھا۔ ماسی نے اس کے سین پر ہاتھ رکھ رکھا تھا۔ اور اسے بھی صرف عمر کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ پچھلے دو دنوں سے آس کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا۔ اور عشوہ گویا ایک پل گن گن کر گزار رہی تھی۔ نہ جانے نیند میں کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ بے قراری اس حد تک بڑھی تھی کہ دوبارہ نیند مرمان ہی نہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر کنگے پیر پیر میں آگئی۔ دو گلاس پانی پی کر کچھ دیر کے لیے وہ لاؤنج میں شیشی رہی، پھر بچوں کے کمرے میں جھانکنے لگی۔ وہ بیٹوں ہی بے خبر سو رہی تھیں۔ برابر میں عروسہ کا کمر تھا۔ کچھ سوچ کر وہ اس

کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہو گئی۔
دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ عروسہ کی آواز بالکل صاف
انداز میں اس کی سماعت میں اتر رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی عمو! اگر آپ نے میرے
ساتھ شادی نہیں کرنی تو صاف بتا دیں۔ میں آپ کی
والہی تک کا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے دنیا کی کوئی پروا
نہیں۔ ہم اسی بیٹے نکاح کر لیں گے۔ میں آپ سے
کہہ بھی رہی تھی کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ ہم شہر
سے باہر نکاح کر لیتے۔“ عروسہ کی بھرائی آواز میں غصے
کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

”دنیا والوں کی پروا کریں گے تو ہمارے دل حقیقی
خوشی سے دور ہو جائیں گے۔ میں آپ سے محبت کرتی
ہوں اور آپ بھی مجھ سے محبت کے دعوے دار ہیں تو
پھر لوگوں کی طرف مت دیکھیں۔“

عروسہ گویا سسک اٹھی تھی۔ عشوہ سے مزید سننا
دشوار ہو گیا۔ اس کی سانس دھونکی کی مانند چل رہی
تھی۔ سر سے لے کر پیروں تک وجود پسینے سے شرابور
تھا۔

”آپ بھی مجھ سے محبت کے دعویدار ہیں عمو!“
عشوہ زندہ نہیں تھی۔ ان چند لفظوں کے کوٹوں
نے اسے مار ڈالا تھا۔ عمر اس سے محبت نہیں کرتا تھا،
مگر وہ اس کے مزاج کے ہر رنگ سے سمجھوتا کیے
ہوئے تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ عمر کی محبت میں اوائل
عمری سے ہی مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ عمر کو چاہتی تھی بے
حد و حساب۔ اسی لیے تو اس نے اپنی ذات کو اس گھر کی
خاطر مٹا دیا تھا۔ عمر سے وابستہ ہر رشتے سے محبت کی
تھی۔ مگر عمر نے ہلاک مقام پر اسے دھوکا دیا تھا؟

اگر وہ کسی دوسری عورت کو پکڑ کر لے آتا اور یہ
تعارف کروا کر کہ وہ عمر کی بیوی ہے تو عشوہ کبھی ”اف“
تک منہ سے نہ نکالتی۔ مگر جسے اپنے ہاتھوں سے
پروان چڑھایا تھا۔ اسے عمر کے برابر کھڑے دیکھنے کا اس
میں حوصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے صبر اور
برداشت کے اسباق یاد کرنا چاہتی تھی، مگر عروسہ کی
آواز کو ایسا لمحہ بھر میں اسے لولہاں کر دیتی۔

”نہیں عروسہ! تم نے اچھا نہیں کیا۔ یوں کسی کے
بیٹھ میں خنجر نہیں گونجتے۔ میں ظالم نہیں بننا چاہتی۔
مگر تم نے مجھے ظلم کرنے پر اکسایا ہے۔“ وہ اندر ہی
اندر گویا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مگر ایک بھی
آنسو اس کی آنکھ سے نہیں گر پایا تھا۔ اس بھانک
رات کا اختتام ہو ہی گیا تھا اور اسے جس صبح کا انتظار
تھا۔ وہ اس کے آنگن میں اتر آئی تھی۔ عمر نے اس گھر
میں قدم رکھا تو جیسے وہ فینڈے جاگ اٹھی۔ جالا نڈہ وہ
سوئی کہاں تھی۔ بس بے خبری میں ماری گئی تھی۔
وہ عمر کے کمرے میں آنے کا انتظار کرتی رہی تھی۔
مگر عمر بیڈ روم میں آنا گویا بھول گیا تھا۔ عشوہ کو اٹھ کر
باہر نکلتا ہی پڑا۔ وہ سیدھا عروسہ کے کمرے میں چلا گیا
تھا۔ عشوہ پھر سے لولہاں ہو گئی۔

”میں مرجاؤں گی میں نہیں رہ سکتی میں محبت کرتی
ہوں۔ اور محبت کرنا جرم نہیں۔ مجھے کسی کی پروا
نہیں۔ مجھے اپنے دل کی خوشی چاہیے۔“ عروسہ عمر کے
کندھے سے گلی سسک رہی تھی اور عمر اس کے بال
سہلا رہا تھا۔ عشوہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پاتی تھی۔ تاہم
اس کی آواز نے عشوہ کے پیروں تلے انگارے بچھا
دیے۔

”تم فکر مت کرو، پلیز عروس! مت رویا کرو،
تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ خود کو سنبھالو،
یہ کیا بچنا ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے، مجھے عمر چاہیے۔“ وہ
بچوں کی طرح بچل رہی تھی۔ عشوہ کی شریان گویا پھٹنے
کے قریب پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی ناخنیں گھسیٹتے ہوئے
بشکل اپنے کمرے میں آئی تھی، جب الجھا الجھا عمر
بھی بیڈ روم میں داخل ہوا۔



”السلام علیکم!“ وہ ٹائی کی ناٹ کھول کر صوفے پر
ڈھے گیا تھا۔ وہ سفر سے اتنا تھکا نہیں آیا تھا، جس قدر
ایک بے نام سی پریشانی نے اسے تھکا ڈالا تھا۔
”کچھ چائے دو، یہ وہلا دو، سر میں شدید درد ہے۔“ عمر

اپنی کپٹیاں دیا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے
چلا گیا۔ جب واپس آیا تو عشوہ کو ہنوز کھڑے دیکھ کر
حیران رہ گیا۔

”کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ، طبیعت تو ٹھیک ہے؟
بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں، تمہارے دن بھی
تو قریب ہیں، بلکہ یہی کچھ کتنی کے دن۔“ وہ بولتے
ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔
”خیر تو ہے؟“

”میری ناک تلے کون سا کھیل رچا رکھا ہے؟ مجھے
پاگل، احمق اور بے وقوف سمجھتے ہو کیا؟“ عشوہ ایک
دم گویا ضبط کی تمام تر طاقتیں چھوڑ بیٹھی تھی۔

”شرم نہیں آتی عشق کے کھیل رچاتے ہوئے؟
گھٹیا آدمی! اپنے مرتے اور مقام کو ہی دیکھ لیتے۔
عروسہ تمہاری بیٹی سے کچھ ہی بڑی ہے۔“ وہ اس کا
گرہیاں پکڑ کر پیچ رہی تھی۔

”خوتم دونوں سوچ رہے ہو پلان کر رہے ہو میں وہ
سب کچھ نہیں ہونے دوں گی، اپنی جان ہار دوں گی، مگر
تمہیں عروسہ سے نکاح نہیں کرنے دوں گی۔ بے حیا
آدمی! انقب لگانے کے لیے اپنا ہی گھر ملا تھا؟“
پٹلنے۔ عشوہ کے لبوں پر گویا اس پھڑنے
قفل لگا دیا تھا، مگر دوسرے ہی پل یہ قفل خود بخود ترخ
گیا۔

”مارو، اور مارو مجھے۔ جتنا چاہو مارو، مگر میں ساری
دنیا کو جیت کر اٹھا کر لوں گی، تمہارا ایک ایک کر تو ت
دکھاؤں گی۔“

”بکواس بند کرو عشوہ!“ عمر کی دم دبا ڈالا۔
”تم مجھے خاموش نہیں کروا سکتے۔“ وہ زہر خند
ہوئی۔

”تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟“ عمر حد درجہ مشتعل
ہو گیا تھا۔

”میں نے تمہارے کردار کو ایک نظارہ دیکھ
لیا ہے۔ مجھے کراہیت آ رہی ہے، تمہارے وجود
سے۔“ عشوہ کے ہونٹ گویا زہر اکڑو ہو گئے۔
”تم جو کچھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تمہیں

بتاتا ہوں احمق عورت!“ وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا، مگر چپ
ہو گیا۔

”مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے، میں عروسہ کو
اس گھر میں رہنے نہیں دوں گی۔“ وہ اپنے حواسوں میں
کہاں تھی۔ عمر کی آنکھیں ابورنگ ہو گئیں۔

”یہ گھر عروسہ کا بھی ہے، تم اسے یہاں سے کیسے
نکال سکتی ہو؟“ اس کے الزام در الزام نے گویا عمر کو بھی
حد درجہ آگ بگولا کر دیا تھا۔

”یہ گھر میرا ہے۔“ وہ پھنکاری۔
”کیا چیزیں لائی تھیں؟ یہاں گھر ہے، یعنی میرا
اور عروسہ کل تم کوں ہوئی ہو اسے گھر سے نکالنے
والی؟“ عمر کے طنزیہ انداز نے اسے اور بھی گھائل
کر دیا۔

”یہ میرا گھر نہیں؟“ وہ صدے کی شدت سے پھٹی
پھٹی آواز میں بولی۔
”نہیں۔“ عمر کھائی سے گویا ہوا۔

”تو پندرہ سال میں نے ایسے ہی گزار دیے، اس گھر
کی خاطر اپنی ہر خوشی اور ہر سکون کو تیاگ دیا۔ یہ پھر
بھی میرا نہیں، تو پھر میں یہاں کیوں ہوں؟“ وہ اس کی
شرٹ پکڑے اپنے حواس چھوڑ بیٹھی تھی۔

”تو دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ عمر چیخا۔
”نہ کہ تم آرام سے شادیانے بجاؤ؟“ وہ غصے میں
تہذیب، تمیز سب بھول چکی تھی۔

”عشوہ!“ عمر چلایا۔ ”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔
عروسہ کے بارے میں ایک بھی نازبالیف مت منہ سے
نکالنا۔“

”تم دونوں غلط اور بے غیرت ہو۔ خود غرضی تم
دونوں کے خون میں رچی ہے۔ یہ میری بد قسمتی تھی جو
میں جان ہی نہیں پاتی۔“

”عشوہ!“ وہ گویا خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا تھا۔
”تمہیں شرم نہیں آئی۔ عروسہ سے محبت کے
ڈھونگ رچاتے ہوئے؟ اسے کالج سے لے کر کہاں
غائب ہو جاتے تھے؟ تم جو سمجھ رہے تھے کہ میں کچھ
جان نہیں پاؤں گی، سب بتا چل گیا ہے مجھے تمہارے

گھٹاؤ نے کاموں کا۔ اس کا ذہن گویا ایک نقطہ پر ٹھہر گیا تھا۔
 ”تم دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔“ وہ آگ بگولا ہوا تھا۔
 ”میں خود لعنت بھیج کر جا رہی ہوں تمہارے اس گھر پر۔ نہیں آؤں گی واپس۔ کبھی نہیں۔“ عشوہ اٹھ کر روئے ہوئے ننگے پیر گھر سے نکل آئی تھی۔ غصہ حرام ہوتا ہے، ہوش و حواس سلب کر لیتا تھا۔ غصے نے عشوہ کے حواس پر بھی اپنے نچے کا ڈیرے تھے۔ ورنہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی موجودہ حالت کی طرف ہی غور کرتی۔

جس وقت وہ بھابھی بیگم کے گھر میں داخل ہوئی۔ پورے گھر پر سنائے گا گویا راج تھا۔ نہ جانے سب کہاں تھے۔ ایک لحاظ سے بہتر ہی تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے موقع مل جاتا۔ وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف اگئی تھی، جب گول کمرے سے آتی آواز نے اسے بری طرح سے ٹھنکا دیا۔

عشوہ کو اک پل کے لیے لگا تھا گویا وہ پورے قد سے زمین بوس ہو جائے گی۔ اس قدر زور سے چکر آیا تھا۔ اگر وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو جیچ جڑھے جاتی۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنے حواس مجتمع کر کے کچھ سننے کی کوشش کی تھی۔

”میں شادی کروں گا تو عروسہ سے۔ اگر آپ عمر بھائی سے بات نہیں کریں گی تو مجبوراً مجھے دوسری راہ کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ یعنی میں کورٹ میں ج کر لوں گا۔“ یہ آواز عمر کی تھی۔ عمر اماں کی۔ غوشیہ بانی کا بیٹا، بھابھی بیگم کا پوتا اور نوری کا بڑا بھائی۔

”کس قدر اناؤلا ہو رہا ہے یہ لڑکا۔ ذرا شرم نہیں۔ جوان بہن گھر میں ہے۔ اس کی کہیں بات لے نہیں اور صاحبزادے کو اس سے شادی کی بات نہ کہنی چاہیے۔“ غوشیہ بانی سے خیالات یہی کچھ پرانے قسم۔

اگر دیکھا جائے تو یہ غلط بھی تھا۔ عمر اماں، نوری سے آٹھ سال بڑا تھا۔ ہر سر روزگار تھا۔ شکل و صورت واجبی سی تھی۔ اگر وہ شادی کے لیے اصرار کر رہا تھا تو پھر غوشیہ پانی کو نوری کا معاملہ سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر نوری کی خدا نخواستہ چار پانچ سال تک شادی نہ ہوتی تو اتنی دیر عمر اماں کو بھلائے رکھنا کہاں کا انصاف تھا۔ اسی لیے معاشرے میں برائیاں جنم لیتی ہیں۔ مگر ہم لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ادھر عشوہ کے بدن میں گویا لہو تک باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے الفاظ اس کی کھلیا سوچ اور اس کا شک سب اس کے منہ پر آئے تھے۔

مارے شرمندگی کے اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ عمر سے کہہ آئی تھی۔ وہ سب واپس نہیں پلٹ سکتا تھا۔ اس کے لفظ ہی نہیں وہ خود بھی بے مول ہو گئی تھی۔ خفت، ذلت اور شرم نے اس پر بیک وقت حملہ کر دیا تھا۔

اتنی صاف ستھری واضح اور سامنے کی بات تھی، مگر اس کے ذہن کی کھڑکی کھل ہی نہیں سکی۔ اس کا شک عمر کے ارد گرد ہی کھو مٹا رہا تھا۔

وہ عرفا فائق اور عمر اماں میں فرق سمجھ ہی نہیں پاتی۔

اور اب جو ندامتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ گویا پسینہ پسینہ ہو گئی۔ وہ عمر کا سامنا بھلا کیسے کر پائے گی۔ یہی سوچ اسے مار ڈال رہی تھی۔ جو گندے الفاظ اور مخالفت اس کے منہ سے نکل چکے تھے۔ جو کچھ وہ کہ چکی تھی۔ وہ سب واپس تو نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ ایک تسلی تو یہ تھی کہ عروسہ سے کوئی بھی غلط بات نہیں کی تھی ورنہ تمام عمر اس سے بھلا کیسے نظر ملا کر بات کر سکتی تھی۔

شرمندگی کا بوجھ زیادہ تھا یا پھر بچتا دے کا۔ ایک دم ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ کمر سے اٹھتی بیٹوں نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ اور جب وہ فرش پر گر رہی تھی تب اس نے نوری کی آواز سنی۔

”بی! جلدی آئے عشوہ بھابھی کو دیکھیں۔ ہائے اللہ! یہ تو بے ہوش ہو گئیں۔“ وہ جیج رہی تھی۔ ”انا“ فانا“ سب جمع ہو گئے تھے۔ عشوہ کو بھابھی بیگم، ڈاکٹر کوٹر کے کلینک لے گئی تھیں۔ جہاں اس نے قبل از وقت فجر کے قریب ایک صحت مند سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

شام تک اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ واپسی پر جوں جوں گھر قریب آ رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ گھبراہٹ اور خوف نے حواس معطل کر دیے تھے۔

گاڑی رگ رگ گئی تو بھابھی بیگم نے سارا دے کر اسے باہر نکالا۔ جوں ہی کیراج میں کھڑی عمر کی گاڑی پر ان کی نظر پڑی وہ گویا کھل اٹھیں۔

”خیر سے عمر گھر آیا ہے۔“
 ”عمر رات سے گھر میں ہی موجود ہے، مگر اس نے میرا پیچھا ہی نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں ہوں کہاں؟ گھر سے نکل کر کہاں گئی؟ کدھر گئی؟ نہ میکا تھا نہ سرال اور نہ ہی کوئی عزیز رشتہ دار تھا۔ اس نے بھلا جانا ہی کہاں تھا؟ مگر عمر نے برابر اگلے گھر سے بھی اس کے بارے میں نہیں پوچھا؟“

بھابھی بیگم بچے کو گود میں چھپائے اسے لیے کمرے میں چلی آئیں۔ عمران دونوں کو دیکھ کر ٹھٹھکا نہیں تھا۔ یقیناً ”نوری نے اسے اطلاع دے دی تھی۔ بھابھی بیگم نے اسے بیڈ پر بٹھا کر بچے کو زبردستی عمر کی گود میں دے دیا۔

اسی مل دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ عروسہ اور اس کے پیچھے تین اور گورے گورے چہرے جھانکنے لگے تھے۔

”بیبا! ایمن گویا چیخ اٹھی۔“ یہ کون ہے؟“
 ”ایمن کا بھائی۔“ عمر گویا کھل کر مسکرایا۔
 ”صرف ایمن کا بھائی۔“ عمیمہ اور عوبیہ چیخیں۔ غوشی گویا ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔
 ”یہ تو پورا میرے جیسا ہے۔ ناک، آنکھیں اور

ہونٹ بھی۔“ چھوٹا سا گڈا اب عروسہ کی گود میں منتقل ہو گیا تھا۔

”جی نہیں! میرے جیسا ہے۔“ ایمن چیخیں۔
 ”شور نہیں کرو بیبا! تمہاری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بھائی کو گود میں اٹھانا ہے تو اسے باہر لے آؤ۔ میں غوشیہ سے کہتی ہوں۔ عشوہ کے لیے یعنی بیٹا لائے۔“ بھابھی بیگم بچوں کو لے کر باہر نکل گئی تھیں۔ عروسہ بھانگی ہوئی اس تک آئی۔

”عشوہ بھابھی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ عمر کے ساتھ شادی کا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں تو اپنے اس چھوٹے سے گڈے کے ساتھ شادی کروں گی۔“ وہ اس سے بے ساختہ پلٹ گئی تھی۔ بڑا ہی مصصوبانہ قسم کا انداز تھا۔ عمر پاس ہی کھڑا تھا۔ اس موقع پر بھی طنز کرنے سے باز نہیں آیا۔

”اور جس کے نام کی وجہ سے فساد مچا ہوا ہے اس کو کدھر جانا ہے؟“

”بھائی مل جائے۔ جب غوشیہ آئی نہیں مان رہیں تو پھر مجھے بھی ان چاہا بن کر جانے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ناک چڑھا کر اپنے ہنوز پرانے انداز میں کہا تھا۔ ”یہ تو عمر میرے پیچھے پڑا تھا اور پھر مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔“

”تنی عقل کہاں سے خریدی ہے؟“ عمر نے پھر سے طنز کیا۔

”عمر بھائی! اس خوشی کے موقع پر تو بخش دیں۔“ عروسہ کھکھلاتے ہوئے بولی۔ ”دیسے بھی سارا دن کچھ نہیں کھایا اتنا پریشان رہے۔“

”اور جو بھابھی بیگم کے گھر سے بریانی آئی تھی وہ کہاں گئی؟“

”وہ ہم سب کے پیٹ میں۔ ویسے بھابھی! جلدی ٹھیک ہونے کی کوشش کریں۔ عمیمہ کی کوکنک اتنی بھی اچھی نہیں ہے۔“ عروسہ نے دہائی دی۔
 ”بھابھی! تو تم سے خدمت کرو اگر ہی ایٹھں گی۔“ عمر اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”اور میں بھابھی کی خدمت ضرور کروں گی۔ ہمیں

انتا پارا تحفہ جو دیا ہے۔ ”وہ اس کے گل چوم کر بھاگ گئی تھی۔

وہ دلی ہی دل میں ایک مرتبہ پھر سے اللہ کا شکر ادا کرنے لگی تھی کہ اس نے اسے کم از کم عروسہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا تھا۔ انسان غلط فہمی اور شک کی بنا پر بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ کچھ ایسی غلطیاں جن کا ازالہ ہونا ممکن ہی نہیں ہوا مگر وہ پھر بھی اپنے رحیم رب کی شکر گزار تھی کہ وہ واپس اپنے ٹھکانے پر آچکی تھی۔ واپسی کے راستے کھولے نہیں ہوئے تھے۔ معافی کا ایک در تو کھلا تھا۔

اور وہ اپنے جرم کی سزا کے بعد معافی کی درخواست تھا۔ منتظر تھی مگر سزا سننے والا اس کی طرف متوجہ کہاں تھا اور عشوہ کی ہر ہر دھڑکن منتظر تھی۔ جب بہت دیر خاموشی ہی پونئی رہی۔ عمر نے اس کی طرف نظر نہیں کی تو وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔ اب کے پچھلے عمر نے صرف چونکا تھا، بلکہ اسے کابٹ پر بیٹھنے کی کوشش کرتے دیکھ کر چیخ اٹھا۔

”نیچے کیوں بیٹھ رہی ہو، یہاں بیٹھو۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قریب اس کی جگہ بنائی۔
”میں آپ کے پیروں میں بیٹھ کر معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“ عشوہ نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

”تمہاری جگہ پیروں میں نہیں ہے۔ برابر بیٹھ کر بھی معافی مانگ سکتی ہو۔“ عمر کے الفاظ نے گویا اسے گنگ کر دیا تھا۔ اس کا لہجہ اور انداز دونوں بلا کی نرمی لیے ہوئے تھے۔

”آپ معاف کر دیں گے کیا؟“ وہ کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ پھر کر رہی۔

”کرنا تو نہیں چاہیے، جو کچھ مجھے سنا کر گئی ہو، برداشت سے باہر تھا مگر اب کیا کریں، تم نے تحفہ ہی اتنا اچھا دیا ہے۔ سارے بہتان سارے الزام بھولنا ہی بڑیں گے۔“ عمر نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی مگر سر جھکائے ہوئے۔

”میں نے آپ کے اور عروسہ کے پارے میں بہت

غلط سوچا تھا۔ معافی لفظ بہت چھوٹا ہے، مگر میں پھر بھی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیں، میں نے بہت گندے الفاظ استعمال کیے تھے مگر میں بھی کب کرتی۔ میں بھابھی بیگم، غوغیہ بانی اور باسی کی باتوں نے غلط مفہوم سمجھ کر آپ پر بہتان باندھنے لگی تھی۔ میں نے سوچا ہی نہیں کہ ایک اور عمر بھی ہمارے برابر والے گھر میں رہتا ہے۔“

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ابھی اسے مزید ستانا چاہتا تھا، مگر اس کے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر اس کا دل پتھک گیا۔

”اٹس اوکے عشوہ! اب رونادھونا چھوڑو۔ تمہاری صحت کے لیے بہتر بھی نہیں۔ دکھ تو مجھے بہت ہوا تھا۔ عروسہ جو میرے لیے عمیمہ کی طرح ہے، بلکہ میں عمیمہ سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کی مال کی محبتوں کا قرض ہے، جسے میں نے ایک فرض کی طرح نبھانا ہے۔ اور پھر عروسہ کا میرے علاوہ ہے ہی کون؟ اگر میں بھی اسے پار دینے کی کوشش نہ کروں تو پھر میکے اور ماں باپ کے نام پر اس کے پاس کیا بچے گا؟ وقتی طور پر مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ مگر پھر دھیرے دھیرے خود بخود اتر گیا۔“ عمر نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

”میں نے تمہارے لفظوں میں اور لہجے میں چھپی محبت کو محسوس کیا تو تمہارا غصہ حق بجانب لگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ عمر نے عروسہ کو دھوڑ کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے مگر غوغیہ بھابھی نوری کی وجہ سے ٹال مٹول سے کام لے رہی تھیں۔ عمر کی پسندیدگی جان کر ان کا رویہ عروسہ سے بھی بدل گیا تھا۔ عروسہ ایک دو مرتبہ عمر کے مجبور کرنے پر اس کی بات سننے کے لیے باہر گئی تھی۔ تاہم میں اس بات سے واقف تھا۔ شاید عروسہ بھی اس کی محبت سے متاثر ہو گئی تھی۔ تاہم عمر بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ گھر والے مان نہیں رہے تھے۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ تمام معاملات خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں۔ عمر اور عروسہ کا معاملہ سیدھا کرتے کرتے میری اپنی ناؤ ڈوبنے

گئی تھی۔ میں اس بات سے قطعاً ناواقف تھا۔ نام کی ممالکت نے جہاں تمہیں ایک ان دیکھی آگ میں جلایا ہے وہیں مجھے بھی خبر ہو چکی ہے کہ مجھے سنبھل کر رہی رہنا پڑے گا۔ کبھی دوسری شادی کے بارے میں ہرگز بھی نہ سوچوں ورنہ تم تو میری اور اپنی جان ایک کر دو گی۔“ عمر نے شرارت سے اسے دیکھا۔

عمر کی اس وضاحت سے بھی پہلے عشوہ پھول کی طرح۔ ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ تمام تہہ گمانی کے باہل چھٹ گئے تھے۔ وہ جو زندگی سے ہی مایوس ہو چلی تھی، اپنی زہریلی سوچوں سے نجات پا کر پھر سے گویا تروتازہ ہو گئی۔

”آپ اگر مجھے بھی عروسہ اور عمر کا معاملہ بتا دیتے تو میں اتنے دن انگاروں پر نہ سوئی۔“
”تنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟“ عمر نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

”میری محبت پر شک ہے؟“
”اب تو بالکل جچی نہیں۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”آپ نے کبھی مجھ پر اعتبار کیا ہی نہیں۔ اپنا سمجھا ہی نہیں۔ نہ عزت دی ہے نہ محبت۔ اگر ہمارے درمیان اتنے فاصلے نہ ہوتے تو عروسہ اور عمر کی بات آپ کے توسط سے ہی سہی مجھ تک ضرور پہنچتی۔“ وہ شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”یہ ایک الزام ہے مجھ پر۔ محبت اور عزت کے بغیر پندرہ سال گزار دیے ہیں کیا؟ پاگل! محبت محبت۔“ لاپنے سے محبت زیادہ ہو جاتی ہے کیا؟ رویہ احساس خیال اور پیار کا رشتہ محبت کو واضح نہیں کرتا؟ میرا تم سے ایک مضبوط تعلق ہے۔ میری اوائلی عمری کے دنوں کی ساتھی ہو۔ میرے بچوں کی ماں ہو۔ پہلی اور آخری بیوی ہو۔ اس کے علاوہ محبت کے کون کون سے ثبوت چاہتی ہو؟“ وہ اس کے ہاتھ نرمی سے پھینکتا کر بولا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی بھڑاس مجھ پر نکال کر اپنا دل صاف کر چکی ہو۔ اگر عروسہ تک تمہارے خیالات

کی ذرا بھی بھٹک بڑ جاتی تو پھر تم نے میرے اس قدر قریب ہرگز نہیں بیٹھے ہوتا تھا۔“
”تو پھر میں نے کہاں جانا تھا؟“ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے لگی۔

”رہنا تو پاس ہی تھا مگر دور۔“ یعنی میں اپنا بیڈ روم الگ کر لیتا۔“
”کیا سچی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ میں عروسہ سے کبھی تمام عمر نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ میری بہن ہی نہیں، مجھے اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اور میں شرمندگی کے اس بوجھ کو اٹھانے سے قاصر ہو جاتا۔ اب تمہارے چہرے پر ہوا میاں کیوں اڑ رہی ہیں۔ ایسا کچھ ہوا تو نہیں، سو غم نہ کھاؤ، بلکہ خوشی مناؤ۔ اللہ نے تمہارے من کی مراد پوری کی ہے۔ ارے! وہ ہے کہاں؟ یہ ایمن اور عروسہ اس کا کچھ مر نکال دیں گی۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔ تم اتنے میں نام سوچ رکھو۔“

عمر گویا سر پر ہاتھ رکھ کر کھانکھاتا تھا۔ عروسہ اور ایمن کی لڑائی ہو رہی تھی۔ دونوں ہی ایک ساتھ بچے کو اٹھانا چاہتی تھیں اور بھابھی بیگم ان دونوں کو بچہ نہیں دے رہی تھیں۔

عشوہ ان کی کھٹی میٹھی لڑائی سن کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے دل کے سارے بوجھ خود، خود ہٹ گئے تھے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ عمر جیسے انارست نے عشوہ کی گفتگو بلکہ نازبا ترین لڑائی کو اتنا کامیاب نہیں بنایا تھا۔ شاید اتنی بڑی خوشی کے طفیل اس کی ہر غلطی کو وہ درگزر کر گیا تھا۔ جو بھی تھا، عشوہ کا دل اور گھر ٹوٹنے سے بچ گیا تھا۔ وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی کہ تھا۔ اس کے دل کی ہر پھاس نکل گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ وہ غوغیہ پانچ اور بھابھی بیگم کے دل کی جھین بھی دور کر دے گی۔

اسی شام برابر والے گھر سے مضافی کے نوکروں سمیت بھابھی بیگم اور غوغیہ بابی آئی تھیں، عمر کے لیے عروسہ کا ہاتھ مانگنے۔ عشوہ نے غور کیا تو اسے احساس ہوا، بظاہر غوغیہ باجی عمر کے مجبور کرنے پر آؤ

گئی تھیں، مگر نوری کے حوالے سے ان کے تفکرات ہنوز قائم تھے۔ شاید وہ اس بات سے خوف زدہ تھیں کہ کماؤ بیٹے کی شادی ہو گئی تو ان کی بیٹیوں کا بھلا کیا بنے گا؟

سو عشوہ نے ان کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے ایک فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ بھابھی بیگم سے بڑی محبت سے کہہ رہی تھی۔

”میں فائق کے لیے نوری کا رشتہ باقاعدہ طور پر مانگنے کے لیے آؤں گی، مگر ابھی آپ اگر چاہیں تو وہاں کر دیں۔ تاکہ میں بے قرار بیٹھے اپنے پردیسی بھائی کو خوش خبری سنوں۔ وہ بس کل کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہا ہے۔“

ادھر غوغیہ بابی اور بھابھی بیگم کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ مارے خوشی کے ان سے بولا نہیں گیا۔ نوری کے رشتے کی بات طے ہوتے ہی ان کا رویہ عروسہ سے بے حد اچھا ہو گیا تھا۔ ادھر عمر بھابھی بیگم سے نہ جانے کس بحث میں مصروف تھا۔

”بھابھی بیگم! کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ اس گاؤں کی کانام آپ کچھ دور رکھ لیتیں۔ یہاں تو اس گھونچو کے نام کی وجہ سے بڑے بڑے فساد اور طوفان اٹھتے اٹھتے رہ گئے ہیں۔“ بھابھی بیگم ایک جیسے نام رکھنے کی وجہ تسمیہ بتانے لگیں۔

”ہم نے سوچا نام کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کلثوم کا بھانجا خوب صورت بھی ہے اور لائق بھی۔ پوتے کی پیدائش سے پہلے ہی عمر انام نام میں نے سوچ لیا تھا۔ تاکہ یہ کچھ نہ کچھ کلثوم کے بھانجے پر پڑے۔ شکل نہ سہی، دائر تو اس نے تمہارے جیسا ہی لیا ہے۔“ انہوں نے رجوش انداز میں کہا۔

”پاپا! تو پھر ہم بھائی کانام بھی عمر جو نیچر رکھ لیتے ہیں۔“ ایمن نے بہت تپے کی بات کی تھی۔ عروسہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلا اٹھی۔

”عمر عمر اور عمر کی گردان ہم سے نہیں ہوتی خبردار! جو کسی نے عمر نام رکھنے کی کوشش کی۔“
”عمر فاروق اور عمر عمران ہی ہماری جان کو کافی ہیں۔“

عشوہ نے بھی ہنستے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ سب سے زیادہ نامندی انداز میں عروسہ نے سر ہلایا۔
”یہ تمہا شہزادہ ہماری خوشیوں کو مکمل کرنے آیا ہے۔ سو اس کا نام ہوا بمشکر کی کو اعتراض تو نہیں؟“ عروسہ نے کھڑے ہو کر گویا اعلان کیا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ اعتراض کیوں ہونے لگا۔ بچے کی اکلوتی پھوپھی ہو، پہلا حق تمہارا ہے۔“ غوغیہ بابی نے دلار سے ہونے والی ہو کا ہاتھ پھینکتا کر کہا تھا۔ سب ہی کو یہ نام پسند آیا تھا۔ اب عروسہ نہ جانے کون کون سے لطفے سا کر انہیں ہنسا رہی تھی۔ لاؤنج میں سے قہقروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھیں۔ عشوہ زرا دیرو کو پکن کا انتظام دیکھنے اٹھ گئی۔ کھانا ہو کل سے منگوایا تھا۔ تاہم وہ پلٹوں میں خود ہی نکالنے لگی۔ بچیوں کی شکفتہ ہنسی کو دل سے محسوس کرتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر مہمان رب کا شکرا ادا کر رہی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میرے ندیم



رضیہ جمیل

مکھانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

قیمت: 275/- روپے

گھٹے سدا رہا

”اب بچھتائے کیا ہوت جب چیزیاں جگ گئیں
کھیت۔“ جواہر پیر زادہ کی آواز پر اس نے جھٹکے سے
جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”کیس اس کینے کو پتا تو نہیں چل گیا کہ میں میٹرک
میں تیسری بار بھی فیل ہو گئی ہوں۔“ ماہوش پیر زادہ
عرف مٹھو نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”گھر میں کسی کو بتایا؟“ جواہر کے ہمدردی سے
پوچھنے پر وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

”وہیے مٹھو! تمہاری مستقل مزاجی کی تو داد دینی
پڑے گی۔ تمہاری جگہ اگر خدا نخواستہ میں ہوتا تو اب
تک ہمت ہار چکا ہوتا۔ اب تو خیر سے ”ہیٹ ٹرک“
بھی ہو چکی ہے آگے کا کیا ارادہ ہے؟“ جواہر نے
نڈاق اڑایا۔

”ختم ہو گئی تمہاری بکواس؟ دفع ہو جاؤ یہاں
سے۔“ جواہر کے لیوں پر پھینکی دل جلانے والی
مسکراہٹ دیکھ کر وہ چلا اٹھی۔

”وہیے ڈیر کرن! تم دل چھو ٹامت کرو۔ میرے
پاس گھر والوں کو یہ اندوہناک خبر ”ایک بار پھر“ سنانے
کے لیے ایک آئیڈیا ہے۔“

جواہر ہر کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر وہ خود ہی پاؤں پٹخ کر
وہاں سے چل گئی اور اپنے کمرے کا دروازہ دھڑا سے بند
کیا کہ دوسرے کمرے میں استراحت فرماتے دادا
حضور اپنے بستر پر اچھل پڑے۔ شام تک جواہر کی زبانی
یہ خبر سارے گھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی
کہ آٹھ ماہوش پیر زادہ اس بار بھی میٹرک میں شان

دھام سے غلام علی کی حویلی میں دلہن بن کر آئیں اور
چھاگئیں ٹھا کر کے۔

دوسرے ہی دن گھونگھٹ الٹ کر سارے گھر کا
گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ سر صاحب کو حقہ تازہ کر کے دیا
اور دعائیں سمیٹیں۔ سر پر پٹی باندھے سرور کا ہمانہ بنا کر
لیٹی ساس صاحبہ کو چونکے کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا
بلکہ لگے ہاتھوں ان کے لاکھ ناک بھوں چڑھانے کے
باد جو تیل کی شیشی لے کر جی جان سے ماش بھی
کردی۔ آخر کو ”نوادانی“ میں کی گئی ”چوریوں“ کا ازالہ

بھی تو کرنا تھا۔
سرال میں قدم جمانے کے علاوہ مجازی خدا کے
لکھے محبت نامے سینے سے لگا کر رکھتیں اور اٹھ اٹھ کر
ان کے کرتے کی جیبیں جھاڑتی رہتیں کہ خدا نخواستہ
گاؤں کی کسی اور ”ماہ جبینہ“ کو محبت نامے تو نہیں
لکھے جارہے کہ خیر سے محبت کی شادی تھی اور محبت
میں تو لاکھوں وسوسے جان کو چنے رہتے ہیں۔

پورے تین سال بعد ”ماہوش عرف مٹھو“ کی
قلقلاریاں آنکھن میں گونج اٹھیں۔ زہرہ خاتون جو پوتے



کو گود میں کھلانے کا ارمان دل میں لیے بیٹھی تھیں۔ پوتی کی پیدائش پر خاصا دلی صدمہ پہنچا۔ سر پر ”مشہور زمانہ“ پٹی باندھ کر جھوٹے نشین ہو گئیں دو دن بعد پوتی کے چاند چہرے پر اتفاقیہ نظر پڑی تو مارے حیرت کے منہ میں انگلیاں داب لیں۔

”اللہ! ایسا حسین تو ہماری پھیلی سات پشتوں میں بھی کوئی پیدا نہ ہوا۔“

لیک چھک کر گود میں لیا چٹا چٹ بلائیں لے ڈالیں اور مبارک باد کے لیے آنے والی عورتوں کو ٹھونک بجا کر باور کرایا کہ زہرہ خاتون کی پوتی سارے نین نقش وادی کے چر کر لائی ہے۔

سننے والیاں اس قدر غلط بیانی پر دل ہی دل میں بھڑک اٹھیں منہ پرچ کھینے کی نہ تو ہمت تھی اور نہ ہی جرات کہ زہرہ خاتون پلٹ کر جواب دینے والوں کا منہ توڑ دیا کرتی تھیں۔

”ہمورانی! بیڈ میں مٹھائی پائی ہے یا نہیں؟“

لائین کی چٹنی صاف کرتی پونے غور سے ساس کا چہرہ دیکھا سدا کی ہانے باز ساس اس وقت چاند جیسی پوتی کی پیدائش پر واقعی خوش تھیں پونے کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا۔

”میری پوتی ڈاکٹر بنے گی۔“ موچھوں کو تاؤ دیتے دادا حضور نے آواز بلند اعلان کیا۔

”رہنے دو پیر صاحب! ہماری نازک سی پوتی اب مرے جوگیوں کو نیچے ٹھو کا کرے گی؟“

گندم صاف کرتی زہرہ خاتون نے ناک چڑھا کر اعتراض کیا۔

”ارے میری لاڈورانی پو فی سر بنے گی اور اسے میں خود ہی پڑھایا کروں گا۔“

والد بزرگوار کے فخریہ لہجے پر پونے دل تھام لیا۔ پونے کے خالہ زاد بھائی ”سلطان گجر“ کی بیڈ کے اکلوتے نالی شیدے نے غلطی سے موچھیں مونڈ دیں۔ سلطان گجر کے چہرے کے وسیع رقبے پر بڑے طعطران سے پھیلی موچھیں اس کا طرہ امتیاز تھیں۔

اگرچہ ان ہی خطرناک موچھوں کی وجہ سے پورے بیڈ

میں کوئی اسے اپنی بیٹی دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ اپنے چالیس سالہ لندورے ہونے کا اسے خود بھی اچھا خاصا فائق تھا مگر موچھوں سے دست برداری کسی طور کو ارا نہ تھی، ہر چند ماں نے کہا ”پتا اپنے اس جنگل کی تھوڑی سی کانٹ جھانٹ کر لو“ باپ نے ”بد معاش“ نظر آنے کا طعنہ دیا مہنوں نے ترلے کیے لیکن گجر صاحب بچے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

اب جو شیدے نالی نے اس ناممکن کو ممکن کر ڈالا تو گجر کی والدہ اور بہنوں نے شیدے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور مٹھائی کے نوکروں کے ساتھ باضابطہ طور پر شکریہ کہا کہ اب جا کر بیٹے کے سرے کے پھول کھنے کی کچھ امید نہ تھی۔ بہنوں کو تو اپنا ”دیر“ موچھوں کے بغیر ”شان“ جیسا دھننے لگا، لیکن موصوف کا غم و غصہ سے حقہ پانی بند ہو گیا۔

پنڈوالے بوجھ درجوق افسوس کے لیے آئے دادا حضور نے بھی سلطان گجر کی دل جوئی کرنے کے لیے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

”پاگل واپتر ہے“ زبانیوں کی طرح رو رہا ہے۔ گھری کھیتی ہے پھر آگ آئے گی۔ برپھو انا تم لگے گا۔“

سر پر پگڑی باندھی ”آئینے کے سامنے کافی دیر تک کھڑے ہو کر بڑے پیار سے موچھوں کو سنوارتے رہے“ سچ ہے بھی موچھ نہیں تو کچھ نہیں۔ ”آئینہ کے سامنے دو شین“ ”خطرناک“ قسم کے قہقہے لگائے اور دھوئی سنہالتے رخصت ہو گئے۔

تھوڑے دنوں کے اندر

کے ساتھ دایہی ہوئی پتا چلا کہ سلطان گجر نے ان سے ملنے سے صاف انکار کر دیا کہ ان کی سدا بہار موچھوں کو دیکھ کر اسے اپنا نقصان اور شدت سے یاد آ جاتا تو کبھی سڑی ہڈیوں میں مارے غصے کے خون جوش مارنے لگا۔ ”بات سنیں پیر صاحب! قسمت خراب تھی زہرہ خاتون کی جو پھیرے ہوئے شیر کو چھڑ بیٹھیں۔“

”ہزار واری کہا ہے تجھ سے، تجھے خالی خولی پیر صاحب نہ کہا کہ۔ پیر کے ساتھ ”زادہ“ لگاتے ہوئے تجھے موت پڑتی ہے۔ جب تو مجھ سے صاحب کہتے

تو آنکھوں کے سامنے گلے میں ملا ڈالے جھاڑ جھنکار چلے والا ”پیر خلتو“ گھوم جاتا ہے۔“

نازک سی جان اتنا قصہ برداشت نہ کر سکی، چار پارٹی پڑھ کر ہوا کر پانے لگی۔

کرم علی پیر زادہ کے باپ دادا چھری چاقو تیز کرنے کا کام کیا کرتے تھے، اور پورے بیڈ میں ”چھری والے“ کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ لیکن کرم علی کو یہ لقب کچھ خاص پسند نہ تھا ایک دن فرصت سے تمام ذاتوں کے بارے میں غورو خوش کیا اور ”پیر زادہ“ پر دل و جان سے فدا ہو گئے۔ یہ لقب انہیں اپنے شایان شان لگا۔ بس تب سے پورے بیڈ میں ہانگ دہل اعلان کیا کہ انہیں ”کرم علی پیر زادہ“ کے نام سے پکارا جائے۔ اگر کسی نے غلطی سے بھی ”چھری والا“ کہا تو وہی خاندانی چھری پیٹ میں گھونپ دی جائے گی۔ زور زبوتی سے ہی سہی پر اب وہ پیر زادہ ہی تھے۔ لیکن براہوزہرہ خاتون کا کہ پیر زادہ ان کی زبان پر آئے نہ دیتا۔ بقول ان کے مجازی خدا کو پیر زادہ کہتے ہوئے انہیں ہنسی آ جاتی ہے۔

ڈیوڑھی سے آئی ساجدہ آپا نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے پیر صاحب کو زہرہ خاتون پر برستے ہوئے دیکھا تو جھوم اٹھیں۔

”اب آیا اونٹ بھاڑ کے نیچے۔“

زہرہ خاتون کی نظر سفید ٹوٹی والا قریع سر پہ نکائے لطف اندوز ہوتی ساجدہ آپا پر بڑی دلدل ٹوٹے ٹوٹے ہو گیا۔ فوراً ”سے پیشتر سر پہ پٹی باندھی اور آنکھیں موند کر سوتی بن گئیں۔“



مٹھو نے خیر سے باج جماعتیں پاس کیں تو بیڈ کے اکلوتے اسکول کے اکلوتے ماسٹر نے کلمہ شکر ادا کیا کہ کیا۔ گلی گلی بازار کیا گھر کیا اسکول مٹھو کے والد اور دادا حضور اس کی تعلیمی کارگردگی سے باخبر رہنے کے لیے ماسٹر صاحب کا چچا بھی بچہ لیتے اور زبوتی اگلا کر دم لیتے کہ ”مٹھو پڑھائی میں بہت اچھی جا رہی ہے۔“

ماسٹر صاحب کا دل تو چاہتا ”انہیں کھری کھری سناویں کہ مٹھو ابھی برا کمری میں ہی پڑھ رہی ہے نہ کہ لی اسے کر رہی ہے۔ لیکن ایک تو بے چارے کو دادا حضور کی موچھوں سے بڑا ڈر لگتا اور دوسرا بھی موچھوں ہی سے ڈر لگتا۔“

اب مٹھو کی مزید تعلیم کے لیے شرمیں داخلہ لینے کا مسئلہ زور غور تھا۔

”مٹھو کے ساتھ شرمیں جاؤں گا۔“ دادا حضور نے حقہ گرگڑاتے ہوئے کہا۔

”سین! جی! آپ کے بغیر میں بھلا یہاں کیا کروں گی؟“ دوپٹے کا ٹونا مروڑتے ہوئے زہرہ خاتون نے لجا کر کہا تو دادا حضور کمال بے نیازی سے گویا ہوئے۔

”جھاٹھک ہے۔ تو بھی میرے ساتھ ہی چل۔“

”لیکن مٹھو کو میرے بغیر نیند نہیں آتی ہے“ وہ سوئے گی کس کے ساتھ؟“ پونے کے رقت آمیز لہجے پر ان کا دل پیچ پیچ گیا۔

”اوپے جھلی! تو بھی ہمارے ساتھ ہی چلی جا۔“

موچھوں کو تاؤ دیتے دادا حضور نے ہمورانی کو تسلی دی۔

”لیکن مٹھو کے ابا...؟“ تذبذب سے سرتاج کی طرف دیکھا۔

”تو میں بھی تو تم لوگوں کے ساتھ ہی چل رہا ہوں، میں نے یہاں اکیلے رہ کر بھلا کی کرنا ہے؟“ سرتاج نے زوجہ محترمہ کی دل جوئی کی۔ تو ساس بہو مل کر سامان باندھنے کے لیے اٹھ گئیں۔

”میرا حقہ بھی رکھ چھوڑیں۔“ دادا حضور نے یاد دہانی کروائی۔

”رکھوں یا چھوڑ دوں؟“ زہرہ خاتون نے دوبارہ پوچھا۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

”ایک تو پیر صاحب۔“

”کیا کہا تو نے ابھی؟“ دادا حضور خالی خولی پیر صاحب سن کر ڈیوڑھی سے پلٹ کر گر جے اب کی بار زہرہ خاتون نے ان کی دھاربان سنی کہ وہی کہ انہیں شہر

وادی کی خوش فہمی پر جواہر کو ہنسی آگئی۔ ”مٹھو اور پروفیسر! ہا ہا۔“

ایک ہی طرز پر بنے دو پورشن والا گھر سب کو بہت پسند آیا۔ دو سرا پورشن جہاں پہلے کرایہ دار مقیم تھے ان لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ درمیان میں صرف ڈم ڈم کی باڑھ تھی اور کمروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

مٹھو کا داخلہ شہر کے بہترین اسکول میں کر دیا گیا۔ اور وہ روپیٹ کر بلا آخر میٹرک میں پہنچ ہی گئی۔ بد قسمتی سے مٹھو صاحبہ کا دل پڑھائی سے زیادہ نٹ نٹ فیشن کرنے اور ٹی وی ڈرامے دیکھنے میں لگتا۔

زہرہ خاتون کو یہی غم کھائے جاتا کہ ان کی پوتی بے چاری سارا دن ”کتاب“ میں سر دیے بیٹھی رہتی ہے پھر بھی ٹیل ہو جاتی ہے، بھولی وادی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ پوتی صاحبہ کورس کی کتابوں میں رسالے چسپا کر پڑھتی رہتی ہے۔ دادا حضور کا شک یقین میں بدل گیا کہ

اسکول کی ناخلف استانی ان کی پوتی سے کوئی پرانی دشمنی چکار رہی ہے۔ گستاخ استانی کا سر فلم کرنے پر تل گئے۔ جھٹکل ”خاندانی غصہ“ ٹھنڈا کر دیا گیا۔ البتہ والد بزرگوار کی امیدوں کا چین ابھی تک ہرا بھرا تھا، تین بار ٹیل ہوئے تھے باوجود بھی لاڈ سے ”پروفیسر رانی“ کہا کرتے

آخرید رانہ محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

”مٹھو! تیرا دادا کہاں ہے؟“ زہرہ خاتون نے ٹی وی دیکھتی پوتی سے پوچھا۔

”ان کی نانی اماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی رات میں انہیں پوچھئے گئے ہیں۔“ پوتی کا جواب سن کر زہرہ خاتون کے دل میں بھانجھ بھل اٹھی۔

جواہر کی نوکری لگنے کی خوشی میں شینہ بیگم نے ایک ساتھ مٹھائی کے کئی ڈبے منگوا کر رکھ دیے تاکہ مبارک باد دینے والوں کا منہ میٹھا کروا سکیں۔ رات کے

کچھ پہر نانی اماں کی آنکھ کھلی سپانی بننے کے لیے کچن میں گئیں تو نظر مٹھائی کے ڈبوں پر چپک گئی اور اندھا دھند مٹھائی کھا رہے ہوئے یہ بھول گئیں کہ ”چیز رانی“ لیکن پیٹ تو اپنا ہے ”نتیجتاً“ ساری رات ٹوا ٹکٹ

سرتاج کا خون کھول اٹھا۔ زہرہ خاتون کی فطرتی ہول موچھوں پر بڑی تو غصے کی شدت کا اندازہ ہوا، فوراً سے پشیمناڑو چھوڑ دیا۔

گلابی شام کے تمام رنگ اس چھوٹے سے آنگن میں اتر آئے۔ شینہ بیگم نے چائے براجمھا خاصا اہلہ کر ڈالا، کچھ چیزیں جواہر بیگم سے لے لیا۔

شینہ بیگم پونے گاؤں کے قصبے سن رہی تھیں دادا حضور شینہ کی اماں کے ساتھ خوش گھپوں میں مصروف تھے خوش اخلاقی انتہا پر تھی سچا جیس ہمارا سے وہاں تک چری جا رہی تھیں اور تو اور اس وقت

موتھیں بھی ذرا سکون میں تھیں، زہرہ خاتون پسلوید بدل کر تھک گئیں۔ سفید روٹی جیسے بالوں والی خنٹی بڑھیا سے زیادہ انہیں اپنے مجازی خدا پر غصہ آیا جنہوں نے شہر نہ چھوڑی آنکھیں ماتھے پر رکھی تھیں۔

”تم کون کون سے سبب جھگڑا رکھو؟“ جواہر اپنا چائے کا کپ لے کر مٹھو کے پاس بیٹھ گیا۔

”جو سب سے آسان ہوں۔“ دانقوں سے بکٹ کترتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ انگریزی پڑھ کر مجھے چکر آنے لگے ہیں، ریاضی میری سمجھ میں بھی آئی نہیں، معاشی علوم سے زیادہ وابہات اور مشکل مضمون اور کوئی نہیں۔ سائنس پڑھ کر مجھے رونا آ جاتا ہے اور۔۔۔ اس کی فینچی کی طرح چلتی زبان پر جواہر نے بری طرح ٹوک دیا۔

”مطلب یہ کہ تمہیں سرے سے پڑھنا ہی نہیں ہے۔“

کرسی کی بیک سے پشت ٹکائے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

”ارے واہ! پڑھنا کیوں نہیں ہے؟ اپنا گھر پار چھوڑ کر اس کی پڑھائی کے لیے ہی تو یہاں آئے بیٹھے ہیں۔“ شوہر نامدار سے مایوس ہو کر زہرہ خاتون نے

چمک کر پوتے سے کہا۔ ”ہماری مٹھو خیر سے پروفیسر بن گئی ہاں!“

اپنے بیٹے کے پاس جانے کی جلدی تھی۔

گرم علی پیرزادہ کا بڑا صاحب زادہ وحید اپنے بال بچوں کے ساتھ شہر میں رہائش پذیر تھا۔ وحید صاحب

کو یار دوستوں نے ہنسی مذاق میں کہہ دیا کہ تمہاری شکل ہو ہو ”وحید مراد“ سے ملتی ہے۔ تو جناب نے

ہنسی مذاق کو سیدھا دل پر ہی لے لیا۔ اپنے حسن پر غور تو کیسے ہی تھا۔ اب جو وحید مراد سے مشابہت کا پتا چلا تو

نرا گت بھی آگئی۔ باب کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا شان کے خلاف لگا۔ تو شہر جانے کی ضد پکڑ لی گرم علی

پیرزادہ نے بھی ”ہیروپتھر“ کو مجبوراً ”شہر جانے کی اجازت دے دی قسمت اچھی تھی کہ فیکٹری میں کام

مل گیا۔ یہیں شہر ہی میں شینہ بیگم سے شادی کی جن کا بھری دنیا میں ایک ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عید تہوار

کے مواقع پر گاؤں جاتے اور انہیں بھی شہر آنے پر اصرار کرتے لیکن ابھی تک ان کا شہر جانے کا پروگرام

نہ بن سکا۔ لیکن اب مٹھو کی تعلیم کے لیے سب نے خوش خوشی شہر کی طرف رخت سفر باندھ لیا۔

شہر جانے کا سب سے زیادہ شوق زہرہ خاتون کو رہا تھا۔ جو گڈیوں کی پیالی، نیلی، چلی بیتیاں اور اوپر تلے بنی

عمارتوں کو دیکھ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔ رکشے میں بیٹھے دادا حضور خواجواہدہ رہنے اوسر

اوسر کی معلومات بھاڑ رہے تھے گویا کپکے شہری ہوں۔ وقتاً فوقتاً ”بچوں کی طرح اچھائی کوئی زوجہ محترمہ کو

بھی گھورتے جو سرتاج اور ان کی خورپوں کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے پوتی کے ساتھ خوش گھپوں میں

مصروف تھیں۔

”یہ پینڈو عورت مجھے شرمندہ کروا کر رہے گی۔“

شہر میں داخل ہوتے ہی دادا حضور کے خیالات سیاست دانوں کے بیانات کی طرح بدلنے لگے۔ رکشہ

سبز بیلوں سے ڈھکے ہوئے گیٹ کے آگے رکاوٹ زہرہ خاتون، جھومتی عمارتیں لکھائی باہر نکلیں۔

”ہائے پیر صاحب! میرا سر جکریاں کھا رہا ہے۔“

زہرہ خاتون نے کرنے سے بچنے کے لیے سرتاج کا بانو دلوں لیا۔ ”پینڈو بن“ کے اس خالص مظاہرے پر

پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کے چکر لگاتے نر لگی۔ ج تک اودھ موتی ہو کر رہ گئیں۔

جواہر کی نانی اماں زیتون بانو شکل صورت سے بالکل چنگی بھلی تھیں لیکن دماغ کے اکثر بیج ڈھیلے تھے۔ کبھی ان کا شجرہ نسب بادشاہ اکبر سے جاملتا تو کبھی یوسف رضا گیلانی ان کے رشتہ دار نکل آتے۔ کبھی ملکہ الزہرہ انہیں اپنے بچپن کی سہیلی کی یاد ستانے لیتی اور کبھی آصف رضا میر کو اپنا سابقہ منگیت قرار دیتیں۔ مٹھو کو دیکھ کر انہیں اپنی جوانی اور ٹائی ٹینک کی ”روز“ یاد آجاتی ایک دن نینہ بیگم سے بولیں۔

”نینہ! تم نے شیخ رشید کو رشتے سے انکار کر کے اچھا نہیں کیا“ بے چارہ ابھی تک تمہارا انکار سینے سے لگائے پھر رہا ہے۔“

نینہ بیگم شوہر کے سامنے ماں کی اس گورہ افشانی پر جی بھر کے شرمندہ ہوئیں۔

”ہائے میں لٹ گئی۔“

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی جو منظر ان کی نگاہ گار آنکھوں نے دیکھا تو دل پچھاڑیں کھلنے لگا۔ سفید روئی جیسے بالوں والی زیتون بانو ٹینک پر بیٹھی تھیں جبکہ پیر صاحب تھوڑے فاصلے پر کرسی رکھے بڑھیا سے باتیں بنا رہے تھے۔

”کیا ہوا آیا؟ سنا ہے نصیب و شتمن طبیعت خراب ہو گئی تھی ظاہر ہے اس ”عمر“ میں بد پرہیزی کریں گی تو یہی نتیجہ نکلے گا۔“

زہرہ خاتون دوسری کرسی کھینچ کر پیر صاحب کے عین سامنے جم کر بیٹھ گئیں۔ مجازی خدا نے اس کھلم کھلا بد تمیزی پر لاکھ آنکھیں دکھائیں مونیچیں۔

پیر صاحب گروہ ش سے مس نہ ہوئیں۔

”اچھا خانم! اب اجازت دیجئے۔ ان شاء اللہ شام کو ملاقات ہوگی۔“ مجبوراً ”کرنا جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

”اس لیے پیر صاحب شہر پہنچ کر خود کو ”بابو“ ہی سمجھنے لگے ہیں۔“ زہرہ خاتون شوہر نادر کی اس کایا پلٹ پر انگشت بدندان تھیں۔

”ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔“ ملکہ ترنم نور بھٹل سے مجھ سے کہا۔ ”نانی اماں پھر شہزی سے اتر گئیں۔“

”ہاں مرزا! زہرہ خاتون ہاتھ جھٹک کر باہر نکل گئیں۔“

آج نینہ بیگم زہرہ خاتون کو جوڑوں کے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہوئی تھیں۔ گاؤں سے حمید خالہ مٹھو کے لیے اپنے بیٹے ”مکھن“ کا رشتہ لے کر آگئیں۔ بچو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کیونکہ ان کی ”بہری“ پر پہلا پہلا پتھر پڑا تھا اور وہ بھی ”انتا“ بھاری بھر کم پختہ ہاتھ ہوئے سبز رنگ کا۔ یہی جوڑا زیب تن کیے اور صحت مند بانوؤں اور انگلیوں میں زبور پھنسائے خود کو ”غوش حال“ ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی۔

”چاند تارے پھول، شبنم تم سے اچھا کون ہے؟“ مٹھو نکلتا ہوتے پودوں کو پانی سے سنسار رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا اس کی پشت پر بکھرے کیلے بالوں کے ساتھ اٹھیلیاں کر رہی تھی۔

اماں نے حمید خالہ کی آمد کی بات بتایا تو باپ ہاتھوں سے چھوٹ کر کیماری میں گر گیا۔ پانی میاں سے وہاں تک پھیلتا چلا گیا۔ اماں کے کہنے پر حمید خالہ کو ”کھڑا“ دکھانے کے لیے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

”ماں صدقہ امیری مٹھو کتنی سندر ہو گئی ہے۔“ اپنے صحت مند بانو میں مٹھو کو ”پیارے“ دبوچ لیا کہ بس دم ٹپنے کی کسر رہ گئی۔

بڑی مشکل سے خود کو ”پیارے بھرے“ جنگل سے چھڑایا اور دوسرے صوفے پر ڈھے کر سائیں ہموار کرنے لگی۔ ”بگ شو کا زنانہ ایڈیشن! پیار کا یہ حال ہے تو غصہ کا کیا ہوگا؟“

گردن سلاتے ہوئے خاصی ناگواری سے ”نہ ہونے والی“ سانس کو دیکھا۔

”کبھی صاحب“ تاک یہ رومال رکھے مسلسل شرابے جارہے تھے۔ گاہے بگاہے ایک آدھ چور نظر

منصور بھی ڈال دیتے۔ مٹھو نے ابو پڑھا کر اس بڑی طرح سے گھورا کہ موصوف صوفے میں ہی دیک گئے۔

بچو جانے کی ٹرائی کھینچی اندر آئی تو وہ رسی تروا کر بھاگ نکلی۔

خالہ حمید اپنے گاؤں سے ڈھیر ساری سوغاتوں کے ساتھ دو عدد موتی تازی مرغیاں بھی لائی تھیں۔ جنہیں ان کے رخصت ہونے کے بعد بچو نے جھٹ کر ڈوبے کے اندر بند کر لیا کہ بچو کی شادی کے بعد گھر میں مرغیوں کا داخلہ ممنوع تھا کیونکہ مرغی کا نام لیتے ہی زہرہ خاتون کو اپنی ”جوری شدہ“ مرغیاں یاد آجاتیں اور ساتھ ہی ”جوری“ بھی۔

ہسپتال سے واپسی پر زہرہ خاتون کو حمید خالہ کی آمد کا پتا چلا تو آسمان سر ہر اٹھالیا۔

”ارے اس مرن جوگی کی ہمت کیسے ہوئی اپنے ”لوڑے“ بیٹے کے لیے میری شہزادیوں جیسی پوٹی کا ہاتھ مانگنے کی۔ زہرہ خاتون نہیں بھولی وہ دن جب یہ موتی منج میرے خلاف میری بہری ساس مرحومہ کے کان بھرا کرتی تھی اور وہ بڑی بی بہری تو تھیں ہی پر کانوں کی بھی ایسی پیچی نکلیں کہ اس کلکوبی کی باتوں میں اگر بھی مجھے کچھ کا سامہ نہیں لینے دیا۔“

گزشتہ دنوں کی تکلیف وہ یادوں نے زہرہ خاتون کو چمکولہہ کھوں رونے پر مجبور کر دیا۔

”ارے نیک بخت! آپ بس بھی کر۔ ہم نے کون سا وہاں ہاں کر دی ہے؟“ دادا حضور سے زوجہ حتریم کی حالت دیکھی نہ گئی۔ بالوں پر خضاب لگاتے ہوئے تسلی دی۔

”پٹی؟ پٹی کدھر گئی؟“ پٹھے گلے سے بمشکل آواز نکلی۔

بچو نے بھاگ کر مشہور زمانہ پٹی ساس کے ہاتھوں میں تھمائی۔

”اکھاں چیم چیم ویساں ہائے!“

مٹھو غمگین بنی پھول کی پتیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اچھاتی جارہی تھی۔

”ہائے ربا! اس ”شریلے“ مصحفے سے شادی

کرنے سے اچھا ہے کہ میں چوہے مار دوں پھانک لوں! (لیکن اس سے تو پیٹ میں درد شروع ہو جائے گا) چلو عکھے سے لٹک جاؤں! (پر بجلی آئے گی تو ہی پکھا چلے گا ناں!) کم از کم نہریں تو کووی سکتی ہوں! (تیرنا بھی تو نہیں آتا کہیں ڈوب ڈوب گئی تو؟) کیا پھوس یا پھر!“

پھول کی ساری پتیاں ختم ہو گئیں تو اس نے برہنہ نشی دور اچھال دی۔

”یا پھر جواہر پیر زادہ سے شادی کر لوں!“

عقب سے آئی جواہر کی آواز سن کر وہ چونک کر پیچھے مڑی۔

جواہر نے سرخ مہکتا ہوا گلاب اس کی طرف بڑھایا جسے تھام کر مٹھو نے کان کے اوپر بالوں میں اڑس لیا۔

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“ اس کے گلابی چہرے سے نظر اٹھاتے ہوئے وہ لہجہ بدل کر بولا۔

”کون سی شرط؟“

”تم اس سال میرٹھ پاس کرو گی اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔“ بولو منظور ہے؟“

”ہاں! تو یہ بھلا کون سا مشکل کام ہے؟ وہ تو اتنے سالوں سے میرے پاس ہونے کا موڈ نہیں بن رہا تھا ورنہ اب تک بی اے نہ کر چکی ہوتی۔ پر میں سوچ رہی ہوں! اس بار پاس ہو ہی جاؤں۔“ مٹھو کے یوں بے نیازی سے کہنے پر جواہر ہنس پڑا۔

”ہمارے دونوں بچے ایک ساتھ کتنے پیارے لگ رہے ہیں ناں؟“ نانی اماں نے ساتھ کھڑی زہرہ خاتون سے محبت سے چور کچھ میں کہا۔

”ہاں! اللہ جوڑی سلامت رکھے۔“

انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور مسکرا دیں۔



جو کچھ ہیں سنا سکرے طو

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وٹوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہن اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا۔ لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وٹوریا نے آرب پی بزنس میں سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نئے کی حالت میں وٹوریا کا دوسرا شوہر سیم پر بھاری حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی بیٹی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے چند سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔



زین کی زندگی میں زین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرہیز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتا ہے۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برکت ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھروالوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر بھڑانہ حملہ کرتا ہے مگر وقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر بھڑانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار سکندر کو فون کرتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹ بٹل بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھاگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم زین سے منگنی ختم کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دیکھ کر نکال دیتے ہیں۔ اموجان رو رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں۔ وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کر کے، ہر شے توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا ہوتا رہتا ہے۔

سکندر دوبارہ چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم، محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بد تمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے ہاشم اسے مٹانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔ سکندر کو وہاں ایک لڑکی پر لیزا کا گمان گزرتا ہے مگر وہ لیزا نہیں ہوتی۔ اسے خود پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

سکندر دوبارے آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگریجیشن کا پسلا نہ گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مرادہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیترا م مریم نے نیک لڑکی ہوتے ہوئے اسے رچھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھروالوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

ام مریم ہاشم کی بیوی کو طلاق دلا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر بڑی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔ سکندر نے لیزا کے لیے انگوٹھی خریدی۔ لیزا، خالد محمود کو اور سکندر اموجان کو اپنی شادی کے فضلے سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ اموجان سکندر سے ملنے پر اصرار کرتی ہیں۔ وہ وعدہ کر لیتا ہے۔ لیزا کی ایگریجیشن ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دوبارہیں پورا دن سکندر کے ساتھ گزارتی ہے۔ سکندر اس کو شاپنگ کروا تا ہے۔ دوپہر وہ کراچی کے لیے روانہ ہوں گے۔ شہریار خان آمنہ سیم سے لیزا کے لیے زیورات خریدنے کو کہتے ہیں تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔

”دکرا جی سے واپس آکر ہم فوراً شادی کر لیں گے۔ میں اب تمہیں لندن یا روم واپس نہیں جانے دوں گا۔“

وہ دونوں ایپورٹ جانے کے لیے فلیٹ سے نکل رہے تھے تب وہ لیزا کا ہاتھ تھام کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کی شدت تھی۔

”دیکھا میری محبت کا اثر۔ تم بھی رومانٹک ہوتے جا رہے ہو۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”تمہارے جیسا رومانٹک میں ابھی بھی نہیں ہوں۔ پرسنل لائف میں کیا۔“ کی ٹوٹی ہارٹ والا۔ وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

”یعنی میں یہ سمجھوں کہ تم ہماری شادی والے دن انس جاؤ گے اور مجھے ہنی مون پر بھی نہیں لے کر جاؤ گے؟“ اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورا۔

”ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو۔“ وہ لاپرواہی سے شانے اچکا کر بولا۔

”کر کے تو دیکھو تم ایسا۔ حشر کروں گی میں تمہارا۔“

”ہونے والے شوہر کی کیا سبک ڈک کی جا رہی ہے، سبحان اللہ۔“ وہ اس کی دھمکی پر تقبہ لگا کر ہنس پڑا۔



اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ تمام دن اس سے اس موضوع پر کسی نے بات نہیں کی تھی، پھر بھی وہ جانتا تھا کل منج سکندر اموجان سے ملنے کراچی آ رہا ہے۔ اس نے آج شہریار خان کو نویریہ سے گفتگو کرتے بھی سنا تھا جو وہ کل سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی کی فارم ہاؤس پر دعوت کے انتظامات کے حوالے سے کر رہے تھے۔

شہریار خان کو اموجان کی بیماری نے انہیں اس حد تک توڑ دیا تھا کہ وہ ان کا دل خوش کرنے کے لیے سکندر کی شکل دیکھنے کو راضی ہو گئے تھے؟

جو بھی ہو کم از کم وہ سکندر کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور بچے کے بھی وہاں جانے پر

اعتراض تھا مگر آج بھی ان کے گھر میں حکم شہریار خان ہی کا چلتا تھا۔ اگر وہ ان کے حکم کے خلاف جا کر اپنی بیوی اور بچے کو روک لیتا تو یقیناً ”شہریار خان سخت غصے اور برہمی کا اظہار کرتے اور اموجان جو برسوں بعد اتنی خوش نظر آرہی تھیں ان کی خوشی دکھ اور آنسوؤں میں بدل جاتی۔ لہذا نویریہ اور علی کے کل شہریار خان اور اموجان کے ساتھ فارم ہاؤس جانے پر اس نے خاموشی اور بے نیازی والا رویہ اختیار کر لیا۔

بہت کڑوی سچائی تھی یہ مگر سچی سچائی اسے ماننی پڑ رہی تھی کہ اس نے پورے بارہ سال بعد اپنی اموجان کو اتنا خوش دیکھا تھا۔ اتنا خوش وہ اس کے ہارورڈ سے لاعیاں کر لینے پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی شادی پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ علی کی پیدائش پر بھی نہیں ہوئی تھیں۔ جس شخص کے سبب یہ خوشی تھی اس سے اسے جتنی بھی نفرت تھی مگر اپنی ماں کی ہنسی اور ان کی خوشی اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ وہاں دل کی یہ خوشی اور ہجرے کی یہ ہنسی سدا قائم دیکھنا چاہتا تھا۔ اپنی بیوی اور بچے کو ماں باپ کی خاطر سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے ملنے دے سکے اتنی وسعت وہ کوشش کر کے اپنے اندر پیدا کر چکا تھا۔

سکندر کو نفرت سے سوچتے ہوئے آج پھر اسے ام مریم بری طرح یاد آرہی تھی۔ کہاں ہو گی وہ؟ سکندر شہریار صرف اس کا نہیں، وہ ام مریم کا بھی مجرم تھا۔ اس کے تصور میں بار بار بارہ سال پہلے کا وہ دن آ رہا تھا، جب ام مریم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تھی۔

جس کے سبب وہ اس سے جدا ہوئی وہ شخص آنے والی صبح واپس آ رہا تھا۔



وہ دونوں جہاز میں ساتھ بیٹھے تھے جہاز میں بیٹھے ہی سکندر بالکل گم سم اور چپ چاپ سا ہو گیا تھا۔ وہ اسے ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی سکندر اس وقت اپنی اموجان کو سوچ رہا ہے۔ وہ آج برسوں

بعد ان سے ملنے والا ہے۔ اس کے دل کی عجیب حالت ہوگی۔ چار سال قبل وہ ان کی شدید بیماری میں ان سے ملا تھا۔ آج وہ نجانے کتنے سارے احساسات ایک ساتھ اپنے دل میں پیدا ہوتے محسوس کر رہا ہوگا۔ اسے اپنا چرخ اور غم سے بھرا ماضی بھی شدت سے یاد آ رہا ہوگا۔ سکندر کو شاید اس وقت خاموشی درکار تھی سو اسے خاموشی فراہم کر کے وہ خود سیم کو سوچنے لگی تھی۔

سیم اس سے خفا تھی۔ اس نے روم سے وہ باروانہ ہونے سے قبل اسے کال کر کے اپنی کراچی آمد کا نام بتایا تھا۔ اس نے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ فون بھی فوراً ہی بند کر دیا تھا۔ محمود خالد نے یہ جاننے کے لیے وہ کب اور کس فلائٹ سے کراچی پہنچ رہی ہے، فون کیا تو اس نے نام نہیں بتایا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ ابھی اس نے سیٹ بک نہیں کروائی ہے۔ خواہش تھی اسے ایرپورٹ پر لینے صرف اور صرف سیم آئے۔ سیم سے ایرپورٹ پر مل کر پھر وہ محمود خالد کے گھر چلی جائے گی۔

اس روز فون پر وہ محمود خالد کی جذباتی باتوں کے حصار میں آگئی تھی۔ بعد میں روم جا کر جب اس نے سوچا تو اسے لگا، سیم ٹھیک کہتی ہے ان کے پاپا کو ان بہنوں سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے آتے ہیں۔ اس سے جذباتی انداز میں باتیں کر کے اسے اس بات کے لیے آمادہ کروا لیا کہ وہ کراچی آکر ان کے پاس ٹھہرے۔ وہ ان کے گھر پر ٹھہرے گی ضرور مگر اپنی زندگی کے کسی بھی معاملے میں انہیں آج بھی ایک لفظ نہیں کہنے دے گی۔



وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ ساری رات ایک پل کے لیے بھی انہوں نے پلکیں تک نہیں جھپکیں۔ ”اس وقت سکندر ہوائی جہاز میں ہو گا۔ اور اس کے ساتھ لیزا بھی ہوگی“ انہوں نے زیر لب بہت پیار سے یہ نام لیا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ بے قرار ہو کر

وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ فجر میں ابھی وقت تھا۔ سوچا، تجھ کی نمازی ادا کر لی جائے۔ وہ بغیر کوئی آہٹ، کوئی شور پیدا کیے بیڈ سے خاموشی سے کھڑی ہو رہی تھیں۔ ”کیا ہوا آمنہ! انیند نہیں آ رہی کیا؟“ شہیار خان کی آواز پر وہ چونک کر مڑیں۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔

”جی۔“ وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکیں کہ روز غم انہیں سونے نہیں دیتے تھے، آج خوشی میں انہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔ آج ان کی عید کا دن ہے۔ ان ماں بیٹے نے جو بن باس کاٹا ہے، آج اس کے ختم ہونے کا دن ہے۔

مختصر سا جی کہہ کر وہ ہاتھ روم کی طرف جانے لگی تھیں جب شہیار خان کی آواز نے انہیں روک لیا۔ ”سکندر کس وقت پہنچ رہا ہے؟“ ”پون گھنٹہ باقی ہے۔“ وہ ان کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولیں۔

”کیا ایرپورٹ جانا چاہتی ہو اس سے ملنے؟“ آمنہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت سے شہیار خان کو دیکھ رہی تھیں۔

”جی، کیا میں چلی جاؤں؟“ انہوں نے محتاط سے لہجے میں اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں چلی جاؤ۔“ مگر اتنی صبح سویرے تمہارا ڈرائیور کے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ میں تمہیں لے چلا ہوں۔“ شہیار خان سنجیدگی سے بولتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

وہ بے تحاشا حیران ہوئی تھیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ اور شہیار خان ایرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکل چکے تھے۔ شہیار خان گاڑی چلا رہے تھے۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے وہ دونوں ایرپورٹ جلدی پہنچ گئے تھے۔

”سکندر سے آج شام پانچ ساڑھے پانچ بجے فارم ہاؤس آنے کا کہہ دیتا۔“ ایرپورٹ پہنچ کر وہ ان سے بولے۔

”جی۔ آپ بھی آ رہے ہیں کیا؟“ آمنہ نے ہنسی سے پوچھا۔ شہزاد خان نے گاڑی پارکنگ میں لے جا کر روکی۔

”نہیں تم مل آؤ۔ میں تمہارا یہیں انتظار کر رہا ہوں۔“

ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ ارد گرد اندھیرے کے سبب وہ شہزاد خان کے تاثرات ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ وہ سنجیدہ تو تھے مگر سنجیدگی کے ساتھ کچھ اور بھی تھا ان کے لہجے میں۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھیں۔ سر ہلا کر خوشی سے سرشار وہ گاڑی سے اتر گئیں۔ سامنے ہی انٹرپرائز اراٹیل نظر آ رہا تھا۔ بس کسی بھی لمحے ان کا سکندر ان کی نگاہوں کے سامنے ہو گا۔ وہ دل ہی دل میں مسلسل دعائیں مانگ رہی تھیں۔

”یا اللہ! مجھے خیریت سے میرے سکندر سے ملا دے۔“ سامنے سے مسافر ٹریلیاں چلاتے باہر نکلتے نظر آ رہے تھے۔

وہ جو سامنے سے اس طرف آتا نظر آ رہا ہے۔ وہ ان کا سکندر ہی ہے۔ خوب صورت و جبرہ۔ بھرپور توانا مرو ان کا بیٹا۔ ان کا دل فخر اور خوشی سے بھر گیا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ نظر کی دعا پڑھ کر دور سے اس پر دم کی۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ اس کے ساتھ چلتی لڑکی کو انہوں نے ابھی تک توجہ سے دیکھا نہیں تھا۔ ان کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ خوشی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

سکندر ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ ان کا بیٹا ان سے ملنے ان کے پاس آ چکا ہے۔ ایک پل انہیں خوشی سنبھالنے میں لگا تھا۔

انگلے پل وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھی تھیں۔

سکندر نے اموجان کو دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی اس نے انہیں آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے والمانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ ٹرائی لیزا

کے پاس چھوڑ کر خود تیز قدم اٹھا کر ان تک پہنچا۔

”السلام علیکم اموجان۔“ آمنہ نے بہت تڑپ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

”یا اللہ تبارک و تعالیٰ! لاکھ شکر ہے تو نے مجھے میرے بیٹے سے ملوایا۔“ وہ اسے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے گلے لگے ان کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ان کا مضبوط اور توانا بیٹا اپنی بیکار اور غم سے نڈھال ماں کو سارا دل سے کھڑا تھا۔ اس نے لیزا کا اپنے اور اموجان کے پاس آ کر گھڑا ہونا محسوس کیا تھا۔

”بس اموجان! اس طرح مت روئیں۔ آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔“

اس نے پیار سے ان کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا۔ ماں کے آنسوؤں سے اس کا نشانہ بھیک چکا تھا۔ وہ ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا۔

”میں آؤ گیا ہوں آپ کے پاس۔ اب آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ اس نے پیار سے ماں کے ہاتھ تھام کر کہا۔

”یہ خوشی کے آنسو ہیں بیٹا! یہ شکر گزاری کے آنسو ہیں۔“ آمنہ نے والمانہ انداز میں اس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ ٹھنکی پاندھے اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں اس پر سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔

”اموجان! آپ لیزا سے تو ملی نہیں۔“ اس نے مسکرا کر اپنے ساتھ کھڑی لیزا کی جانب اشارہ کیا۔ آمنہ نے اب پہلی بار لیزا کو توجہ سے دیکھا تھا۔

”السلام علیکم آنٹی!“ لیزا نے فوراً انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“ لیزا کا سلام اگر ہچکچاہٹ اور تکلف لیے ہوا تھا تو آمنہ کا جواب اتنی ہی بے تکلفی اور والمانہ پیار سے ہوا تھا۔ انہوں نے لیزا کو بھی اسی طرح گلے لگایا تھا۔ وہ خاموش کھڑا لپ لیزا کو گلے لگاتے اور پھر اس کا ہاتھ چومتے دیکھ رہا تھا۔

”آنٹی نہیں! ماں ہوں تمہاری، جیسے سکندر کی

ہوں۔ مجھے اموجان بولو گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔“ وہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی ماں لیزا کے چہرے کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

”جی اموجان۔“ لیزا کی ہچکچاہٹ اور تکلف آمنہ کی والمانہ محبت کے آگے مسکراہٹ اور اپنائیت میں چند لمحوں میں بدل گئی تھی۔

”سکندر! میری بہت پیاری ہے۔“ لیزا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا۔

وہ بے ساختہ مسکرایا۔ لیزا کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی وہ اس کی ماں کو یونہی اچھی لگتی کہ وہ ان کے بیٹے کی پسند ہوتی۔

”آپ کس کے ساتھ آئی ہیں اموجان؟“ اسے ایک دم ہی خیال آیا۔

”تمہارے پیلا کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“ آمنہ آہستگی سے بولیں۔ تمہارے پیلا کے الفاظ اسے بہت عجیب سے لگے تھے، درحقیقت اسے برے لگے تھے مگر برسوں بعد ماں سے ملنے پر وہ خوشی کے موقع پر کوئی بد مزہ والی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اب چلوں۔“ اس کے چہرے کو پیار سے تکتے ہوئے وہ بولیں۔ انہوں نے پھر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ جانے کی بات کر رہی تھیں اور اس کے ہاتھ تھام کر کھڑی تھیں۔ جیسے ڈر تھا اگر اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پھر کہیں کھو جائے گا۔

”جی اموجان! آپ اب گھر جا کر آرام کیجیے۔ تھوڑا دن نکل آئے پھر ہم دوبارہ ملیں گے۔ کہیں ساتھ بیٹھ کر خوب ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔“ اس نے دیکھا آمنہ اس کی بات سن کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔ ایک پل کی سوچ کے بعد انہوں نے سکندر کے بجائے لیزا کو مخاطب کیا۔

”لیزا بیٹا! تمہاری اور سکندر کی آج شام میری طرف سے دعوت ہے ہمارے فارم ہاؤس پر۔ شہر کی حدود سے ذرا باہر نکل کر ہمارا فارم ہاؤس۔ اس لیے گھر سے تھوڑا جلدی نکل جانا۔ یہ وہاں کا ایڈریس

”ہے۔“

انہوں نے پرس سے ایک تہہ کی ہوئی چٹ نکال کر لیزا کے ہاتھ میں پڑائی۔

”اموجان! دعوت وغیرہ کو رہنے دیں۔ میں اور لیزا اس کے بغیر ہی آپ سے مل لیں گے۔“ وہ واضح اور صاف لفظوں میں منع نہیں کر پاتا تھا۔

فارم ہاؤس پر کون دے رہا تھا۔ دعوت؟ وہاں پر کس کس نے موجود ہونا تھا۔ وہ سب جانتا تھا مگر وہ نہ کسی سے ملنا چاہتا تھا نہ کسی کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔

”میں تم سے نہیں اپنی بہو سے بات کر رہی ہوں۔“ آمنہ نے فوراً ہی اسے سخت انداز میں ڈانٹ کر چپ کر دیا تھا۔

اب انہوں نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر بہت پیار سے لیزا کے ہاتھ تھامے تھے۔

”تمہاری سہیلی یہ ہے؟“

”جی! لیزا ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ کر جس پر واضح لفظوں میں کسی بھی دعوت اور فارم ہاؤس پر جانے سے انکار لکھا تھا۔ آمنہ سے قدرے ہچکچا کر بولی۔ وہ جیسے الجھن میں آگئی تھی کہ ماں کی سنے یا بیٹے کی طرف دیکھے۔

”تو پھر آج شام اسے ساتھ لے کر ہمارے فارم ہاؤس آ جانا۔ میں تم دونوں کا شدت سے انتظار کروں گی۔“ وہ بڑی امید سے لیزا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”میں اور سکندر آج شام آپ کے پاس ضرور آئیں گے اموجان!“ لیزا نے بے اختیار انہیں یقین دلایا۔

”وعدہ کر رہی ہونا؟“

”میں آپ سے وعدہ کر رہی ہوں اموجان۔“

”مجھے ہاؤس مت کرنا۔ برسوں بعد مجھے کوئی خوشی ملی ہے۔ اس خوشی کو ماہو یں میں مت بدلتا۔ میں بہت شدت سے منتظر ہوں گی تم دونوں کی۔“

”اموجان! ہم دونوں آپ کے پاس ضرور آئیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔“ لیزا پر یقین لہجے میں محبت سے بولی۔

”حقیقتی رہو بیٹا! اللہ تمہارے وجود سے میرے بیٹے کے گھر کو سدا سجاے رکھے۔ تم دونوں کا واسن خوشیوں سے بھر دے۔“

وہ ایک بار پھر والہانہ انداز میں لیزا کو پیار کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں نمی لے وہ التجا کرتی نظروں سے سکندر کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے بے اختیار اسے پھر گلے لگالیا تھا۔

ان کی پُر نسی آنکھیں بے آواز اس سے مخاطب تھیں۔ نہ ماں ایک لفظ بولی تھی نہ جواب میں اس نے کچھ کہا تھا۔ بس نگاہیں نگاہوں سے مخاطب تھیں۔ اپنا دروازہ کرب ایک دوسرے کو تباہی تھیں۔ ”میں چلتی ہوں۔“ چند سیکنڈ زلحد خود پر قابو پا کر وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔

وہ خاموش کھڑا رہا تھا۔ لیزا انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ واپس پلٹ گئی تھیں۔ وہ اسی طرح سارکت تھا۔ لیزا اس کے ساتھ کھڑی خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

”آئم سوری سکندر! میں جانتی ہوں تم اموجان کی دعوت ایک سیٹھ نہیں کرنا چاہتے تھے مگر وہ جس طرح کہہ رہی تھیں، انہیں انکار کرنے کے لیے پھر کا دل چاہیے تھا۔ وہ بہت دھمی ہیں سکندر! ان کا دل خوش کرنے کے لیے یہاں تک آگئے ہو تو اب وہ جہاں بلا رہی ہیں، صرف ان کا دل خوش کرنے کے لیے وہاں بھی چلو۔ اگر ہم نہیں گئے تو ان کا دل بہت دکھے گا۔ ہم نہیں گئے تو وہ کتنا روگیں گی۔“

لیزانے اس سے آہستہی اور نرمی سے کہا۔ وہ ہچکے سے انداز میں سر ہلا کر مسکرا دیا۔

”ہم شام میں چل رہے ہیں ناں؟“ لیزانے امید سے اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ ایک تھکی ہوئی لمبی سانس لے کر بولا۔

”سیم نہیں آئی تمہیں لینے؟ تم نے کہا تھا وہ تمہیں لینے آئے والی ہے۔“ اس نے یک دم ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

”ہاں پتا نہیں کیوں اب تک تو اسے آجانا چاہیے

تھا۔“ لیزا نے ارد گرد ہر طرف نگاہیں دوڑائی تھیں۔ ”تم فون کرلو۔“ لیزا سرماں میں ہلا کر فوراً ہی اپنی بہن کو فون ملانے لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ نئی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد بھی جب لیزا کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا تب اس نے پوچھا۔

”نیل جا رہی ہے۔ مگر سیم کال ریسیو نہیں کر رہی۔ اس کے لینڈ لائن نمبر پر بھی کال ریسیو نہیں ہو رہی۔“

اس نے دیکھا لیزا کے چہرے پر مایوسی آگئی تھی۔

”ہو سکتا ہے اس کی آنکھ نہ کھلی ہو۔“ اس نے لیزا کو تسلی دینی چاہی۔

”میرے آنے پر اس کی آنکھ نہ کھلی ہو؟ تمہیں پتا ہے سکندر! سیم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہے۔ میں زندگی

میں پہلی بار پاکستان آئی ہوں۔ میرا آنا سیم کے لیے اتنا معمولی واقعہ نہیں ہو سکتا کہ وہ سوئی رہ جائے۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی۔

”لیکن اب تم اس طرح یہاں کھڑی تو نہیں رہ سکتیں ناں۔ چلو میں ہوسل جاتے ہوئے پہلے تمہیں

تمہارے پیپا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ وہاں جا کر تم پتا کر لینا کہ سیم تمہیں لینے کیوں نہیں پہنچ سکی۔“

سکندر رسائیٹ سے بولا۔ لیزا نے جو انا سرانبات میں بلا دیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا، لیزا کے چہرے پر مایوسی سی پھیل گئی ہے۔ وہ اپنی بہن کے ایرپورٹ نہ آنے پر دکھی ہو گئی تھی۔



سکندر نے کب کر لی تھی۔ اس نے پہلے اسے اس کے پیپا کے گھر ڈراپ کیا، وہ خود اپنے ہوسل چلا گیا۔

چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھولا۔ وہی اسے لاؤنج تک چھوڑ کر بھی چلا گیا اور اسی نے انٹر کام پر محمود خاور کو اس کی آمد کی اطلاع دی تھی کہ اتنی صبح ابھی وہاں نہ

گھر کا کوئی فرد موجود تھا نہ ہی کوئی ملازم۔

”میری بیٹی آئی ہے۔“ محمود خالد اور ان کے پیچھے عائشہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے پاس آ رہے

تھے۔ وہ ان دونوں کو آتا دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ باپ کے گھر آئی تھی مگر دل میں ایسا لگ نہیں رہا تھا کہ اپنے باپ کے گھر ہے

محمود خالد کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری تھی۔ اس کے پاس آتی تھی انہوں نے محبت سے اسے گلے لگالیا۔

”السلام علیکم پیپا۔“

”وعلیکم السلام۔“ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں اپنے آنے کا؟ میں تمہیں ایرپورٹ لینے آتا۔“

اس کے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ جواباً چپ رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ

اپنی آمد کا فون پر نہ بتانے کی کیا توقع دے۔ باپ کی بے تحاشا خوشی اسے مصنوعی نہیں لگ رہی تھی۔ اسے ان کی آنکھوں میں نمی نظر آ رہی تھی۔ اسے ہلکی سی

ندامت ہوئی۔

”خیر تم آگئیں کلثوم! میرے لیے تو یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔ آج کتنے سالوں بعد میں اپنی بیٹی کو دیکھ رہا ہوں۔“ انہوں نے جیسے اس کی ندامت محسوس کر لی تھی۔ اس لیے فوراً ہی مسکرا کر خوشی سے بھرپور

انداز میں بولے۔ عائشہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”اب کیسی ہیں آنٹی؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پتا ہے محمود بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کل رات بھی دیر

تک مجھ سے تمہاری ہی باتیں کرتے رہے۔ صبح صبح اچانک پہنچ کر تم نے ہمیں بڑا زبردست سربراہنڈ دیا ہے۔“

اس کے دل میں جاگاند امت کا احساس محمود خالد اور عائشہ دونوں نے فوراً ہی دور کر دیا تھا۔

”عائشہ! ناشتہ وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں کلثوم کو اس کا کرا دکھا دوں۔“ محمود خالد اس کا ہاتھ تھام کر بولے

عائشہ نے مسکرا کر سرانبات میں بلایا۔

”او بیٹا! انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر بیڑھیاں چڑھنے لگے۔

”تمہارا سامان میں ابھی کمرے میں رکھوا دوں گا۔“ وہ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے بولے۔ فون پر بات کرتے ہوئے جذبات کو سیرو کر لینا، سرود سپاٹ انداز اختیار کر لینا مختلف بات تھی۔ آمنے سامنے ان کی والہانہ چاہت کے اظہار کے سامنے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنا سر انداز کس طرح برقرار رکھے؟

”جب میں نے یہ گھر خریدا تھا۔ تب ہی یہ کمرہ تمہارے لیے منتخب کر کے اسے تمہارے لیے سجایا تھا۔ میں نے سوچا تھا، میری آرٹس بیٹی کے لیے یہی کمرہ ہونا چاہیے۔ یہ دیکھو! یہاں کھڑکی سے باہر

ہمارے لان کا لگتا خوب صورت منظر نظر آ رہا ہے۔“ اس سے بولتے ہوئے انہوں نے کھڑکی پر سے

پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکیاں کھلتے ہی لان کا سرسبز اور خوب صورت منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔

لان میں لگے خوب صورت پھول، پودے، درخت، گھاس اور سب سے بڑھ کر لان کے پتھوں پہنچنے

فوارے سے گرنا پانی بہت خوب صورت منظر تھا۔ مگر وہ اس منظر کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

”خوب صورت لگ رہا ہے نا یہاں سے لان کا ویو۔“ محمود خالد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی! باپ سے باتیں کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ناں سے کیا کہے۔“

”ایک چیز اور بھی ہے تمہارے لیے۔ دکھاؤں؟“ وہ مسکرا کر بولے۔ انداز میں بچوں کی سی خوشی تھی۔

”جی بلایا دکھائیے۔“

”تم ابھی تھکی ہوئی گھر پہنچی ہو۔ سوچ رہی ہو گی پیپا بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں مگر میرا دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں تمہارے کمرے کے ساتھ ساتھ تمہارا

اسٹوڈیو بھی دکھاؤں۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑکی کے پاس سے بٹے تھے۔ اس کے کمرے کی دامن دیوار میں ایک خوب صورت

دروازہ تھا۔ محمود خالد نے اس دروازے کو کھولا اور اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئے تھے۔

اب وہ جس کمرے میں تھے، وہ اس کے بیڑوم

ساتھ لے کر بیڑھیاں چڑھنے لگے۔

خواتین ڈائجسٹ 143 جولائی 2012

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کسی چھ بڑا کرا تھا۔ اس کا فرش لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ یہاں میز بھی تھی، صوفے بھی تھے، رانگ چیر بھی تھی۔ بک شافت بھی تھا۔ مختلف طرح کے اہل بھی تھے، رنگ بھی تھے۔ پینٹنگ بنانے سے متعلق ایشیا میز پر سلیقے سے رکھی تھیں۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز اور زائیں تھیں۔ بک شافت میں مصوری اور آرٹ سے متعلق قیمتی کتابوں کا گلیکشن بھی تھا۔

”یہاں کا انٹیریر میں نے ایک آرکیٹیکٹ سے کروایا تھا۔ مجھے خود تو پینٹنگ کی اسے ہی سی بھی نہیں آتی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا آرٹ لوگوں کے اسٹوڈیوز کیسے ہوتے ہیں۔ اب جب تک تم یہاں ہو، پینٹنگ کرنے کا دل چاہے تو ہمیں آکر کام کرنا۔“

ان کے چہرے پر یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اسے یہاں پر کام کرنا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے آرٹ بننے کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے کے بعد اس کے آرٹ ہونے پر اتنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ وہ چپ چاپ تو کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔

”بہت خوب صورت اسٹوڈیو ہے۔ تھینکس بابا!“

”تمہیں پسند آگیا۔ میری محنت وصول ہو گئی۔ پانچ سال سے میں منتظر تھا کہ تم آؤ اور اپنا یہ اسٹوڈیو دیکھو۔“

ان کا انداز اسے شرمندہ کروانے والا یہ تھا کہ وہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ باپ سے ضد باندھ کر ان کے لاکھ بلانے پر بھی پچھلے پانچ سالوں میں کبھی ایک بار بھی ان سے نہیں ملی تھی۔ وہ بس جیسے اسے ایک بات بتا رہے تھے۔ شرمندہ وہ خود ہی ہو رہی تھی۔ اسے شرمندگی کیوں ہو رہی تھی؟

”میں تمہارے آنے سے بہت خوش ہوں کلثوم! اب شادی کے بعد بھی میرے پاس کراچی آتی جاتی رہنا۔ تمہاری تو ہونے والی سرسرا بھی کراچی ہی میں ہے۔“

وہ محبت بھرے انداز میں اس سے بولے تھے۔ وہ

جواباً ”سرا ثابت میں ہلانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”تم مجھے سکندر سے کب ملو رہی ہو؟“ کرا اور اسٹوڈیو دیکھنے کے بعد وہ شاور لینے چلی گئی تھی۔ نماز فریش ہونے کے بعد نیچے آئی تو ناشتے کی میز پر محمود خالد اور عائشہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سکندر کا نام یاد رکھے جانے اور اس کا نام اتنی محبت سے لیے جانے پر حیران ہوئی تھی۔

وہ سکندر کو باپ سے ملوانے پاکستان نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کی ماں سے ملنے پاکستان آئی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت ساری سوچیں آ رہی تھیں۔

وہ سکندر سے محبت میں نہیں ملنا چاہتے۔ وہ اس کی اور سکندر کی شادی کروانے کے لیے کچھ پلان کر رہے ہیں۔ سیم کے ساتھ بھی تو انہوں نے یہی کیا تھا۔ یہ محبت صرف ایک دکھاوا ہے۔ مگر دکھاوا ہے تو اتنی سچی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔

”آج شام مجھے اس کے پیرٹس سے ملنے جانا ہے۔ وہ مجھے پک کرنے آئے گا۔ میں اس سے کہوں گی کہ تمہارا جلدی آجائے۔ پھر آپ اس سے مل بیجے گا۔“

اس کے ذہن میں جو بھی سوچیں آ رہی تھیں مگر وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی باپ کو کوئی جواب نہیں دے پائی۔

”میں تمہارے شادی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں بیٹا! مجھے یقین ہے تم نے ایک اچھے لڑکے کا انتخاب کیا ہو گا۔“ وہ اس سے پیار سے بولے تھے۔ عائشہ ان دونوں کے آگے چلے کر تھک رہی تھیں۔

”محمود بہت خوش ہیں تمہاری شادی کان کر۔ بلکہ ہم دونوں یہ ڈسکس کر رہے تھے کہ سکندر کی فیملی بھی اگر کراچی ہی میں ہے تو پھر ہم دونوں بیس پر ہی شادی کر لوں۔“ عائشہ اس سے بولی تھیں۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔ سکندر کے اپنی فیملی کے ساتھ خوشگوار تعلقات نہیں ہیں۔ کچھ اختلافات ہیں

اس کے اپنے والد اور بھائی کے ساتھ۔ وہ یہاں صرف اپنی والدہ سے ملنے آیا ہے۔“ وہ جواباً ”سجیدگی سے بولی۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ تم بس مجھے سکندر سے ملو اور تمہاری شادی جہاں پر بھی ہوگی، میں اور عائشہ وہاں ضرور آئیں گے۔ میری بیٹی باپ کے ہوتے ہوئے باپ کی دعاؤں کے بغیر تو رخصت ہرگز نہیں ہوگی۔“

اس کی سجیدگی اور دو ٹوک سے انداز کے جواب میں محمود خالد پیار اور نرمی سے بولے تھے۔

”پچھ گئی تم؟“ ناشتے کے بعد کمرے میں آکر اس نے سیم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ اس بار اس کی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ منہ سے سیم کے لیے اس سے بولی تھی۔

”تم مجھے لینے اور پورٹ کیوں نہیں آئیں سیم؟“ وہ جانتی تھی اس کی سکندر سے شادی اور پاکستان آنے کی بات پر سیم اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ اس نے غصے میں پچھلی دونوں بار اس کی فون کالز بند کر دی تھیں۔

وہ جانتی تھی سیم اس کی محبت میں اس پر خفا ہوتی تھی، اسے اس کی ہر وقت فکر جو بہت رہتی تھی۔ اسے یقین تھا اس کے آگے پر وہ رک نہیں پائے گی، اپنی ساری ناراضی بھلا کر وہ بھاگی بھاگی اس کے پاس اپریورٹ چلی آئے گی۔ چاہے ابھی لاکھ ناراضی ظاہر کر رہی ہے۔ مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ سیم اس سے واقعی بڑی سجیدگی سے خفا تھی۔

”اس لیے کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ مجھے تم پر بہت غصہ ہے۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”سیم پلیز اب مجھ سے خفا مت ہو۔“

”تمہاری بے وقوفی پر خفا بھی نہ ہوں؟ تمہارا کوئی جانتی نہیں ہو لڑ۔ تم ابھی تک بہت سادہ ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں تمہارے ساتھ۔“

وہ سیم کی بات پر چپ ہو گئی تھی۔ وہ نہ باپ کی حمایت میں کچھ کہہ پائی تھی نہ مخالفت میں۔

”اب پاکستان آئی چکی ہو تو کم از کم بابا کے گھر پر تو

مت رہو۔ میرے گھر آجاؤ۔ میں ڈرائیور کو بھیجوں کیا؟ سیم کے لیے کچھ خفگی اور ناراضی اب پھر اس کی فکر اور محبت میں بدل چکی تھی۔

”میں بابا کے ڈرائیور کے ساتھ تمہارے گھر آجاؤں گی۔ تم اگر ابھی نہیں۔ آج دوپہر مجھے سکندر کو پاپا سے ملوانا ہے اور پھر شام میں مجھے خود سکندر کی فیملی سے ملنے جانا ہے۔ میں کل آجاؤں گی۔“

وہ سیم کی ناراضی سے ڈر کر محتاط سے انداز میں بولی۔

”اچھا ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔“ سیم ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس اس کا لہجہ سجیدہ تھا۔

”ٹھیک ہے لڑ میں تم سے پھر بات کروں گی۔“

سیم نے سجیدہ ہی انداز میں فوراً ”فون بند کر دیا تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ سجیدگی سے بیٹھ کر سوختے لگی تھی کہ آج سکندر کی فیملی سے ملنے اور سکندر کو محمود خالد سے ملوانے کے بعد وہ سیم کے گھر ہی چلی جائے۔ کراچی آنے سے قبل اس نے سیم کے گھر پر نہ رکنے کے حوالے سے باپ سے کیا وعدہ کیا تھا، سیم کی آواز سنتے ہی اسے بھول گیا تھا۔

شاید اسے سیم کے گھر پر جانے سے منع کرنا، اس کے بابا کی کوئی سازش ہی تھی۔ ان دونوں بہنوں کو یہاں پر ایک دوسرے سے دور رکھوانے کے لیے تاکہ جب وہ اس کی اور سکندر کی شادی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کریں تب سیم اس کی مدد نہ کر سکے۔

وہ کل صبح ہی سیم کے پاس چلی جائے گی۔ اس نے سوچا سازش، پلاننگ، دھوکا اور جھوٹی محبت سے اسے گھٹن ہونے لگی تھی۔

محمود خالد کی خواہش تھی کہ سکندر آج ان لوگوں کے ساتھ لچ کرے مگر اس نے خود سکندر کو لچ کی دعوت نہیں دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی سکندر اس کے پیار سے بہت زیادہ دیر کے لیے ملے۔ اس سے فون

کر کے اس نے بس یہ کہا تھا وہ اسے پک کرنے تھوڑا پہلے آجائے تاکہ اس کے پیلا سے بھی مل سکے۔ اس نے محمود خالد کو یہ بتایا تھا کہ سکندر یہاں پر لنگھ نہیں کرے گا وہ کچھ دیر سے آئے گا کیونکہ وہ بہت بڑی ہے تو انہوں نے عائنہ سے چائے کے ساتھ بھرپور قسم کے ریفرنشمنٹ کا کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے ہونے والے داماد کے پہلی بار گھر آنے پر بہت پر جوش تھے۔



اس کی اموجان کی خوشی سے چمکتی آواز آج اسے برسوں بعد سنائی دے رہی ہے۔ مگر۔۔۔ وہ اس سب سے لائق اختیار کیے کمرے میں میز کے آگے لیپ ٹاپ رکھ کر بیٹھا تھا۔

”غلام احمد! گاڑی میں مٹھائیاں رکھوادی تھیں؟“ اس کے کان میں پھر اپنی اموجان کی خوشی سے کھنکتی آواز آئی تھی۔ اس نے خود کو پہلے سے بھی زیادہ لائق بنالیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہے۔ ”کیا کر رہے ہیں؟“ نوریہ کمرے میں آئی تھی۔ سب لوگ گھر سے جلدی نکل رہے تھے۔ غالباً اس کی اموجان دعوت کا سارا انتظام اپنی نگرانی میں کروانا چاہتی تھیں۔ گاڑیوں میں سامان رکھوایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد سب کو تیار ہو کر گھر سے نکل جانا تھا۔ نوریہ اس کے پاس صوفے ہی پر بیٹھ گئی تھی۔ ”آفس کا کام تھا تھوڑا۔“ وہ سر اٹھائے بغیر لاپرواہی سے بولا۔

نوریہ نے آج صبح اس سے اموجان اور پیلا کے ساتھ فارم ہاؤس جانے کی اجازت مانگی تھی۔ اس نے بغیر کوئی لمبی بات کیے صرف ایک ہاں کہہ کر اسے اور علی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔

”تمہیں کوئی کام ہے؟“ اس نے سر اٹھا کر نوریہ سے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ بہت سوچ کر محتاط سے انداز میں بولی۔

وہ اپنے پیلا کی طرح کا حاکمانہ مزاج رکھنے والا سخت

گیر شوہر نہیں تھا کہ نوریہ کو اس سے بات کرنے کے لیے پہلے اجازت لینے پڑے، لفظ سوچنے پڑیں۔ ان دونوں کا تو بڑا ہی دوستانہ اور پیار بھرا تعلق تھا جس میں ایک دوسرے کے لیے عزت بھی تھی اور محبت بھی۔ پھر آج نوریہ کو کیا ہوا تھا؟ وہ قدر کا خائف سی لگا ہوں سے اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟

”کونو نوریہ؟“

وہ کوشش کے باوجود مسکرا نہیں سکا تھا، جب دل ماضی کی بھول بھلیوں میں پھر سے کھویا ہوا تھا تو بھول پر مسکراہٹ کہاں سے آتی۔

”زین پلیر! مجھ سے خفامت ہوئے گا۔ میری بات ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کیجئے گا۔“ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”بارہ سال پہلے آپ کے گھر میں کیا ہوا تھا، میں نہیں جانتی مگر جو کچھ بھی ہوا تھا اور چاہے وہ جتنا بھی برا ہوا تھا مگر اسے گزرے بارہ سال گزر چکے ہیں زین! اتنے سالوں میں دنیا بدل گئی ہے زندگی بدل گئی ہے۔“ ”تم کیا کہنا چاہتی ہو نوریہ!“ اس بار اس کا لہجہ تھوڑا سخت تھا۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب آپ بھی خود کو تھوڑا تبدیل کیجیے۔ اپنے دل میں وسعت پیدا کیجیے۔ صلہ رحمی اللہ کو پسند ہے۔ کیا اللہ ہمارے بڑے بڑے گناہوں کو معاف نہیں کر دیتا۔ تو ہم اس کے بندے اس کی پسندیدہ ترین صفت کو کیوں نہیں اپنا سکتے؟“

وہ نرم لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ وہ یک دم ہی غصے سے لیپ ٹاپ بند کرنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور غصہ آ گیا تھا۔ وہ خاموش صرف اس لیے تھا کہ وہ اس موضوع پر نوریہ سے ایک لفظ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

”آپ کو پتا ہے زین! بیلا نے آج کی یہ دعوت کیوں رکھی ہے؟“ اسے خاموش دیکھ کر نوریہ نے پوچھا۔

”اموجان کی وجہ سے۔ اموجان سکندر بھائی کے آنے پر بہت خوش ہیں۔ پیلا نے کل جب مجھے فارم ہاؤس کی دعوت کا بتایا تھا، تب انہوں نے کہا تھا کہ

انہوں نے رسول بعد انہیں اس طرح خوش دیکھا ہے اور وہ انہیں پوری طرح خوش ہونے کا موقع دینا چاہتے ہیں اسی لیے انہوں نے سکندر بھائی اور ان کی ہونے والی بیوی کی دعوت رکھی ہے۔ پیلا آپ سے کم تو تھا نہیں سکندر بھائی سے۔ جب وہ اموجان کی خوشی اور ان کی صحت کے لیے اپنا غصہ اور ناراضی پس پشت ڈال سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں۔ وہ بارہ سال بعد اپنے سب گھر والوں کو ایک ساتھ، ایک ہی جگہ پر موجود دیکھیں گی۔ یہ خوشی ان کی صحت پر کتنا اچھا اثر ڈالے گی زین!

”سن لینے کے بعد جو وہ نویرہ کی باتیں نہ سننے کا سا تاثر دیتا کرے سے جانے لگا تھا۔“

”زین! میری بات کا جواب تو دے دیں۔“ نویرہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ نویرہ کو جواب دیے بغیر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے سامنے اموجان نظر آئی تھیں۔ ان کا ہاتھ یوں اٹھا ہوا تھا گویا وہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دینے والی تھیں۔

پل بھر کے لیے اس کی اپنی ماں سے نگاہیں ملی تھیں۔ ان نگاہوں میں شکوہ تھا۔ اس پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈالنے کے بعد آمنہ پیچھے کھڑی نویرہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”نویرہ! میں تم سے یہ کہنے آئی تھی بیٹا! تیار ہو جاؤ۔ علی کو بھی تیار کرو۔ آٹھ گھنٹے بعد ہمیں نکلنا ہے۔“

رسول بعد اس نے اپنی ماں کو دل سے تیار ہوا دیکھا تھا۔ انہوں نے بہت خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔ جیولری بھی پہن رکھی تھی اور ہونٹوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل بھی تھا۔ وہ رسول بعد اتنی خوب صورت اور خوش لگ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے اموجان!“ نویرہ ان سے مسکرا کر بولی تھی۔ آمنہ وہاں سے واپس پلٹنے لگی تھیں۔ صرف ایک بل، بس ایک بل کے لیے اس کی نظریں اپنی ماں کی نظروں سے پھر ٹکرائی تھیں۔ وہ بل کر رہ گیا تھا۔ وہ نظریں اس سے خاموش شکوہ کر رہی تھیں۔ ان

نظروں میں درد تھا، مٹی، تھی شکایت تھی، وہ اسے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہیں یہ بے بسی تھی۔ وہ اپنی جگہ سن ساکھڑا تھا آمنہ وہاں سے جا چکی تھیں۔ ”دیکھی آپ نے اموجان کے چہرے کی خوشی؟ آج اس خوشی کو مکمل ہونے دیں زین! آج اس خوشی میں غم کا لہکا سا بھی عکس نہ پڑے۔“

اس نے اپنے ساتھ کھڑی نویرہ کی آواز سنی۔ وہ گردن ہٹھا کر نویرہ کو دیکھ کر ہنس نکھڑا۔ وہاں سے نظر ملنے کے لمحے کے حصار میں تھا۔

”ہم خود بھی والدین ہیں زین! ذرا سوچیں اگر علی چند دنوں کے لیے ہماری نگاہوں سے اوچھل ہو جائے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ اموجان آج بارہ سالوں بعد اپنے جدا ہوئے بیٹے سے ملنے والی ہیں۔ آپ ان کی خوشی میں دکھ کا یہ احساس شامل نہ ہونے دیں کہ رسول بعد ایک کھوپیا مٹا دیا پس ملا ہے تو دوسرا بیٹا ساتھ نہیں۔ ان کے بیمار اور کمزور وجود کو آج پوری طرح خوش ہولینے دیں۔ اپنی ساری فیملی کو اٹھا دیکھنے کی خوشی انہیں حاصل کر لیتے ہیں زین!“

آخر میں اگر نویرہ کا لہجہ التجائی سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”تم تیار ہو جاؤ نویرہ! تم لوگوں کو دیر ہو جائے گی۔“ بغیر اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ اس کے جواب نے نویرہ کے چہرے پر گہری مایوسی پھیلادی تھی۔ وہ مزید کچھ کہنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ وہی گلابی فراک پہن کر تیار ہو چکی تھی جو سکندر نے اسے دوپہا سے دلوائی تھی۔ سکندر تین بجے ان کے گھر آیا تھا۔ محمود خالد نے اس کی آمد کی اہمیت اور خصوصیت کو کیدار کو بتا رکھی تھی۔ اسی لیے جیسے ہی وہ آیا چوکیدار نے اسی لمحے انہیں اطلاع دی۔ اس سے بھی پہلے محمود خالد صوفے پر سے اٹھے تھے۔ وہ سکندر کے استقبال کے لیے گیٹ تک جا رہے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر ان کے پیچھے آئی تھی۔

سکندر کو کراچی کے راستوں کا علم نہیں تھا۔ اس لیے اس نے رینٹ پر گاڑی بعد ڈرائیور لے رکھی تھی۔ ڈرائیور باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلی تو محمود خالد گرم جوشی سے سکندر سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ ”آرام سے پہنچ گئے بیٹا! گھر ڈھونڈنے میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”میں صبح لہذا کو ڈراپ کرنے یہاں آیا تھا۔“ سکندر مہذب انداز اور سنجیدگی سے بولا۔ اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے اس لباس میں بہت پاری لگ رہی ہے، بل بھر کے لیے اس کی ان نگاہوں نے اسے بتا دیا تھا۔ سکندر نے اپنی نگاہیں فوراً ہی اس پر سے ہٹا کر اس کے پیلا پر مرکوز کر دی تھیں۔

محمود خالد سکندر کو گھر کے اندر لے کر جا رہے تھے۔ ان دونوں کو چار بجے گھر سے نکل جانا تھا۔ سکندر یہاں صرف ایک گھنٹے کے لیے آیا تھا اور یہ بات وہ پہلے ہی باپ کو قدرے بے موتی سے بتا چکی تھی۔ سکندر کو جلدی آنے اور اس کے گھر پرچ کر رہنے پر قطعاً اعتراض نہ تھا۔ مگر وہ ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے اور سکندر کے رشتے کے بیچ اپنے باپ کی کسی سازش کو نہیں آنے دے گی۔

وہ لوگ ڈرائیونگ رووم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ عاتشہ بھی وہاں آگئی تھیں۔ وہ دونوں بڑی گرم جوشی سے سکندر سے مل رہے تھے اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کراچی کا موسم، عرب ممالک کے معاشی حالات ابتدا ان موضوعات سے ہوئی تھی۔

سکندر اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں مٹی تلی گفتگو کر رہا تھا۔ وہ صرف اس کے ساتھ بے تکلف ہوا کرتا تھا۔ باقی سب کے ساتھ وہ جیسا سنجیدہ نظر آتا تھا ویسا ہی محمود خالد کے ساتھ بھی تھا۔

ان کی ملازمہ نے عاتشہ کی نگرانی میں چائے کے ساتھ گھر کے بنے کافی سارے لوازمات وہاں سجادیے تھے۔ ٹرائی اور میزبانوں کا تقسیم کی ڈشٹر سے بھری تھی لگ رہا تھا یہ پہلی بار گھر آنے والے داماد کا شاندار اور گرم جوشی سے بھرپور استقبال ہے۔ عاتشہ بڑی محبت

اور اپنائیت سے سکندر کو مختلف ڈشٹر پیش کر رہی تھیں۔ وہ خود بالکل چپ بیٹھی اسے باپ اور ان کی سسر کو اپنے ہونے والے داماد کی آؤ بھٹ کرتے دیکھ رہی تھی۔

”بیٹا! یہ کباب تو چکھو۔ تمہاری آنٹی بہت مزے کے بناتی ہیں۔“ محمود خالد اصرار کرتے ہوئے سکندر کی پلیٹ میں خود کباب ڈال رہے تھے۔

”لیز! اتم بھی کچھ لے لو۔“ عاتشہ پیار سے اس سے بولی تھیں۔

”میں لے رہی ہوں آنٹی!“ وہ دونوں نے زیادہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے نہ ایک دوسرے سے کوئی بات کر رہے تھے۔ سکندر سنجیدگی و شائستگی سے محمود خالد اور عاتشہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے ایک کا ایک چھوٹا سا پس کٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا تھا۔

محمود خالد سکندر سے اس کی جانب کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ بظاہر سرسری سا انداز جیسے گفتگو برائے گفتگو کے طور پر اس کے پروفیشن اور کریئر کے متعلق بات کر رہے ہوں۔ مگر وہ حقیقت وہ سکندر کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے اندازے قائم کر رہے تھے۔

سکندر سنجیدگی سے نئے تلے انداز میں انہیں اپنی جانب وغیرہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ چائے پینے کے دوران سکندر نے دوسرے گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔

”بیٹا! میرا خیال ہے۔ اب ہمیں نکلنا چاہیے۔“ سکندر کی اموجان ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ کافی دیر کے بعد کچھ بولی تھی۔

مصافحہ کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر وہ بولے۔
”مجھے بھی آپ سے مل کر اچھا لگا۔“

وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ جیسے وہ اس کی
نینی کو نینی نہیں کہتا تھا۔ اسی طرح اس کے پیپا کو نہ تو
انگل کہہ پایا تھا اور نہ ہی پیپا۔

”بہت پیاری ہے میری یہ بیٹی۔ تھوڑی سی ضدی
اور جذباتی ہے مگر اس کا دل بہت خوب صورت اور
آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے اس
نے تم جیسے باوقار اور خوب صورت شخص کا انتخاب کیا
ہے۔ اللہ تم دونوں کو سدا خوش رکھے۔“

انہوں نے مصافحہ کرنے کے بعد بھی سکندر کا ہاتھ
فورا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے تھے
بولے تھے۔ ان کے لیے میں سکندر کے لے والہانہ
محبت اور شفقت شامل تھی۔ اس نے حیران ہو کر باپ
کو دیکھا تھا۔

کہاں تھی وہ ضدی اور جذباتی؟ اس کے پیپا نے اس
کے لیے یہ الفاظ کیوں کیے؟ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی کہ
ایسی کون سی ضد کردی تھی اس نے باپ سے اور ایسا
کون سا جذباتی پن ظاہر کیا تھا۔ جس کا وہ حوالہ دے
رہے تھے۔

”تم اپنی والدہ کو یہاں لاؤ بیٹا! ہم سب ساتھ مل کر
ڈنر کریں گے۔“ عائشہ سکندر سے محبت سے بولی
تھیں۔ سکندر کی فیملی کا ذکر نہ کر کے جیسے انہوں نے یہ
احتیاط رکھی تھی۔ انہیں لیزا کی بات یاد تھی کہ سکندر
کے اپنی فیملی کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہیں۔
”جی ضرور۔“ وہ بظاہر جواب دیا۔ مسکرا کر یہی بولا تھا۔

محمود خالد اور عائشہ چاہے نہ جانتے ہوں مگر وہ جانتی
تھی سکندر کا ایسا کوئی ارادہ ہے نہ ہی کبھی ہو گا۔ وہ
صرف موقع کی نزاکت کا خیال کر کے اس بارے میں
ہامی بھر گیا تھا۔

☆☆☆

وہ سب ”فارم ہاؤس“ آچکے تھے۔ شہر کے
مضافات میں یہ ”فارم ہاؤس“ تھا۔ وہ شہر یا خان گھر

سے ملازمین لائے تھے جو یہاں سے وہاں بھاگتے
دوڑتے تمام کام انجام دے رہے تھے۔

آمنہ جیسے ایک دم ہی بالکل تندرست اور صحت
مند ہو گئی تھیں۔ وہ ملازمین کو مختلف ہدایات دیتی اور
اوسر جا آ رہی تھیں۔ باہر کھلی جگہ پر باہلی کیو کی تیاریاں
شروع ہو چکی تھیں۔ خوشی آمنہ کے ہر ہر انداز سے
ظاہر تھی۔ نوہرہ ان کی خوشی میں ان کا ساتھ دیتی
نوکروں سے ان کی مرضی کے مطابق کام کروا رہی تھی۔

گارڈن میں جہاں پر ڈنر ہونا تھا، وہاں کی آرائش،
سجاوٹ نوہرہ نے کروائی تھی۔ شوہار خان علی کو
سونمنگ سکھا رہے تھے۔ ان کے سب گھر والے
یہاں ان کے سالوں بعد لوٹنے والے بیٹے اور اس کی
ہونے والی بیوی کا استقبال کرنے کو موجود تھے سوائے
زین کے۔ وہ جانتی تھیں زین نہیں آئے گا۔ پھر بھی
دل کی خواہش تھی کہ کاش آج وہ بھی یہاں آجائے۔ کیا
صرف آج چند گھنٹوں ہی کے لیے وہ اپنی ضد اور غصہ
بھلا کر ماں کے دل کو خوشی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ
اپنے تمام گھر والوں کو اکٹھا کیا ہی جگہ پر دیکھ سکیں۔
وہ گارڈن میں ڈنر کے لیے اتنے خوب صورت

انداز میں میز اور کرسیاں وغیرہ لگوانے پر نوہرہ کو سراہ
رہی تھیں جب انہوں نے سامنے سے زین کو آتے
دیکھا۔ سفید شلوار قمیص میں سنجیدہ چہرے کے ساتھ
چلتا ہوا ان دونوں کی طرف آ رہا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں
پر یقین نہیں آیا تھا۔
”نوہرہ! یہ زین آ رہا ہے نا؟“

”جی اموجان!“ نوہرہ نے بھی بے حد خوش ہو کر
زین کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آتے زین کی طرف
دیکھ رہی تھیں۔

”کیا تم نے کہا تھا زین سے آنے کے لیے؟“ زین
کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے نوہرہ سے پوچھا۔
”کہا تو تھا۔ لیکن مجھے لگتا ہے زین میرے کہنے سے
نہیں بلکہ آپ کے کچھ بھی نہ کہنے کی وجہ سے آگئے
ہیں۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آپ کی آنکھیں جو ان

سے اتنا کچھ کہہ رہی تھیں۔ زین آپ سے پیار بھی تو
بہت کرتے ہیں اموجان!“
انہوں نے بے ساختہ اپنے برابر کھڑی نوہرہ کو دیکھا
تھا۔

”میرے دونوں بیٹے مجھ سے بہت پیار کرتے
ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی تھیں مگر ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”دعا کرو بیٹا! میری محبت ان دونوں کو پھر ایک
دوسرے کے قریب لے آئے۔ اب تو اس کے سوا اور
کوئی خواہش نہیں کہ کچھ ایسا ہو جائے ان دونوں
بھائیوں کے دل پھر سے مل جائیں۔ ان کے دلوں سے
سب رجحانیں اور ناراضیاں دور ہو جائیں۔ میں اپنے
دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ ایک ہی چھت تلے دیکھ
سکوں۔ ہم سب پہلے کی طرح پھر بھی خوشی ساتھ
رہنے لگیں۔“

”ان شاء اللہ ایسا ضرور ہو گا اموجان! یہ سال
لقدیر نے آپ کی آرزائش کی ہے۔ اب بس سب اچھا
ہو گا۔“

زین ان دونوں کے بالکل نزدیک آچکا تھا۔ انہوں
نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑے نشوے آنکھیں یوں
صاف کی تھیں جیسے آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا۔
”علی کہاں ہے؟“ زین ان دونوں کے قریب آگیا تو
جیسے اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا بات کرے۔

”وہ پیپا کے ساتھ سونمنگ کر رہا ہے۔“ نوہرہ مسکرا
کر بولی۔ زین بے حد سنجیدہ تھا۔ جیسے بحالت مجبوری
یہاں آگیا تھا مگر اسے خوش نہیں تھا۔
”اچھا ہوا زین تم بھی آگئے۔“ آمنہ آہستگی سے
بولی تھیں۔

”آپ کی وجہ سے آیا ہوں اموجان!“ وہ بے حد
سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا وہ
سکندر کے لیے آج بھی وہی محسوس کرتا ہے جو بارہ
سال پہلے کرتا تھا۔ آمنہ اور نوہرہ چپ کھڑی رہ گئی
تھیں۔ زین وہاں سے اندر چلا گیا

☆☆☆

وہ اور سکندر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ساتھ بیٹھے
ہوئے تھے۔ وہ دونوں سکندر کے پیپا کے فارم ہاؤس جا
رہے تھے۔

”تم نے میری تعریف نہیں کی۔“ لیزا نے اس سے
شکوہ کیا۔

”تعریف کس بات کی؟“ وہ مسکراہٹ لیوں پر روکتا
سنجیدگی سے بولا۔

”کسی بھی بات کی نہیں۔“ چڑ کر جواب دیتے اس
نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا تھا۔

”بیٹا! تم ہمیشہ ہی حسین لگتی ہو۔“ اس نے اپنے
نزدیک سکندر کی سرگوشی سنی۔ گردن گھما کر اس نے
اسے دیکھا۔

”ہمیشہ پاکستانی ڈریس تو نہیں پہنا ہوتا۔ آج میں
نے فرسٹ ٹائم پہنا ہے تمہارے لیے۔“ اس نے منہ
پٹا کر کہا۔ سکندر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔
”کیا میری نظروں نے تمہاری تعریف نہیں کی تھی؟“

”کی تھی مگر زبان بھی تو کرے۔“ اس بار وہ مسکرائی
تھی۔

”زبان سے تمہاری تعریف کرنے کے لیے تو مجھے
شاعر ہونا پڑے گا۔ کیونکہ عام سی تعریف تو تمہاری کی
نہیں جاسکتی۔ تمہاری تعریف تو بہت خاص لفظوں اور
خاص انداز میں ہونی چاہیے۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔
”ہاتھیں بٹائی تمہیں خوب آتی ہیں۔“ انہیں پتا ہے
لوکیوں کا دل کیسے خوش کیا جاتا ہے۔

”لوکیوں کا نہیں صرف ایک لڑکی کا۔ اپنی بیٹا کا۔“
آہستگی سے بولتے ہوئے سکندر نے گاڑی کی سیٹ پر
رکھے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ وہ سکندر
کی بات پر خوش ہو کر بے ساختہ مسکرائی تھی۔ چند
لمحوں میں وہ دونوں خاموش رہے تھے۔

”تمہارے پیپا مجھے اچھے لگے لیزا! آج بولوں تو تم سے
سن کر میں نے ان کا جو اہنج بنایا تھا، وہ اس سے بہت
مختلف ہیں۔“

اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت سنجیدگی اور

سچے دل سے اس کے پاپا کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے سکندر! وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ تلخ ہوئی تھی۔ اپنی اور سیم کی زندگی کی بہت ساری محرومیاں یاد آگئی تھیں۔

”لیکن وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے ان کے ہر ہر انداز میں تمہارے لیے والدینہ محبت محسوس کی ہے۔ وہ مجھ سے بھی اس لیے اتنی محبت سے مل رہے تھے کہ میں ان کی بیٹی کی پسند اس کا انتخاب ہوں“ سکندر بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بول رہا تھا۔

”آج انہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے مگر کل جب مجھے ان کی محبت کی ضرورت تھی تب وہ کہاں تھے؟ تم اس بات کو رہنے دو سکندر! تم نہیں جانتے انہوں نے سیم کو کتنے دکھ پہنچائے ہیں۔“ وہ ماضی کی تلخیوں میں گم ہو گئی تھی۔

”اوکے! ہم اس ٹاپک کو رہنے دیتے ہیں۔ تم سیم کا ذکر کر رہی ہو۔ یہ بتاؤ وہ آج ایرپورٹ کیوں نہیں آئی تھی؟“

اس کا موڈ خراب نہ ہو اس خیال سے سکندر نے فوراً ہی موضوع تبدیل کر دیا تھا۔

سیم آج اسے لے گئی کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ سکندر کو وجہ نہیں بتا سکتی تھی۔ جس سہولت سے اس نے اپنے پاپا کے متعلق منفی باتیں سکندر سے کر لی تھیں، سیم کے بارے میں نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سکندر کو یہ کیسے بتا دیتی کہ سیم ان دونوں کی شادی پر خوش نہیں ہے اور ناراضی کے اظہار کے طور پر ایرپورٹ نہیں آئی تھی۔ اگر وہ ایسا کچھ کہتی تو شاید سکندر کے دل میں یہ بات رہ جاتی۔ پھر جب وہ سیم سے ملتا تو یہی سوچ کر ملتا کہ لیزا کی بہن اسے سخت ناپسند کرتی ہے اور پھر شاید جواب میں سکندر بھی سیم کو ناپسند کر دیتا۔

سکندر اور سیم اس کی زندگی کے اہم ترین لوگ، ان دونوں کو ایک دوسرے کو پسند کرنا چاہیے تھا، ایک دوسرے کا دوست ہونا چاہیے تھا، ایک دوسرے کے ساتھ ان کا بہت اچھا بہت خوشگوار اور دوستانہ تعلق

ہونا چاہیے تھا۔ سچ وہ بول نہیں سکتی تھی اور جھوٹ بول کر اپنے اور سکندر کے رشتے کی سچائی اور خوب صورتی کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے مناسب یہی لگا کہ وہ اس سوال کو نہ سننے کا تاثر دے کر نظر انداز کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

”تم آج بہت سالوں بعد اپنے گھر والوں سے ملو گے ناں؟“ اس نے سکندر کی طرف دیکھا تھا۔

”ہاں! پورے بارہ سال بعد۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

اس نے لیزا کے جواب نہ دینے کو محسوس نہیں کیا تھا۔

”تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”پتا نہیں لیزا! میرے اندر کوئی فیلنگز ہی نہیں ہیں اس وقت۔ ایسا لگ رہا ہے سب کچھ مشینی سے انداز میں ہو رہا ہے بغیر کسی بھی اور طرح کی فیلنگز کے۔ میں نے اپنی پیار ماں کے دل کو خوشی دینی ہے اس کے سوا میرے دل میں کوئی احساسات نہیں ہیں۔“

وہ پھر سے اپنے اندر جھانکنے لگا تھا۔ وہ سکندر کے درد اور اس کے گرب کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ جنہوں نے اسے دھکا دیا تھا، اس کی تبدیل کی تھی اس سے بارہ سال پہلے لا تعلقی کا اعلان کر دیا تھا، وہ آج صرف اپنی ماں کی خاطر ان سب کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔



وہ دونوں فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ وہ سکندر کے ساتھ گاڑی سے اتری۔ اسے بالکل سامنے سکندر کی اموجان، ایک پیاری سی لڑکی اور ایک بچے کے ساتھ اپنے اور سکندر کے استقبال کے لیے کھڑی نظر آئیں۔

ان تینوں سے بہت دور گاڑوں میں درختوں کے پاس اسے ایک باوقار سے شخص بھی نظر آ رہے تھے۔ بہت فاصلہ تھا، شکل واضح نہیں تھی۔ صرف کھڑے ہونے کا شاندار اور باوقار انداز بتا رہا تھا۔ پس منظر میں کھڑے وہ شخص کیا سکندر کے پاپا تھے؟ سکندر کی تو

شاید اس طرف نگاہ بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ گاڑی سے اترتے ہی سیدھا اپنی ماں کی طرف بڑھتا تھا۔

اس کی اموجان بھی تڑپ کر اس کے نزدیک آئی تھیں۔ انہوں نے بالکل عجولانہ ہی انداز میں سکندر کو پھر گلے سے لگایا تھا۔ وہ بھی اس کا ہاتھ چوم رہی تھیں، بھی اس کے ہاتھ۔ وہ جیسے ابھی تک اسی خوف کے حصار میں تھیں کہ ان کا بیٹا ان سے پھر نہ بچھڑ جائے۔

”ہائے لیزا۔“ اس نے سکندر اور اس کی اموجان سے نگاہیں ہٹا کر اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر پر خلوص، دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

”ہائے۔“ وہ جواباً احتیاط سے مسکرائی تھی۔

سکندر کا اپنی اموجان کے سوا باقی تمام افراد کے ساتھ کیا رویہ ہوتا تھا اسے اسی لحاظ سے یہاں باقی افراد کے ساتھ گفت و شنید کرنی تھی۔ اس نے نوریہ کا ہاتھ ہاتھ تھام لیا تھا۔

”میں نوریہ ہوں۔ اموجان کی چھوٹی بہن اور بہت جلد آپ کی دیورانی بن جاؤں گی۔ یہ میرا بیٹا ہے علی۔ اسلام کرو لیزا آئی کو۔“

اس نے اسے ساتھ کھڑے بچے سے کہا۔ اسے شاید سمجھا گیا تھا کہ اس نے مہمانوں کے سامنے زیادہ شرارتیں نہیں کرنی۔ اس لیے وہ بڑا سعادت مند سا بنا کھڑا تھا مگر اس کی آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی تھیں۔ یقیناً وہ بہت شریر بچہ تھا۔

”اگر میرے مرنے کی اطلاع آئی تو اس پر سب سے زیادہ خوش ہونے والا وہوتا۔“

اسے بے اختیار سکندر کی کل صبح کی بات یاد آئی۔

نوریہ سکندر کے بھائی کی بیوی اور اس کا بیٹا تھا۔ سکندر ابھی تک روٹی ہوئی آمنہ کو سنبھال رہا تھا۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر پھر جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتی تھیں۔

”السلام علیکم لیزا آئی۔“ علی نے ماں کے حکم پر فوراً اسے سلام کیا تھا اور بالکل بیروں والے انداز میں

مصافحے کے لیے سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اسے وہ گول مٹول سا شرارتی بچہ بہت پیارا لگا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بے ساختہ اس نے جھک کر اس کے گلے پر ہاتھ کیا تھا۔

”وعلیکم السلام علی۔“

”اصولاً“ تو علی کو آپ کو اتنی امی یا بڑی ماما بلانا چاہیے۔ مگر اتنی بیک سی لڑکی کو اتنے بھاری بھر کم ناموں سے پکارنا اچھا تو نہیں لگے گا۔ میرا خیال ہے لیزا آئی ہی انحال ٹھیک ہے۔“

نوریہ اس سے ہنس کر بولی۔ اگر سکندر کو اس کے پاپا اچھے لگے تھے تو اسے بھی ابھی تک سکندر کے گھر کا کوئی فرد برا نہیں لگا تھا۔ خوش اخلاق، ملنسار، محبت کرنے والا، وہ چاہے سکندر کی اموجان ہوں یا نوریہ یا پھر یہ کیوٹ سا بچہ۔ وہ ان سب سے مل کر کسی تین لفظ سوچ رہی تھی جبکہ وہ سکندر سے سننے کے بعد اس کی فیملی کے متعلق بہت مختلف رائے لے کر آئی تھی۔ وہ جواباً مسکرائی تھی۔ تب تک آمنہ اور سکندر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

”لیزا ابھی کیا سوچ رہی ہو گی۔ میں نے اپنی بیٹی کو پیار بھی نہیں کیا۔ ماشاء اللہ اس پاکستانی لباس میں کتنی خوب صورت لگ رہی ہے میری بہنو۔“ آمنہ اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگی تھیں۔ نوریہ اب سکندر سے مخاطب تھی۔

”السلام علیکم سکندر بھائی!“

”وعلیکم السلام۔“ وہ آمنہ کے اس کی خیر و عافیت کے متعلق سوالوں کے جواب دے رہی تھی پھر بھی اس کا دھیان سکندر کی طرف تھا۔ نوریہ نے سکندر کو بھی اتنی ہی گرم جوشی اور دوستانہ انداز و اپنائیت سے سلام کیا تھا جس طرح اس سے ہائے پہلو کی تھی۔ مگر سکندر کا جواب سنجیدہ تھا اور ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ جیسے کسی اجنبی۔ کے سلام کا جواب دے دیا جاتا ہے۔

”سکندر بھائی! میں آپ کی بھابھی ہوں اور یہ شریر بچہ آپ کا بھتیجا ہے۔“ نوریہ مسکرا کر سکندر کو بتا رہی

تھی۔ سکندر سنجیدہ اور سپاٹ چہرے کے ساتھ نوریہ اور علی کو دیکھ رہا تھا۔
 ”السلام علیکم سکندر بیلا۔“ علی کو جیسے ماں نے سب پہلے سے سمجھا رکھا تھا۔ وہ بڑے مزے دار سے انداز میں بولتا سکندر کی بھی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ سکندر نے علی کی طرف جھک کر اس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ مگر نہ تو وہ بچے کی معصوم سی حرکت پر مسکرایا تھا نہ ہی اس نے اسے چھونے یا پیار کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس فیملی میں شامل ہونے جا رہی تھی مگر ابھی وہ ایک اجنبی کی طرح تمام افراد کے عمل اور رد عمل دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ آمنہ کو علی کا سکندر کو ”سکندر بیلا“ کہنا بہت اچھا لگا تھا انہوں نے بے اختیار بہت پیار سے اپنی ہو کو دیکھا تھا۔ گویا یہ نام بچے کو نوریہ آج ہی سکھا کر لائی تھی۔ سکندر یہاں آتے ہی اسے اتنا ہی سنجیدہ نظر آنے لگا تھا جتنا روم میں ملاقات کے ابتدائی دنوں میں لگا تھا۔ چہرے پر سرد اور سپاٹ تاثرات اور اجنبیت کیا دیا فارمل سائیک ایسا انداز کہ کوئی بھی اس سے ضرورت سے زیادہ بات کرنے سے احتراز کرتے۔

وہ اس وقت اس پر اپنا آپ کھول دینے والا اپنی کمزوریاں بتا دینے والا سکندر نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سنجیدہ اور سپاٹ تھیں۔ ان میں کسی بھی طرح کے کوئی جذبات نہیں تھے۔
 ”ہمارے گھر میں علی کی شرارتوں سے سارا وقت رونق رہتی ہے۔“ آمنہ مسکرا کر اسے اور سکندر کو بتاتے لگیں۔

”اموجان! ایسا آپ سکندر بھائی اور لیزا کو بیس کھڑا رکھیں گی؟“
 نوریہ نے آمنہ کو مخاطب کیا۔ سکندر کا سنجیدہ اور فاصلہ لیا انداز محسوس کر کے نوریہ قدرے محتاط ہی ہو گئی تھی۔

”ارے ہاں۔ چلو بیٹا آؤ۔ چل کر بیٹھے ہیں۔“ آگے چلنے کی بات پر اس نے ایک دم پھر درختوں کی

طرف دیکھا۔ اب اسے وہاں پر کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔
 وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے مصنوعی جھیل کے پاس گارڈن میں آگئے۔ جہاں آرام دہ کرسیاں ڈٹی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں میں سے ایک پر سکندر کے پیلا بیٹھے تھے۔ جس شخص کو ابھی اس نے بہت دور سے دیکھا تھا گویا وہ یہی تھے؟

کسی تعارف سے پہلے ہی اسے پتا تھا وہ سکندر کے پیلا ہیں۔ باپ اور بیٹے میں مماثلت جو اس قدر تھی۔ سکندر اپنے باپ کی جوتی تھا۔ شہیار خان سکندر کا بڑھاپا تھے۔ ہلاکی مشابہت تھی باپ بیٹے میں۔ شہیار خان ان لوگوں کو آتا دیکھ کر فوراً ”کرسی سے اٹھتے تھے جیسے مہمانوں کی آمد کے موقع پر کھڑا ہوا جاتا ہے۔ اس نے بے اختیار سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ بل بھر کے لیے اسے سکندر کے چہرے پر ایک درد بھرا تاثر نظر آیا جیسے ماضی کا وہ تلخ لمحہ یاد آگیا ہو جب بیس سال کی عمر میں اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگلے پل وہ پھر سے اپنے چہرے کے تاثرات کو سرد اور سپاٹ بنا چکا تھا۔

اس نے آمنہ اور نوریہ کے چہروں پر یہ تاثر دیکھا جیسے وہ دونوں بھی نہیں جانتی تھیں کہ شہیار خان سکندر سے کس انداز میں ملیں گے۔ کرسی سے اٹھنے کے بعد وہ سکندر ہی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”السلام علیکم۔“ سکندر نے دور کھڑے کھڑے غیر جذباتی اور سپاٹ سے انداز میں انہیں بغیر پیلا پارے سلام کیا تھا۔

”و علیکم السلام۔ کیسے ہو سکندر!“
 وہ اس کے نزدیک آئے تھے۔ گلے لگتا تو بہت بڑی بات ہے وہاں تو ہاتھ بھی نہیں ملایا گیا تھا۔ سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ کر کے پیچھے باندھ رکھے تھے۔

”تھک ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ تاہم کیوں مگر اسے ایسا لگا تھا جیسے شہیار خان سکندر کو گلے لگانا چاہتے تھے۔

وہ اسے بہت خست سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس

کے قریب جانا چاہتے تھے مگر قریب جانے سے ڈر بھی رہے تھے۔
 باہول میں ایک عجیب سا کھنچاؤ، تکلف اور اجنبیت پھیل گئی تھی۔ آمنہ بیگم سکندر اور شہیار خان دونوں کو محتاط سے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ باہول میں پہلی اجنبیت، تکلف اور خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ ان دونوں سے بولیں۔
 ”بیٹھو بیٹا! لیزا تم بھی بیٹھو بیٹا۔“ آمنہ کے کہنے ہی وہ سب کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

علی بجائے ان سب کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کے گھاس پر بھاگ دوڑ کرنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا، وہاں سب تھے سوائے سکندر کے بھائی کے۔ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں بھیج کر کیا وہ خود آیا ہی نہیں تھا؟ سکندر سنجیدگی اور خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔

باپ اور نوریہ کے سامنے وہ ماں کے ساتھ بھی فارمل سا ہو گیا تھا۔ جیسے ماں کے ساتھ جاہت، محبت اور جذبات کا والہانہ اظہار وہ ان لوگوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈز کا تکلف وہ سناٹا حائل رہا تھا ان چاروں کے بیچ۔ نوریہ بھی محتاطی ہو کر چپ بیٹھی تھی۔ آمنہ نہ جانے کس پریشانی اور خوف میں تھیں۔ وہ ایک پل خاموش بیٹھے گھاس کی طرف دیکھتے سکندر کو دیکھتیں، دوسرے پل سنجیدہ بیٹھے شہیار خان کی طرف، پھر جیسے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے آمنہ ہی نے لیزا کو مخاطب کیا۔

”پاکستان پہلی مرتبہ آئی ہو لیزا!“
 ”جی اموجان!“ اس نے آمنہ کو مسکرا کر جواب دیا۔

اسے پہلی مرتبہ شہیار خان کی نظریں خود پر محسوس ہوئیں۔ اتنی دیر میں انہوں نے یا تو سکندر کو دیکھا تھا یا پھر بھانجے دوڑنے علی کو۔ باقی سب سے وہ قدرے لائق تھے۔ اس پر تو جیسے ابھی تک انہوں نے دھیان بھی نہ دیا تھا۔ سکندر اور شہیار خان دونوں خاموش تھے۔ ان کی خاموشی بے حد بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ شہیار خان نے خاموشی توڑنے میں پہلی کی تھی

مگر ان کی مخاطب وہ تھی۔
 ”کیا کرتی ہیں بیٹا آپ؟“

ان کا لہجہ شائستہ اور سنجیدہ تھا۔ نگاہوں میں اس کے لیے نرمی اور عزت تھی۔
 ”میں لندن کے ایک کالج میں لینڈ اسکیپ اور اسٹل لائف پینٹنگ پڑھاتی ہوں۔ آرٹسٹ ہوں‘ پینٹنگز بناتی ہوں۔“ وہ ان کا مشاہدہ کرنے میں ایسی مگن تھی کہ اس سوال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھی۔ ان کی شخصیت کے رعب سے متاثر ہو کر اس نے اپنا کچھ نامکمل سا تعارف کروایا۔

”آپ لندن میں رہتی ہیں؟“ وہ اسے آپ کر کے مخاطب کر رہے تھے مخاطب کرنے کے انداز میں آمنہ جیسی محبت یا والہانہ پن نہیں تھا مگر اسے شائستگی نرمی اور اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

سکندر اس کی اپنے پیلا سے گفتگو سے لافطی ظاہر کرتا آہستہ آواز میں اپنے برابر بیٹھی آمنہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ گویا اسے اپنے باپ کی لیزا سے گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
 ”جی انکل!“

”اور آپ کے پیر مش؟“
 ”میرے پیر مش کی ڈاٹی دوسر ہو چکی ہے۔ میرے فادر پاکستان میں رہتے ہیں اور دراصل میں۔“ وہ سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ اسے دو ایک بار شک ہوا کہ شہیار خان اس سے گفتگو کے دوران گاہے گاہے سکندر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جب اس کی نگاہیں آمنہ پر ہوئی ہیں تب وہ جیسے چپکے سے اسے دیکھتے ہیں۔

”سکندر بتا رہا تھا۔ لیزا بہت مشہور آرٹسٹ ہے۔ ابھی ایک دو ہفتے پہلے فلورنس میں اس کا سولو شو بڑا کامیاب گیا ہے۔“

سکندر سے گفتگو چھوڑ کر آمنہ نے فوراً شہیار خان کو بتایا۔ گویا اتنی دیر سے بظاہر سکندر سے باتیں کر رہی تھیں مگر ان کا دھیان اوھر بھی تھا۔ اسے سکندر کی اموجان کے اس انداز پر پیار آیا۔ نہ اس نے

شہریار خان کے سامنے اوجھے پن سے اپنی اور اپنی فیملی کی شان و اعلیٰ تہ تیہ تیار تھا نہ پیشنگ کے حوالے سے اپنی شہرت کا ذکر کیا تھا۔ مگر آمنہ جیسے چاہتی تھیں کہ ان کی ہونے والی ہوگی ہر خوبی سب کو بتا چلے۔

”دیری گڈ لایہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ شہریار خان ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”کیا پیٹ کرتی ہو لیزا؟“

اس بار انہوں نے اسے تم کہہ کے مخاطب کیا۔ جیسے تکلف اور اجنبیت کو دور میان سے ہٹا دیا ہو۔ وہ جواباً شائستگی، احترام اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پیشنگ میں اپنے خاص موضوعات انہیں بتانے لگی۔

سکندر ان دونوں سے لا تعلق اسی طرح اس سے محو گفتگو تھا۔ علی بھاگتا ہوا نوریہ کے پاس آیا تھا۔

”ملا! آتش دکھائیں۔“ اس کی فرمائش پر نوریہ کرسی سے اٹھی۔

”او لیزا! تم بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔“

اس نے فوراً ”سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی الجھن کا شکار تھی کہ یہاں اگر کوئی اس کے ساتھ اپنائیت اور محبت سے پیش آئے تو اسے جواباً ”کیا کرنا چاہیے۔“ سکندر نے اسے نہیں دیکھا تھا اگرچہ وہ اس کا اپنی طرف دیکھتا محسوس کر چکا تھا۔ گویا اس کی مرضی تھی۔ اس نے جانا ہے تو جائے، نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے۔ وہ نوریہ کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ گئی۔



وہ یہاں آکر اتنی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا کہ وہ لیزا کو گانڈ بھی نہ کر سکا کہ وہ کیا کرے، گمان نہ کرے۔ ماضی کو یاد کرنا، خود پر گزری قیامتوں کو سوچنا اسے خود پر ترس کھانا لگ رہا تھا مگر پھر بھی یہاں آکر بتا نہیں کیا کیا بھولا بھرا پھر یاد آنے لگا تھا۔ وہ تینوں اب پھر خاموش تھے۔

”ماشاء اللہ لیزا بہت پیاری ہے سکندر! تم سے سن کر جیسا میں سوچ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔“

وہ باپ بیٹا آپس میں مخاطب نہ ہوئے تھے۔ وہ بیٹا نہیں جیسے دو اجنبی تھے، جنہیں ایک ہی جگہ لا بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے بیچ خاموشی اور فاصلہ تھا۔ بجائے انہیں یا آمنہ کو دیکھنے کے، لا تعلق سا بیٹا سامنے لیزا کو بھیل کے پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں کی چھوٹی بہو اور پوتا بھی کھڑے تھے۔

”تم سڈل انٹر نیٹل میں جاب کر رہے ہو؟“

اس نے شہریار خان کا سوال سنا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں صرف اجنبیت اور فاصلہ تھا۔ شہریار خان کی نگاہوں میں کیا تھا اس نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”جی۔“ بارہ سال پہلے اسے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ انہیں پابانہ کے اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کا اس گھر کے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا وہ انہیں پابانہ کے رہا تھا۔ نہ ماں کے سوا یہاں کسی کو اپنا نہ سمجھ رہا تھا۔

”بہت اچھی کمپنی ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ہیں۔“ شہریار خان اس سے سنجیدگی سے بولے تھے۔

آگے بڑھنے کے مواقع؟ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر کچھ پیدا ہوتی تھی۔ کیا آگے بڑھنے کے راستے اس کے لیے بند نہیں کر دیے گئے تھے؟ کیا اسے ذلت بھری کھائی میں دھکیل نہیں دیا گیا تھا؟ کیا اس کا پیار، اس کا وقار، اس کی شخصیت کی آن بیان اس سے چھین نہیں لی گئی تھی؟ کیا اسے یہ نہیں بتا دیا گیا تھا کہ وہ ان سب کے لیے مرجھا ہے، کیا اسے رسوائیاں اور ذلتیں نہیں بخش دی گئی تھیں؟ کم از کم ان لوگوں پر اس کی ترقی اور آگے بڑھنے کی بات بچتی نہیں تھی۔ ان لوگوں سے تو اس کی تباہی و بربادی ہی کی باتیں اچھی لگ کر رہی تھیں۔ اس سے انکار نفرت اور اعلان لا تعلق ہی سجا کر رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر کسی بھی طرح کے جذبات کو آنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کو مکمل طور پر سپاٹ، سرد اور غیر جذباتی کر رکھا تھا۔



علی بانی کے پاس جب کہ کھڑا رنگ برنگی پھولیوں خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس کھڑی تھیں۔

”سکندر بھائی کی پسند لا جواب ہے۔ میں نے جب سے اموجان سے سنا تھا سکندر بھائی کی ہونے والی بیوی اٹالین ہے، حضور ہی تصور میں تمہارا ایک خاکہ بنایا تھا۔ اٹالین مرد اور عورتیں بہت خوب صورت ہوتے ہیں ناں۔“

نوریہ بے تکلفی سے اس سے بولی تھی۔ وہ عمر میں شاید اس سے ایک دو سال چھوٹی بھی مگر بے تکلفی سے اسے تم کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تعریف پر مسکرائی۔

”تھینکس۔“

”تم اردو کیسے بول لیتی ہو؟ ہم تو سمجھ رہے تھے ہمیں تم سے انگلش میں بات کرنی پڑے گی۔“

”میں مکمل اٹالین نہیں ہوں۔ میرے پیلا پاکستانی ہیں۔“

”ہاں یہ تو مجھے بتا ہے۔ اموجان نے بتایا تھا۔ مگر تم دیکھنے میں بالکل اٹالین لگتی ہو۔ اگر اردو نہ بولو اور یہ پاکستانی ڈریس نہ پہنا تو تم مکمل اٹالین لگتی ہو۔“

یہاں سکندر نہیں تھا، اس لیے وہ جواباً ”کھل کر مسکرائی۔ وہ یہاں سکندر کے حوالے سے ان لوگوں سے مل رہی تھی مگر اس سے خود بے تحاشا خوش انقلابی، گرم جوشی اور محبت سے ملتی اس لڑکی سے رکھائی نہیں رہتی جارہی تھی۔

”سب یہی کہتے ہیں۔ ایک چوٹلی میں شکل صورت میں اتنی می پر ہوں۔ تم میری بسن سے ملو تو وہ تمہیں بالکل پاکستانی لگے گی۔ وہ شکل و صورت میں میرے پیلا ہے۔“

نوریہ نے جواباً ”مسکرا کر ہلایا تھا۔“ تم سکندر بھائی سے کہاں ملیں؟“

”روم میں۔“

”روم میں؟ واؤ! سورومائیک۔ اتنی رومانٹک جگہ پر مل کر تو یہ رشتہ بننا ہی تھا۔ کیا سکندر بھائی نے ترویج میں تین کوانٹز (سکے) اچھالے تھے؟“ نوریہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ جواباً ”کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”تین کوانٹز نہیں اچھالے تھے پھر بھی ہماری شادی ہو رہی ہے۔“

نوریہ بھی زور سے ہنسی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی دور کرسیوں پر بیٹھے شہریار خان، آمنہ اور سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر نے تلے سنجیدہ سے انداز میں آمنہ سے باتیں کر رہا تھا۔ سکندر اور شہریار خان کے بیچ وہ کرسی خالی تھی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ شہریار خان بظاہر وہاں بیٹھے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ مگر ان کی نگاہیں مسلسل سکندر پر تھیں۔ اسے شہریار خان کی شخصیت بڑی اچھی ہوئی سی لگی۔ وہ خود کو ظاہر کچھ اور کر رہے تھے، ان کے اندر کچھ اور تھا۔ وہ بظاہر خرو غور سے سرمٹے بیٹھے تھے، ان کی شخصیت باوقار اور باریع نظر آ رہی تھی۔ مگر اسے ان کی آنکھوں میں مسلسل ایک بے چینی اور ایک اضطراب نظر آ رہا تھا۔ جو سطح پر نظر آ رہا تھا شاید گہرائی میں وہ نہیں تھا۔ شاید وہ اندر سے بہت مختلف انسان تھے۔ اسی وقت کسی ملازم نے آکر آمنہ سے کچھ کہا تھا۔ آمنہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ان لوگوں کو آواز دی تھی۔

”نوریہ! لیزا! آ جاؤ تم لوگ کھانا لگ گیا ہے۔“

چونکہ رات زیادہ ہونے سے قبل ان لوگوں کو واپس بھی پینہ تھا اس لیے کھانا جلدی لگایا گیا تھا۔

”آ جاؤ لیزا!“ نوریہ اپنائیت سے اس سے بولی۔ علی بھاتا ہوا وہاں جا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے وہاں آ گئی تھی۔ آمنہ، شہریار خان اور سکندر کچھ کرسیوں پر سے اٹھ چکے تھے۔

”زین کہاں ہے؟ بلاؤ اسے بھی۔“ آمنہ نے نوریہ سے کہا۔

”جی اموجان! میں بلا کر لاتی ہوں۔“ اس نے فوراً سکندر کی طرف دیکھا۔ سکندر کا چہرہ ہنوز بے اثر تھا۔ گویا زین کے آنے یا نہ آنے سے اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ نویر وہاں سے چلی گئی تھی۔

فارم ہاؤس کے روز گارڈن میں ڈنر کے لیے میز اور کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ چاروں اطراف کچڑیوں اور قسموں کے گلاب نظر آ رہے تھے۔ ان کے دلکش رنگ اور بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر اور خوشگوار بنا رہی تھی۔

گارڈن کی تمام لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ اگرچہ ابھی مغرب کا ہی وقت تھا اور اندھیرا پھیلا نہیں تھا۔ مگر وہ جگہ کوئلن لائٹس سے جگمگادی گئی تھی۔ گارڈن سے اس پار قدرے فاصلے پر بابلی کیو ہوا تھا اور گرم گرم نان بھی وہیں لگ رہے تھے۔

وہ سب لوگ کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ ملازمین نے بڑی پھرتی اور مستعدی سے میز پر گرم گرم نان اور بابلی کیو ڈشز لاکر سروس کرنا شروع کی تھیں۔ اسی وقت اس نے نویرہ کو ایک پنڈم شخص کے ساتھ اس طرف آدیکھا۔ سکندر سے مشابہت نہ تھی پھر بھی نویرہ کے ساتھ اسے آتا دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ سکندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ پنڈم تھا مگر سکندر جتنا نہیں۔ اس کی شخصیت سکندر جیسی شان دار نہیں تھی۔

سکندر اپنے پیارے بھائی پر تھا اور اس کا بھائی اموجان پر۔ اسے وہ نویرہ کے ساتھ چلتا اس کی دوستانہ فطرت کے بالکل برعکس لگ رہا تھا۔ بے تحاشا سنجیدہ چہرہ اور ایسا انداز جیسے اسے یہاں جبراً لایا گیا ہے۔ وہ میز تک آگیا تھا۔ لیزا نے سکندر کی طرف دیکھا۔

وہ زین کو نظر انداز کر کے اپنے موبائل پر آیا کوئی مہیجہ دیکھنے لگا تھا۔ زین نے بھی میز پر بیٹھے تمام لوگوں کی طرف دیکھا تھا سوائے سکندر کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کر رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“ زین بطور خاص کسی کو مخاطب کے بغیر سلام کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ بیٹھے جس فرد کا دل چاہے یہ سمجھ لے کہ اس نے سلام کیا ہے۔

وہ سکندر کے برابر بیٹھی تھی اور سکندر کے دائیں جانب آمنہ بیٹھی تھیں۔ زین سامنے والی کرسی پر نویرہ کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ علی شہر خان کے برابر بیٹھا تھا۔ اسے ان دونوں بھائیوں کے چروں پر تناؤ اور سختی نظر آتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

باقی تمام افراد ماحول کی اس ٹینشن کو بظاہر نظر انداز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر حقیقت وہ سب اس تناؤ کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔

”لیزا! اتم ٹھیک سے لو بیٹا!“ اس نے شہر خان کی آواز سنی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس میں دیکھا۔ نیچلے کیوں اسے ان کی نگاہوں میں ایک باپ کی بے بسی نظر آتی۔

نویرہ میاں کاموڈ دیکھ کر اس وقت بالکل خاموش تھی۔ آمنہ اور شہر خان ماحول کی گھبراتا اور تناؤ کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”ہاں لیزا! ابویٹا۔“ آمنہ بھی فوراً بولیں۔ ”میں لے رہی ہوں۔“ وہ ہلکی مگر اہٹ کے ساتھ بولی۔ سکندر نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاوا ڈال رکھا تھا۔ وہ پلیٹ میں کانٹا اوھر اوھر گھما کر بے رغبتی سے کھا رہا تھا۔ یہ سلاوا بھی جیسے اس نے مروتا اور مجبورا کھالیا تھا۔ شہر خان نے ملازم کو آواز دے کر بلایا تھا۔ ملازم دوڑا دوڑا فوراً وہاں آیا تھا۔

”مٹن جی اور لے کر آؤ، بالکل گرم اور اچھی بنی ہوئی۔“ ملازم ان کا حکم سنتے ہی فوراً واپس پلٹا تھا۔ اب اس سے مخاطب تھے۔

”تمہارے اٹالین کھانوں کی طرح ہمارے پاکستانی کھانوں میں بھی تمہیں بہت دورائی ملے گی۔“

زین سب سے لائق سربھگائے کھانا کھا رہا تھا۔ وہ کسی کی بھی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ زین کو قریب سے بغور دیکھ کر نہیں کیوں بار بار اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا ہے؟ کب؟ کہاں؟ اسے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔

”جی انکل! مجھے پتا ہے پاکستانی کھانے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔“ ملازم مٹن جی خوب صورت ڈش میں رکھ کر لے آیا تھا۔ شہر خان نے خود اس کا ایک پیس کاٹ کر اس کی پلیٹ میں رکھا تھا۔

”یہ ٹرائل کو تمہیں اچھی لگے گی۔“ سکندر کی پلیٹ میں بھی ڈالو۔

انہوں نے ڈش اس کی اور سکندر کی طرف بڑھائی تھی۔ اس نے محسوس کیا آمنہ اور نویرہ شہر خان کو حیرت سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ اپنے مزاج سے ہٹ کر کچھ کالم کر رہے تھے۔ ”تمہیں دوں سکندر؟“ اس نے آہستگی سے اس سے پوچھا۔

اس نے سنجیدگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس نے شہر خان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اور سکندر ہی کو دیکھ رہے تھے۔

سکندر کا انکار میں ہلٹا سر انہوں نے دیکھا تھا۔ اسے ایک بار پھر شہر خان کے چہرے پر غم اور بے بسی نظر آتی تھی۔

زین ہر چیز کھا رہا تھا۔ اس طرح جیسے یہاں صرف اور صرف کھانا کھانے ہی کے لیے آکر بیٹھا تھا۔ سب کھانا کھا چکے عجب کھانے کی میز سے سب سے پہلے اٹھنے والا زین تھا۔

”تم کہاں چلے؟“ شہر خان نے اس سے پوچھا۔ ”سر میں تھوڑا درد ہے!“ اس نے سر ہٹ کر دیکھا۔ ”سنجیدگی سے بولتا تو فوراً“ وہاں سے جانے کے لیے مڑا تھا۔ پھر ان دونوں کو خدا حافظ کہہ جیسے وہ سکندر اور اس کی ہونے والی بیوی سے مخاطب ہونا تو دور ان کی شکلیں تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

اسے زین اچھا نہیں لگتا تھا۔ جو بھی ناراضی کی نظر اس کا بھائی پورے بارہ سال بعد اس کے سامنے آیا تھا۔ کیا وہ مروتا بھی بھائی کے ساتھ سلام دعا نہیں کر سکتا تھا؟ سکندر کا دکھ اس نے پھر نئے سرے سے محسوس کیا تھا۔ ظلم بھی اسی کے ساتھ ہوا تھا اور مجرموں جیسا سلوک بھی اسی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ بجائے اس پر ہونے ظلم پر شرمندہ ہونے کے وہ تو ابھی تک اس کے خلاف دل میں نفرت لے کر بیٹھا تھا۔

وہ سب بھی میز پر اسے اٹھ گئے تھے۔ زین اندر جا چکا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔“ سکندر سنجیدگی سے آمنہ سے بولا۔

”سب ساتھ کافی فی لیتے ہیں۔ پھر چلے جانا۔“ شہر خان نرم لہجے میں سکندر سے بولے۔

”دیر ہو جائے گی۔ لیزا کے پیلا گھر پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ جواباً سنجیدگی ہی سے بولا تھا۔ ”ٹوک سے انداز میں۔ گویا یہاں مزید نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔“

اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر شہر خان نے نویرہ کو کچھ اشارہ کیا تھا۔ وہ فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ سب آہستہ قدموں سے چلتے روز گارڈن سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ لوگ واپس وہیں آگئے تھے جہاں پر یہاں آنے کے بعد بیٹھے تھے۔ جھیل کے نزدیک والی جگہ۔

نویرہ تیزی سے واپس آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جیولری باکس تھا۔ نویرہ نے وہ جیولری باکس آمنہ کو لا کر پکڑ لیا تھا۔ باکس کا ساڑن بتا رہا تھا اس میں سونے کی جوڑیاں یا نگین ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک دم گھبرا گئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر سکندر کی طرف دیکھا تھا۔ کیا اسے کوئی خفہ یہاں سے لیتا تھا یا نہیں لیتا تھا؟

”بہت اچھی لگی ہو تم مجھے۔ اللہ تمہیں اور سکندر کو ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ تمہارے دل پر یونی مجھ سے ملے رہیں۔“ آمنہ نے دعائیں دیتے ہوئے

یاس کی طرف بڑھایا تھا۔

”یہ چھوٹا سا ختہ تمہارے لیے میری طرف سے“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ سکندر ان سے بولا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے اموجان! کسی بھی ختے سے زیادہ قیمتی ہمارے لیے آپ کی دعائیں ہیں۔ آپ بس ہمیں اپنی دعائیں دیں۔“

اس کا کجہ عزت اور احترام لیے مہذب سا تھا مگر اس کی نگاہوں میں سختی اور انکار تھا۔ وہ یہاں سے کچھ نہیں لے گا۔ نہ اپنے لیے نہ اپنی بیوی کے لیے۔ ”پھر بھی بیٹا! میری خوشی تھی۔ میری ہوسہیلی بار مجھ سے ملنے آئی ہے۔“

آمنہ کا کجہ مرجھا سا گیا تھا۔ مگر اس وقت سکندر نے ماں کے لیے میں شامل دکھ کو، ان کی آنکھوں میں در آئی غم کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”تو آپ نے اسے اتنی ڈھیر ساری دعائیں دی تو وہیں دنیا کا قیمتی سے قیمتی ختہ آپ کی دعاؤں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔“

وہ خاموش نمٹائی کی طرح ماں اور بیٹی کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے شہزاد خان کو آمنہ کی طرف اشارہ کرتے دیکھا کہ وہ سکندر سے مزید اصرار نہ کریں۔ جیسے وہ سمجھ گئے تھے۔ سکندر سے کتنا بھی اصرار کر لیا جائے وہ یہاں سے ایک کنکریا پتا تک لے جانے کا روادار نہ ہو گا۔

اس نے صرف آمنہ ہی کے نہیں شہزاد خان کے چہرے پر بھی مایوسی چھلتی دیکھی۔ اس کی طرح نویرہ بھی اس چوہن میں بالکل خاموش تھی۔ آمنہ شوہر کا اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

”اچھا بیٹا! جیسی تمہاری خوشی۔“ وہ ایک سرو آہ بھر کر بولی تھیں۔

واپسی میں نویرہ اور آمنہ کے ساتھ شہزاد خان بھی انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ آمنہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔

”ابھی ہوتاں تم دونوں یہاں پر؟“

”جی اموجان! وہ مسکرا کر بولی۔

وہ سکندر کو اس کے ہر رویے کے لیے سو فیصد پر سمجھ رہی تھی مگر پھر بھی اس پہلے اس کے باپ سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بہت لگے تھے۔

آمنہ اب سکندر سے مل رہی تھیں۔ اسے پھر لگا رہی تھیں۔

”کل مجھ سے ملو گے ناں؟“ سکندر نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا، جیسے باقی سب کے سامنے اس سے بھی فاصلے پر چلا گیا تھا۔

”اللہ حافظ۔“ اسے محسوس ہوا تھا کہ آمنہ کے ملنے کے بعد شہزاد خان سکندر کی طرف بڑھے تھے۔ مگر ان کے بڑھنے سے پہلے سکندر سب کو اللہ حافظ کہہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔

”اللہ حافظ انکل!“ اس نے انہیں الوداع کہا تھا۔ انہوں نے بزرگانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”خوش رہو بیٹا!“ اس نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو اسے ان کی نظروں میں دکھ اور بے بسی نظر آئی تھی۔ نویرہ سے بھی خوشگوار انداز میں گلے کر دے بھی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔ وہ تین افراد وہیں کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ نویرہ اور آمنہ ہاتھ ہلا کر انہیں خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ شہزاد خان سنجیدہ کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی دکھ اور بے بسی نظر آ رہی تھی۔

واپسی میں سارا راستہ سکندر بالکل خاموش تھا۔ اسے وہ بہت تنہا، بہت دھچی اور بہت اداس لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا تلخ ترین ماضی کسی آسیب کی طرح پھر اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔

”میرے ہوتے ہوئے اداس کیوں ہو رہے ہو سکندر! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ چاہے ساری دنیا تمہارے خلاف ہو جائے میں تب بھی تمہارے ساتھ ہوں گی۔“ وہ مضبوط لہجے میں اس سے بولی۔ سکندر کے اداس چہرے پر ہمدردی مسکراہٹ آئی تھی۔

”یہاں! تمہاری یہ محبت، تمہارا یہ ساتھ ہی اب میرے لیے زندگی گزارنے کی وجہ ہے۔ تم ساتھ ہو تو میں میں خود کو زندہ محسوس کر رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ تم ساتھ ہو تو زندگی بے لیزا۔“

وہ سکندر کے ہر لفظ میں سچائی پارتی تھی۔ وہ اس شخص کا ساتھ اپنی زندگی کی آخری سانچوں تک نبھائے گی۔ جنہوں نے اسے دکھ دیا، اسے چھوڑ دیا، وہ ان لوگوں کی طرح کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔ وہ اسے اب بھی محبت اور رشتوں سے بے اعتبار نہ ہونے دے گی۔

سکندر اسے محمود خالد کے گھر ڈراپ کر کے اپنے ہوٹل چلا گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو لاڈلج میں محمود خالد اور عائشہ کے ساتھ سیم اور ہاشم بھی بیٹھے نظر آئے۔

سیم کے ساتھ ساتھ ہاشم بھی اسے دیکھتے ہی صوفے سے کھڑا ہوا تھا۔ اپنی بہن کی زندگی اجاڑنے والے اس شخص سے اسے نفرت تھی، پھر بھی وہ مصطلحاً اس سے مسکرا کر ملی تھی۔

”انتا قریبی رشتہ اور ہم اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں لیزا۔“ ہاشم اس سے مسکرا کر بولا۔

”مریم جب بھی لندن یا روم تم سے ملنے جاتی تھی میں اس سے کتنا بھی تھا کہ میں بھی چلتا ہوں۔ اپنی اکلوتی سالی صاحبہ سے ایک بار ملاقات کا شرف تو حاصل ہو جائے۔ مگر مریم مجھے منع کر دیتی تھی۔ اب پوچھو اس سے یہ مجھے تم سے کیوں نہیں ملوانی تھی؟ وہ دو ستانہ وہ بے تکلفانہ انداز میں بولا تھا۔

”ایسے ہی بول رہا ہے ہاشم۔ خود کے پاس ٹائم ہوتا نہیں ہے بڑس ٹریس سے ہٹ کر کہیں جانے کا۔“ سیم جواب دیتے ہوئے اس سے گلے ملنے لگی تھی۔ ”کتنی دیر سے آئی ہوئی ہوں تم سے ملنے کے لیے۔ تم اپنا نہیں کہاں گھومتی پھر رہی ہو۔“

”میں نے تمہیں بتایا تھا ناں سیم۔ میں سکندر کے گھر والوں سے ملنے گئی تھی۔“

ہاشم صوفے پر واپس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اور محمود خالد ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سیم کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

ہاشم کی تصویر اس نے بے شک دیکھ رکھی تھی۔ مگر آنے سامنے اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ خاصا پینڈم اور باوقار مرد لگ رہا تھا۔

”کیسی رہی تمہاری اپنے سسرال میں دعوت؟“ سیم بنور اس کے پاکستانی لباس اور تیاری کو دیکھ رہی تھی۔

”جی رہی۔“ سب کے سامنے وہ محتاط ہو کر بول رہی تھی۔ اکیلے وہ دونوں ہمیش ہوتیں تو وہ طویل بیسہ کرتی سیم سے سکندر کے گھر والوں کے متعلق۔

”یہ تم نے پاکستانی ڈریس کب سے پہننے شروع کر دیے۔“ سیم اس سے ہنس کر بولی۔ اس کا انداز قدرے ذرا ق اڑانے والا تھا۔ وہ اپنی تیاری کے متعلق پٹی رہتی تھی۔

”کیوں کیا اچھا نہیں لگ رہا مجھ پر یہ ڈریس؟“ کیا سکندر، اس کی اموجان، لیا اور عائشہ نے اس کا دل رکھنے کو اس کی جھوٹی تعریف کی تھی۔ کیا واقعی یہ لباس اس پر اچھا نہیں لگ رہا تھا؟ سیم کہہ رہی تھی تو لیا ایسی

ہوگا۔ سیم اسے کبھی کچھ غلط مشورہ نہیں دیتی۔
”تم جس طرح کے کپڑے پہنتی ہو اس میں زیادہ
پیاری لگتی ہو۔“ سیم اس سے پیار سے بولی تھی۔
”مگر مجھے تو کٹھن اس لباس میں زیادہ پیاری لگ
رہی ہے۔ اس کے ساس سر کو بھی اچھا لگا ہو گا کہ وہ
ان سے ملنے پاکستانی لباس پہن کر آئی ہے۔“

محمود خالد سنجیدہ لب و لہجے میں سیم سے بولے
تھے۔ ان کا انداز ایک نامحسوس سی سختی لیے ہوئے
تھا۔ وہ حیران ہو کر اپنے پیلا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی
ملازمہ چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ کیک
اور بادام کا حلوہ بھی تھا۔ محمود خالد فوراً داماد کی مہمان
نوازی کرنے لگے تھے۔ وہ اسے اصرار کر کے حلوہ لینے
کو کہہ رہے تھے۔

”بڑی خاص جگہ کا حلوہ ہے ہاشم! اچھ کر دیکھو۔
تمہیں ضرور پسند آئے گا۔“ وہ ہاشم کی پلیٹ میں خود
حلوہ ڈال رہے تھے۔

بٹی کے ساتھ تلخ اور داماد کی آؤ بھگت؟ اسے
اپنے پیلا کا انداز سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا
تھا کہ سیم کو بھی محمود خالد کا انداز برا لگا تھا مگر وہ میاں کی
موجودگی کے سبب زبردستی مسکرا رہی تھی۔

”چلو اچھا ہے لڑا! تم پاکستانی ڈریس پہن پہن کر
اپنے پاکستانی میاں کو خوش کرنا۔“

”مریم! میاں تو تمہارا بھی پاکستانی ہے۔“ ہاشم حلوہ
کھاتے ہوئے اس سے ہنس کر بولا۔ عاتشہ سب کو
چائے سرو کرنے کے لیے اٹھنے لگی تھیں۔

”آپ بیٹھیں مئی! میں دے دیتی ہوں۔“ سیم نے
انہیں پیار سے منع کیا تھا۔ وہ خود سب کو چائے سرو
کرنے لگی تھی۔

”میری بات الگ ہے ہاشم! لڑا تو بڑی بچی تھی اس
معاملے میں کہ کسی پاکستانی سے ہرگز شادی نہیں کروں
گی پاکستانی مردوں سے سخت نفرت کرتی ہے لڑ۔“

اسے سیم کے جیلے میں کوئی بھی بات بری یا قابل
اعتراض نہیں لگی تھی مگر اس نے محمود خالد کے
چہرے پر پھر سختی اور غصہ آتے دیکھا تھا۔ وہ غصے کو دبا

رہے تھے۔ انہیں سیم کی بات بری لگی تھی۔
مسکرا کر سیم سے بولے تھے۔

”انسان کی سوچ اور خیالات میں تبدیلی آتی
ہے مریم! میں آج سکندر سے ملا ہوں۔ مجھے وہ
پسند آیا ہے۔ میں کٹھن کے فیصلے سے بہت متاثر
ہوں۔“

ان کی مسکراہٹ کے باوجود اسے ان کی آنکھوں
میں سختی نظر آتی تھی۔ ان کے لیے اور آنکھوں میں
سیم کے لیے ایک نامحسوس سی سختی اور تنہد
نظارہ کچھ محسوس نہ ہو مگر سننے والا محسوس کر جاسکتا
تھا کہ سیم کوئی رنجش ہے دلوں میں۔ سیم پر غصہ کر کے
اب بھی میلا اس سے ناراض تھے؟ ناراض سیم کو
چاہیے تھا مگر ناراض وہ تھے؟

بٹی کے مقابلے میں ان کا داماد سے بات کرنے کا
انداز بہت محبت بھرا تھا جیسے ہاشم انہیں بے حد پسند
اسے تھوڑی سی دیر ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس

کے پیلا سیم سے ناخوش تھے اس سے خفا تھے۔ چنانچہ
ہاشم اور عاتشہ کو یہ بات پتا چلی یا نہیں پتا تھی۔

جب وہ چند محلوں میں ان کے لیے کچھ سی سختی محسوس
کر گئی ہے تو کیا ہاشم اور عاتشہ نہیں کرتے ہوں گے؟
پہلے سیم کی شادی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف کرنا
دی صرف اپنے کاروباری فائدے کے لیے اور اب

اس سے خفا بھی ہیں۔ اس کی نگاہوں میں باپ کی ایک
برائی اور بڑھی تھی۔

”پھر کب ملواری ہو تم مجھے سکندر سے؟“ سیم نے
محمود خالد کی بات پر کچھ خاص دھیان دیے بغیر اس
سے پوچھا۔

”جب تم کو۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ وہ کھانا کھا کر آئی
تھی۔ اس لیے صرف چائے پی رہی تھی۔

”بس پھر کل بلاؤ سکندر کو ہمارے گھر لچ لچاؤ زہر۔
تمہیں تو میں ابھی اپنے ساتھ لے کر چلی رہی ہوں۔

بس اب تم تین چار دن میرے پاس بھی رہو۔ کیوں
ہاشم! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟“ سیم نے حق
رکھنے والے انداز میں اسے مخاطب کیا اور پھر اپنے

شوہر کو بھی شامل غصہ کرنا چاہا۔
”اب باکل۔“ چلو لڑا ہمارے ساتھ۔ اب کچھ
ہمیں بھی مہمان نوازی کا موقع ملنا چاہیے۔“ ہاشم

مسکرا کر پہلے اس پر ہنس رہا تھا۔
”کیوں انکل! ہم لڑا کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں؟“
ہاشم نے محمود خالد سے پوچھا۔

”یہ کیا کوئی اعتراض ہو گا۔ بس لڑ تم جلدی سے اپنا
ایک ٹیک کو۔ تم ابھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔“

سیم نے مسکرا کر حق رکھنے والے انداز میں کہا۔
وہ سیم کے ساتھ جانے کے لیے بخوشی تیار تھی۔

قبل اس کے کہ وہ باہر بھرتی محمود خالد فوراً بولے۔
”ہاشم بیٹا، کٹھن ابھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا
سکتے۔“

”در اصل کل میں اور عاتشہ اسے اس کی
شادی کی شاپنگ کرانے لے جا رہے ہیں۔ کپڑے
زور دو وغیرہ۔ ابھی تو کٹھن ہے ناں یہاں۔ شادی کی
شاپنگ پوری ہو جائے پھر آجائے گی یہ تم لوگوں کے
ہاں۔“

محمود خالد مسکرا کر داماد سے بولے۔ سیم کو وضاحت
دینے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ہاں داماد کو صاف انکار کر کے اسے ناراض نہیں کرنا
چاہتے تھے۔

کون سی شاپنگ؟ کیسی شاپنگ؟ اس کا ہرگز ہرگز
کوئی پروگرام نہیں بناتھا اپنے باپ عاتشہ کے ساتھ
کل یا کبھی بھی شادی کی شاپنگ کرنے کا۔ مگر اب سچ
مختل میں وہ باپ کی بات کو جھوٹا قرار دے سکتی تھی اور
نہی انکار کر کے انہیں شرمندہ کر سکتی تھی۔ اس لیے

اس نے خاموشی اختیار کر لی۔
”اچھا یہ بات ہے تو ٹھیک ہے، پھر ہم کل کے لیے
اصرار نہیں کرتے مگر لڑا! شاپنگ ختم کرتے ہی تم
نے ہمارے پاس آنا ہے۔ چند دن ہمارے ساتھ بھی
رہو۔“

ہاشم اس سے مسکرا کر بڑے بھائی کے سے انداز
میں بولا تھا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ سیم کا موڈ آف ہو
گیا ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ سیم کو ان کے

پاپا کے جھوٹ کی سمجھ آگئی ہے۔ وہ جانتی ہے۔ شاپنگ
کی بات محض ایک جھوٹ ہے اسے سیم کے گھر پر
جانے سے روکنے کے لیے۔
کیا واقعی اس کے پیلا اس کے خلاف کوئی سازش کر
رہے تھے؟

اس سے دور رکھ رہے تھے تاکہ سیم اس کی کوئی مدد نہ کر
سکے؟

ہاشم کا ابھی مزید بیٹھنے کا موڈ تھا مگر سیم ایک دم ہی
صوفے پر سے اٹھ گئی۔
”میرا خیال ہے ہاشم! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ پیلا
جلدی سو جاتے ہیں۔ ان کے سونے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”ارے ایک آدھ دن دیر سو رہ جاتی ہے۔ تم لوگ
بیٹھو۔ مزا آ رہا ہے سب ساتھ بیٹھے ہیں۔“ عاتشہ
مسکرا کر سیم سے فوراً بولیں۔
”نہیں مئی! میں پھر آؤں گی۔“

اسے سیم جھنجھلائی ہوئی اور خفا لگ رہی تھی۔ وہ
زبردستی مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کا موڈ بہت خراب
تھا۔

سیم اور ہاشم کے چلے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے
میں آگئی تھی۔ وہ کچھ اچھی ہوئی سی تھی۔ اسے اپنے
پیلا کا سیم کے ساتھ سخت انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس
کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
”بیٹا! میں اندر آ جاؤں؟“ محمود خالد نے دروازہ
تھوڑا سا کھول کر اس سے پوچھا۔

”جی! پیلا! آئے پلینز۔“ وہ بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔
محمود خالد اندر آ گئے تھے۔ وہ بے تحاشا سنجیدہ تھے۔ وہ
اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔
”سوئیں نہیں ابھی تک؟“

”جی بس سونے لگی تھی۔“ وہ انہیں قدرے
حیرت سے دیکھ کر بولی۔

خواتین ڈائجسٹ 163 جولائی 2012

خواتین ڈائجسٹ 162 جولائی 2012

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب وہ چھوٹی تھی اس کے باپ کے پاس اس سے بات کرنے کی فرصت تھی نہ وقت اب — جب وہ بڑی ہو گئی تب ان کے پاس اس کے لیے وقت اور فرصت دونوں آ گئے مگر اب وہ چھوٹی سی لیزا کہاں سے آئی؟ وہ ان سے ہمیشہ بہت دور رہی تھی باپ بیٹی نے کبھی ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے سے دل کی بات نہ کی تھی۔ اس لیے اس وقت وہ انہیں بہت حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

”تم سے تھوڑی دیر بات کروں؟ آج میرا دل چاہ رہا ہے تم سے دل کی باتیں کرنے کو۔“

انہوں نے رسانیات سے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اٹات میں ہلایا۔ وہ انہیں تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ ”میں جانتا ہوں کلثوم! تمہیں مجھ سے بہت شکایتیں ہیں۔ مجھے خود اپنے آپ سے بھی بہت شکایتیں ہیں بیٹا!“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔

”میں تم بہنوں کے لیے ایک اچھی ماں نہ لاسکا۔ میں نے ایک بری عورت سے شادی کی۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ پھر جب میں نے اپنی اس غلطی کو ٹھیک کرنا چاہا تب شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری اس غلطی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں تم نے بہت سفر کیا اور مریم۔“

وہ سیم کا ذکر کر کے کچھ بولتے بولتے رک گئے۔ ان کے چہرے پر درد اور کرب ابھر آیا تھا۔ بچہ تھوڑے ان کی آنکھوں سے جھانک رہے تھے۔

”خیر چھوڑو اس بات کو۔“ وہ اسے کچھ بتاتے بتاتے چپ ہو گئے تھے۔

”ماضی میں جو ہو چکا وہ جو چکا کلثوم! ہم میں سے کوئی بھی اب اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں تمہارے دل میں میرے لیے جتنی بھی ناراضیاں ہیں تم ان سب کو دل سے نکال کر اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم میری بہت پیاری بیٹی ہو۔ تم نے شادی کے لیے ایک اچھے شخص کا انتخاب کیا ہے مجھے

سکندر بہت پسند آیا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں سچائی اور تمہارے لیے محبت دیکھی ہے۔ وہ جو دل میں ایک خوف سا تھا ناں کلثوم! اگر کہیں میری ضد میں کسی کے کہنے میں اگر تم کسی غلط انتخاب نہ کر لو۔ الحمد للہ دور ہو گیا ہے۔ میرا تمہارے مستقبل کے حوالے سے مطمئن ہو گیا ہے۔ بیٹا!“

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بول رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ گھارندہ گیا تھا وہ زندگی میں پہلی بار یوں اپنے جذبات کا اس سے اظہار کر رہے تھے۔

”بیٹا!“ باپ کی آنکھوں کی نمی اور لمبے میں شامل جذبات کی شدت اس کی آنکھوں میں بھی نمی لے گئی تھی۔

”بیٹا!“ اس کی آنکھیں یکدم ہی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ باپ کے اتنے نزدیک بیٹھ کر ان کی آنکھوں میں نمی دیکھتے ہوئے وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتے تھے۔ محمود خالد نے یک دم ہی اسے کھینچ کر اپنے پیٹے سے لگایا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔

”کلثوم! مجھے معاف کر دو بیٹا! میری سب غلطیوں کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میری غلطیوں کی سزا میں اب خود کو مزید کوئی نقصان مت پہنچانا بیٹا!“

وہ روتے ہوئے اس سے کہہ رہے تھے۔ وہ باپ کے سینے پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بچپن کی محرومیاں بچپن کے دکھ نجانے اسے کیا کیا راز با تھا۔

”میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں کلثوم! میری جان میری زندگی ہو تم۔ میں تمہیں کبھی کسی دکھ کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرے ہوتے ہوئے تم پانچ سال سے تنہا رہی ہو، میرا دل کھٹکتا تھا بیٹا تمہاری اس تنہائی اور اکیلے پن پر۔“

باپ سے اپنی کوئی ناراضی، کوئی گلہ، کوئی شکوہ اس پل اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ محمود خالد روتے ہوئے اس سے بول رہے تھے۔

”تمہارا دل شفاف ہے بیٹا! اس لیے تم سب کو اپنی

طرح سمجھتی ہو۔ مگر میری جان بڑبڑا تھماری طرح سچی اور شفاف نہیں ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے۔ لوگوں کو سمجھنا سیکھو۔ دلوں میں پچھی نفرتیں اور محبت لیے چروں کے پیچھے چھپے اصلی اور بد صورت چرے پہچانتا سیکھو۔

انہوں نے اس کا سر اپنے سینے پر سے ہٹایا تھا۔ اب وہ دونوں روتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے دیوال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کیں۔ خود کو سنبھالا، وہ اسی طرح بے آواز روئے جاری تھی۔ برسوں کے جمع کیے اشک تھے انہیں نجانے کتنی دیر تک بہتے رہنا تھا۔ مگر اسے اپنے باپ کی کوئی بھی نصیحت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اپنے آنسو صاف کرنے کے بعد اب وہ اپنے پوروں پر اس کے آنسو چن رہے تھے۔

”تم سے ایک بات کہوں مانو گی؟“

”جی ہاں!“ اس نے آنسو بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے یکدم ہی اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

”تم مریم کے گھر مت جانا بیٹا!“

”کیوں بیٹا!“ وہ بے طرح حیران ہوئی تھی۔

”بس میں تم سے کہہ رہا ہوں اس لیے اگر میری محبت کا یقین کرتی ہو تو مریم کے گھر ہرگز مت جانا۔ جب تھک سکا کھانا میں ہو، میرے ہی پاس رہو۔“

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ کر رہے تھے۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا اگرچہ وہ ان کے ایسا کہنے کی وجہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ اب تم سو جاؤ۔“

وہ اس کے پاس سے اٹھنے لگے تھے۔ یکدم ہی اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

وہ اسے بہت محبت بہت شفقت سے دیکھ رہے تھے۔

وہ اپنی اسٹڈی میں رانگ چیر پر بیٹھے تھے۔ ظالم اپنے مظالم کا حساب کرتے بیٹھتا ہے تو غم آنکھوں سے یونی دور ہو جاتی ہے جیسے ان کی آنکھوں سے۔ چند گھنٹے پہلے وہ اپنے اس بیٹے سے کر آئے تھے جس کی زندگی اجاڑ ڈالنے کے وہ ذمہ دار تھے۔ جس سے اس کی شخصیت کی آن پان اس کی اور وقار سب کچھ چھین لینے کے وہ مجرم تھے۔

جو کہ کو جان سے مارے لیے پھاسی کی سزا سنائی جاتی ہے مگر جو کسی کی روح کا قتل کرے اس کے لیے کیا سزا ہوتی ہے؟

باپ تو اولاد کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں ڈالتا ہے۔ اولاد کی زندگی سنوارنے کے لیے اپنی زندگی رہن رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ کیسے باپ ہیں؟ آخر وہ کیسے باپ ہیں؟ انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر دی۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ بالکل خشک کر کے گیا ہے وہ آج ان کے ساتھ۔

اس نے انہیں پایا کہہ کر مخاطب کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس نے ان کے گھر کا کھانا کھانا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو ان کا دیا خند بھی قبول نہیں کرنے دیا۔ جو کہ کو گھر پر بلا کر انہوں نے آمنہ کے ساتھ بیٹھ کر خودی لڑا کودینے کے لیے سونے کے چار کنگن خریدے تھے۔ آمنہ انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں اور وہ ان کی حیرت نظر انداز کیے رہے تھے۔

ٹھیک کیا سکندر نے ان کا خند ان کے منہ پر مار کر چلا گیا۔ ان کا تو یہ منہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے خند قبول کرنے پر اصرار ہی کر پاتے۔ آج ان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ سکندر سے اعتراف جرم ہی کر پاتے۔ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ پاتے۔

اس سے یہ کہہ پاتے کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے

ہیں۔ اپنے ہر ظلم پر بہت شرمندہ ہیں۔ وہ بالکل دور سے اسے اریورٹ پر چھپ کر کھڑے دیکھتے رہے تھے۔ وہ دور کھڑے اسے گیزا کے ساتھ فارم ہاؤس میں آتا دیکھتے رہے تھے۔ کتنا خوبو جوان ہو گیا تھا ان کا بیٹا۔

بحر پر تو اتنا طاقت ور مرد۔

آجی اخلاقی جرأت ان میں نہ تھی کہ اسے اپنے سینے سے لے سکتے۔ انہیں لگا تھا وہ وحیل کر انہیں خود سے دور مٹا دے گا۔

آمنہ ان کی آج کی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ رہی تھیں کہ انہوں نے سکندر اور ان کی ہونے والی بیوی کو اپنی خاندانی شان و شوکت تھانے کے لیے فارم ہاؤس پر بدعو کیا تھا۔ زین بھی یقیناً یہی سمجھتا ہے اور خود سکندر بھی یہی سمجھا ہو گا اور وہ بیٹوں ایسا کیوں نہ سمجھیں؟ ساری زندگی انہوں نے خود کو حسیا ثابت کر کے دکھایا ہے، وہ سب انہیں ویسا ہی تو سمجھ رہے ہیں۔

رعوت اور غرور میں ڈوبے، خود پسندی میں مبتلا، اپنے اونچے خاندان پر فخر اور زعم کا شکار، ساری دنیا کو اپنے جوئے کی نوک پر سمجھنے والے شہر مار خان۔ ان کے بیوی اور بچے اگر آج انہیں ایسا سمجھتے ہیں تو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔ اپنے اندر کی کمزوریاں اور خامیاں چھپائے رکھنے کو انہوں نے خود کو ساری زندگی لوگوں کے سامنے ظاہر ہی اسی طرح کیا تھا۔ ان کے بچے یہاں تک کہ ان کی بیوی بھی نہیں جانتیں کہ وہ دیوانگی کی حد تک سخت مزاج اور اصول پسند کیوں ہیں۔ انہوں نے بیوی اور بچوں کو اتنے سخت ماحول میں کیوں رکھا، جہاں صرف ان کا حکم چلتا تھا اور بیوی اور بچوں کی رعایا جیسی حیثیت تھی۔ وہ حکم دیں گے، بیوی تعمیل کرے گی۔

بیوی کو نہ بولنے کی اجازت تھی نہ اس کی کوئی رائے نہ پنڈنہ مرضی۔

بڑا بیٹا جو ان سے اور ان کے باپ سے غیر معمولی حد تک مشابہت رکھتا تھا اور جو ان کے اور ان کے باپ کی طرح غیر معمولی ذہین تھا۔ اسے انہوں نے ہمیشہ اس خوف اور آزمائش میں مبتلا کیے رکھا کہ وہ ان کے طے کردہ معیار پر پورا اترتا رہے۔ وہ اس کے لیے سب

کچھ طے کرتے رہیں گے۔ وہ سر جھکا کر ان کی فرمائشیں پوری کرتا رہے۔ ان کے معیار کے مطابق خود کو ثابت کر رہا ہے۔

چھوٹا بیٹا جو نہ شکل و صورت میں ان پر ہے نہ ذہانت میں۔ اس پر انہوں نے کبھی وقت بربادی نہیں کیا تھا۔ ابتدا ہی میں نظر آ گیا تھا وہ ان کے اور ان کے باپ کی طرح غیر معمولی شخصیت اور ذہانت نہیں رکھتا۔

بیوی اور بچوں کے لیے پیسہ بہت تھا، عیش و آرام بہت تھا۔ مگر انہیں ان کے سامنے سر اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ خود پسندی اور مغروریت کے ساتھ اپنے اعلا حسب نسب پر فخر کرنے کا احساس انہوں نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کے اندر اٹھایا تھا۔ وہ کسی کو بھی اپنی برابری کا نہیں سمجھتے تھے۔ کسی اور کو تو کیا، انہوں نے بیوی تک کو بھی اپنے دل کے اندر جھانکنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

جس خاندانی جاہ و حشمت اور فیملی بیک گراؤنڈ پر وہ فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ اندر سے انہیں اس پر فخر نہیں، شرمندگی ہے، غصہ ہے، نفرت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں کو ان کے دادا جی کی شان و شوکت، ذہانت اور قابلیت کے قصے سناے تھے۔ اپنے باپ کو اپنے بچوں کے سامنے ایک آئیڈیل اور پرفیکٹ انسان کے طور پر پیش کیا تھا۔

کون جان سکتا تھا کہ اپنے اسی آئیڈیل اور پرفیکٹ باپ سے وہ اتنا ہی حد تک نفرت کرتے تھے۔

وہ اپنے باپ کو نہ کل معاف کر پائے تھے، نہ آج معاف کرنے کا ظرف ان میں پیدا ہو سکتا تھا۔

ان کے اس سخت اور کھردرے مزاج کا ذمہ دار کوئی اور نہیں، ان کا اپنا سگا باپ تھا۔

(باق آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حجرت آزمائشیں رکھتی



ڈھونکی کی آواز اب اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ انتہائی بے بسی سے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ لیکن آواز کانوں میں نہیں دماغ میں گونج رہی تھی۔ وہیل چیئر کو ہاتھ سے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ بیڈ کی سائیڈ دروازے سے سگریٹ اور لائٹس نکال کر لائٹ بند کر دی۔
اب انگلیاں کانوں کے بجائے سگریٹ سلگانے میں مصروف تھیں۔ ایک، دو، تین، ساری ڈیما خالی

کانوں لپٹے



کر دی، لیکن ٹینشن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ ”مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا ہے جو ٹینشن ہمارے سگریٹ جیسی بری عادت میں بیٹلا رہے ہیں۔“ اسے اپنی آواز کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔
”یہ کیا بات ہوئی، سگریٹ سے تنے ہوئے اعصاب ٹھیک تھوڑی ہوتے ہیں۔ سگریٹ تو ٹینشن ہے۔“ اس کی آواز پر نسوانی آواز غالب آگئی۔ اس کے دماغ پر بوجھ اور بڑھ گیا۔
”کوئی بھی یہ کام شوق سے نہیں کرتا۔“ دلی آوازوں کے درمیان مدھم مدھم سی آواز ابھری۔
”اچھا! فرض کرو اگر تمہیں کوئی ٹینشن ہو تو سگریٹ پینا شروع کر دو گی؟“ اسے دوبارہ اپنی آواز سنائی دی۔
”نہیں! یہ کلام کمزور لوگ کرتے ہیں اور میں کمزور نہیں ہوں۔“
”پھر تم کیا کرو گی؟“ ان سب پر شوق آواز غالب آگئی۔
”میں خدا سے رو رو کر ان گناہوں کی معافی مانگوں گی۔ جس کی وجہ سے مجھے سزا مل رہی ہوگی۔ جانتی ہوں صبا! خدا اپنے پیارے بندوں پر ہی آزمائش ڈالتا ہے تاکہ وہ اس کی یاد میں مشغول ہو جائے۔“ عادت کے مطابق مدھم آواز میں جواب دیا۔
”تمہاری تو ہر بات ہی نزلی ہے۔“ صبا نے جھنجھلا کر جواب دیا۔
اور پھر یہی آواز اس کے لیے غلاب کی طرح گونجی۔



بار پھر کرسی کو حرکت دی۔ اب اس کا رخ ہاتھ روم کی طرف تھا۔

وضو کرنے کے بعد وہیل چیر کو گھماتے ہوئے جائے نماز کے پاس آکر آہستہ سے بیٹھ گیا اور خدا کے حضور ہاتھ اٹھائیے۔

”اے میرے مولا! تو رحیم ہے، تو کرم ہے، تیری ذات سب سے افضل ہے۔ تیرے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ تیرا یہ حقیر سا بندہ اس کی خوشیوں کی دعا مانگتا ہے۔ یا اللہ! اس کی زندگی میں بھی کوئی غم نہ آئے وہ سدا خوش رہے۔“

جہاں آنسوؤں میں روانی آئی تھی وہیں آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔ دعا مانگنے میں اتنا مشغول تھا کہ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کوئی کب سے دروازے میں کھڑا ہے۔

کیا یہ وہی کیپٹن ہادی ہے جو آنے والوں کی آہٹ پہچان لیتا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں اب کسی اور کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے۔

”ارے! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“
فروا جو ہادی کو بلانے کی غرض سے آئی تھی، لیکن اسے رات والے چیلے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لیکن جلد ہی اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے وارڈروب کی طرف بڑھ گئی اور پکڑے نکل نکل کر بیڈ پر کھنکھار شروع کر دیے۔

”جلدی سے بتائیے! کون سا سوٹ نہیں گے؟“
فروا نے بلیک پینٹ اور ساتھ میں بلیک ہی شرٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں ہونا تیار اور تم۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ ہادی نے شدید غم اور غصے سے کہا۔

فروا حیرانی سے اس کی جانب مڑی۔
”تم جو چاہتی تھیں، ہو گیا۔ اب کیا لینے آئی ہو بار بار بولو، جواب دو۔“ اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ کیا

بول رہا ہے۔

”میری بے بسی کا تماشا دیکھنے آئی ہو یا اپنی خوشیاں منانے؟ تمہارے ایک گھنٹہ افاق سے ساری زندگی تباہ کر ڈالی۔ تم نے کیوں کیا ایسا؟ بھول کر کیا؟“

فروا کے ہاتھ بے پکڑے پھوٹ کر نیچے گر گئے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے آہستہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔

”نفرت ہے مجھے تم سے، نفرت ہے، شدید نفرت۔“

اس سے پہلے کہ کمرے سے نکل جائے کو وہاں اس نے خود ہی دوڑ لگا دی۔

آج کچھ نہیں بچا تھا شاید! کچھ بھی نہیں۔

اسے نہیں معلوم کہ بارات کب آئی، صبا پارلر کب آئی، کیسی لگ رہی ہے، کھانا کب کھایا، دودھ پلا کتنی لپٹی وہ تو بس کسی روایت کی طرح ہانیہ کے ساتھ تھی۔ تھک ہار کر کونے والی کرسی پر جا بیٹھی اور خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

دلغ ابھی تک ہادی میں اٹکا ہوا تھا اور ہریات میں لفظ ”نفرت“ سنائی دے رہا تھا۔ ہر قسم میں نفرت کی گونج محسوس ہو رہی تھی۔ چونکی تب جب ہادی کو بیساکھیوں کے سارے اسٹیج پر آتے دیکھا۔ اب اس کی ساری توجہ ہادی پر تھی جو مسکراتے ہوئے لایازے مل رہا تھا۔

”صبا پار! ابھی جاؤ۔“ ہادی صبا کو آوازیں لگاتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا۔

”بھائی! کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“ ہانیہ نے پوچھا۔
”گھر! اتم بھی تیار ہو جاؤ۔ باہر چلتے ہیں۔“ ہادی نے کہا۔

”نہیں! ہم کیوں کہاں میں بیٹیاں بنیں۔“ ہانیہ نے چھوٹی سی ناک کو سکود کر کہا۔

”تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ ہانی!“ فروا نے آہستہ سے کہا۔
”میں جانا بھی نہیں چاہتی اور ویسے بھی بھائی نے ہمیں دیکھ کر اخلاق نبھایا ہے۔ ورنہ ہم تو یاد بھی نہیں تھے۔“ اتنے میں صبا چلی آئی۔

”چلیں ہادی! ہانیہ! ہانیہ!“
فروا کو ہمیشہ کی طرح جتانے سے باز نہیں آئی۔ دونوں مسکراتے ہوئے آگے پیچھے باہر نکل گئے۔

”تم نے دیکھا، فروا! کیسے جل کر راکھ ہو گئی تھی۔“
صبا نے گاڑی میں بیٹھتی ہی کہا۔

”چھوڑو نا! میرے ساتھ ہوتے ہوئے صرف اپنی باتیں کیا کرو۔“ ہادی نے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

”آج کدھر جانے کا ارادہ ہے؟“ صبا نے پوچھا۔
”جدا ہر دم کو۔“

”تھک ہے! آج پھر راول جھیل چلتے ہیں۔“
”کیوں نہیں، ضرور!“ ہادی نے فوراً ہی گاڑی راول جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دی۔

”ہادی! اتم میرے ساتھ اس جھیل میں اترو گے؟“
صبا نے ہادی کی طرف دیکھ کر کہا، جو جھیل کنارے ہوا سے اٹھنے والی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

”میں گھر سے نما کر نکلا تھا۔“ ہادی نے مسکرا کر کہا۔

”میں بھی نما کر رہی آئی ہوں۔“ صبا نے منہ پھلا کر کہا۔

”تو پھر کیا پاگل ہو گئی ہو؟“ ہادی نے مسکراتی آنکھوں سے دیکھا۔

”ہاں! چلو گھر چلیں۔“ صبا عادت کے مطابق غصے میں آ گئی۔

”فوا! اتم بھی تائب۔“ سو! کچھ کھاتے ہیں۔“ ہادی نے کہا۔

”مجھے نہیں کھانا کچھ بھی۔ آپ بس گھر چلیں۔“
”اُس کس کریم بھی نہیں کھاؤ گی کیا؟“ ہادی نے اسے دیکھنے لگا۔

لاؤنج دیا، کیونکہ وہ جانتا تھا اُس کریم کا سنتے ہی سب بھول جائے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلے ہی پل سب کچھ بھول بھال کر وہ ہستی ہوئی ہادی کے ساتھ چل پڑی۔

”ایک بات پوچھو آئی؟“
ہانیہ نے فروا سے کہا، جو گلاب اور چینی کی کیاروں سے پھول توڑ کر خوب صورت گلہان کی شکل دے رہی تھی۔

”ہاں ضرور! پوچھو۔“ فروا مسکرائی۔
”آپ تو پوینٹیشن ڈے کو نہیں مانتیں، پھر کس کے لیے پھول توڑ رہی ہیں۔“
”اولیا گل! امیں تو۔۔۔“

”نہ میرے لیے توڑ رہی ہے۔ اسے تو کسی کو نہیں دینے، لیکن مجھے تو دینے ہوتے ہیں نا!“ ہادی نے کہا۔ وہ لان سے گزر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر راہرو ہی آ گیا۔

فروا نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر ایک بل کے لیے نظریں ہٹانا ہی بھول گئی۔ ہاتھ میں کیپ پکڑے، وردی میں بلبوس بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”لا اس! مجھے دیں۔“ ہادی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کیا۔ فروا سارے گلاب ہانیہ کو پکڑا کر چلی گئی۔

”اے کیا ہوا؟“ ہادی نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ حساس، ہر کسی کا خیال رکھنے والا۔

”تیا نہیں! امیں دیکھتی ہوں۔“ ہانیہ اس کے پیچھے ہی چلی گئی اور ہادی بھی پھول پکڑے لاؤنج کی طرف چل پڑا۔ لیکن ان سب سے ہٹ کر کسی کی مسکراتی آنکھوں میں جلن پیدا ہو چکی تھی۔

”نہیں! امیں یہ پھول نہیں لوں گی۔“ ہادی تیار ہو کر صبا کے کمرے میں گیا تو وہ منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی تھی۔
”کیوں، کیا ہوا ہے ان پھولوں کو؟“ ہادی پھولوں کو دیکھنے لگا۔

”میں کیوں لوں کسی کے توڑے ہوئے پھول؟“
 صبا نے دیکھے ہی پھولے منہ سے جواب دیا۔
 ”اوہ! تو ہمیں کسی کے توڑے ہوئے پھولوں پر
 اعتراض ہے۔ پھول دینے پر نہیں۔“ ہادی نے سر پر
 ہاتھ مار کر جواب دیا۔
 ”ہاں! آپ میرے لیے اتنا سبھی نام نہیں نکال
 سکتے کہ اپنے ہاتھوں سے پھول توڑ کر گل دستہ بنا
 دیے؟“
 ”ناگل! یہ جو آفس میں اتنا کام کرتا ہوں یہ ساری
 محنت تمہارے خواب پورے کرنے کے لیے ہی تو کرتا
 ہوں۔“ ہادی نے صبا کا کان پکڑ کر کہا اور ہاتھ روم کی
 طرف دھکیل دیا۔
 ”جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ، پھر سب مل کر آؤنگ
 کے لیے چلتے ہیں۔ میں ان سب کو بھی کہہ دوں۔“
 ہادی کستا ہوا یاہری طرف چل پڑا۔

عبدالجبار اور عابدہ کے تین ہی بچے تھے۔ دو بیٹے،
 سجاد، جو اد اور ایک بیٹی مریم۔ عبدالجبار کا اپنا چڑے کا
 کاروبار تھا جو اب بیٹوں نے سنبھال رکھا تھا۔ انہوں
 نے سجاد کی شادی اپنی چھٹی نچھ کے ساتھ اور جو اد کی
 شادی عابدہ کی بھانجی کشملا کے ساتھ کر دی جبکہ بیٹی
 کی شادی غیروں میں ہوئی، لیکن دس سال کے بعد ہی
 مریم کو ماں باپ کی دلہنیز واپس آنا پڑا۔ اسلام دل کے
 مریض تھے۔ شادی کے دس سال بعد ہی دنیا چھوڑ
 گئے۔ مریم کی ایک ہی بیٹی فروا تھی۔ بچے دونوں بھائی
 اور اوپر والا پورشن مریم کے نام کر دیا۔
 سجاد کا اگلا تا بیٹا پین ہادی تھا جبکہ جو اد کے تین
 بچے تھے۔ صبا سے تین سال چھوٹا باشم اور پانچ سال
 چھوٹی ہانیہ۔
 صبا اور فروا ہم عمر تھیں۔ صبا فطرتاً خود پرست
 تھی۔ اسے فروا ایک آٹھ نہیں بھاتی تھی۔ بیٹھے صبا
 اور فروا کے لیے ایک جیسی چیز آتی، لیکن صبا سب
 برواشت نہ کپاتی اور جو چیز فروا کو پسند آتی فوراً وہ

چھین لیتی۔ چاہے اسے پسند نہ بھی ہو۔ وہ صبا کی خوشی
 برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں سیکنڈ ایر میں
 تھیں۔ ہادی ایم بی اے کر رہا تھا۔ صبا کی نسبت فروا
 زیادہ ذہین تھی۔ فروا کا جھکاؤ ہادی کی طرف تھا۔ یہ بات
 کوئی اور تو نہیں، لیکن صبا کا شطرنج جان گیا تھا۔ صبا
 پڑھنے کے بجائے فروا کا جائزہ لیتی رہتی۔ فروا بھی صبا
 سے چھنے کی کوشش کرتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ ہمیشہ کی
 طرح صبا اس کی محبت نہ چھین لے۔ لیکن ہوتا وہی
 ہے جو قسمت میں لکھا ہو۔
 رزلٹ آنے پر ہمیشہ کی طرح فروا نے پھر پوزیشن بی
 جبکہ صبا بمشکل پاس ہوئی تھی۔ ہادی کے منہ سے فروا
 کی تعریف صبا سے برداشت نہ ہو سکی۔ وہ ہمیشہ اسے
 نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگی رہتی تھی۔ ایک بار پھر
 اسے سبقت لے جاتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکی۔ فروا
 کی سب سے قیمتی چیز کو چھین لینے کا منصوبہ بنالیا اور
 اپنی ماما کے پاس جا چکی۔

”ماما! میں شادی کروں گی تو صرف ہادی سے۔ آپ
 پاپا کو بھی بتادیتا۔“ صبا نے جتنی لہجہ میں کہا۔
 ”ٹھیک ہے بیٹا! کچھ دن انتظار کرو۔ میں تمہارے
 پاپا سے بات کرتی ہوں۔“ کشملا کو بھی اس سب
 میں کچھ خاص برا نہیں لگا تھا۔ لیکن بچے آتی ہوئی فروا
 نہ بچے اسکی اور نہ ہی اوپر جا سکی۔ وہ تو ابھی اپنے پاس
 ہونے کی خوشی بھی نہیں مناسکتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح
 صبا نے ایک بار پھر اس کی خوشی چھین لی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد صبا اور ہادی کی ملگنی تھی۔ ہادی
 بھی سب کی طرح یہی جانتا تھا کہ صبا اس سے ہمیشہ
 محبت کرتی ہے۔ سوائے فروا کے کوئی حقیقت نہ جان
 پایا، لیکن فروا کو اپنی عزت سب سے عزیز تھی۔
 نہیں تھا زور اس کی ستم نوازیوں کا مگر
 مجھے بھی حوصلے میرے خدا سے ملے

میری انا کیوں کہتی ہے بار بار مجھے
 وہ محبت ہی کیسی جو انتہا سے ملے
 اس نے ایک بار پھر تقدیر سمجھ کر صبر کر لیا۔ بے
 شک یہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ لیکن تقدیر سے
 کوئی نہیں لڑ سکتا اور پھر فروا جو شکوہ زبان پر لانا بھی گناہ
 سمجھتی تھی، کیسے لڑتی۔

وہ سب لاؤنج میں بیٹھے زور و شور سے باتیں کر رہے
 تھے۔
 ”ہانیہ بیٹا! آج پڑھنا نہیں ہے کیا؟“ عابدہ نے
 پوچھا جو بچوں کا شور سن کر اوپر ہی آگئی تھیں۔
 ”پڑھتی ہوں امی جی! کچھ دیر میں۔“ ہانیہ نے
 جھٹ جواب دیا اور دوبارہ باتوں میں لگ گئی۔
 ”سب اپنے کمروں میں جاؤ۔ بہت رات ہو گئی
 ہے۔“ عابدہ نے گھڑی کی جانب دیکھا جو بارہ بج رہی
 تھی۔ ہانیہ اور باشم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔
 ”پلیز فروا! دوپ کا پی کے تو بنادو۔“ صبا نے فروا کو
 بیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ وہ خاموشی
 سے پیکن کی طرف بڑھ گئی۔
 ”ہادی! تم اپنی گاڑی لے لینا شادی سے پہلے ہی۔“
 صبا نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔
 ”کیوں؟ اب بھی تو اپنی ہی گاڑی پر جاتے ہیں۔“
 ہادی نے کہا۔
 ”فروا! میرا مطلب یہ تو ہوئی تھا۔“ صبا نے کہا۔
 ”اور کیا مطلب ہے پھر؟“ ہادی نے کہا۔
 ”دیکھو نا! جب اپنی گاڑی ہوگی تو میں بھی سکھ لوں
 گی اور پھر تم تو جانتے ہی ہو مجھے بسوں کے دھو میں سے
 کتنی الرجی ہے۔“ صبا نے ہالوں کو ایک لوا سے پیچھے
 کرتے ہوئے کہا۔ ہادی مسکرانے لگا۔
 ”اور اتنا تو بسوں کا دھواں نہیں ہوتا جتنا سگریٹ
 نوشی کا۔ یہ تمہیں کیوں ہماری حکومت اس کے خلاف
 کوئی اقدامات ہی نہیں اٹھا رہی۔“ صبا نے ناک سکڑ
 کر کہا۔

بھی معمولی نمبروں کے ساتھ لی اے کر لیا۔ اس نے ایم اے اکنامکس پر ایسویٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہادی نے ترقی کر کے بہت جلد کیپٹن کی سیٹ سنبھال لی۔ ہادی ہر کسی کی آنکھ کا تارا تھا۔ وہ سختی نوجوان تھا۔ فروا کے لیے جو داماموں کے دوست ایاز کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ سب ہی راضی تھے۔ لیکن فروا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ سب نے بہت کہا لیکن وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹی۔ داموں زبردستی کے قائل نہیں تھے اس لیے کچھ وقت کے لیے ٹال دیا۔

وہ تینوں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔
”آپ! لوگ اپریل فول کس کی یاد میں مناتے ہیں؟“ ہانیہ نے فروا سے پوچھا۔ وہ صبا کی نسبت فروا کے زیادہ قریب تھی۔
”میں اس سے کیا۔ مزا تو بہت آتا ہے اس دن۔“ صبا نے کہا۔

”جھوٹ چاہے مذاق میں بھی بولا جائے وہ جھوٹ ہی ہوتا ہے۔“ فروا نے کہا۔
”تم اب اپنی نصیحتیں نہ جھاڑنا شروع کر دینا۔ میں اس بار ہادی کو بے وقوف بناؤں گی، بلکہ فروا! تم کال کرنا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، آپ جلدی آجائیں۔“ صبا نے کہا۔
”میں آئیں جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ فروا نے فوراً کہا۔

”ہاں! یہ تو ہے، ورنہ دل میں تو دعا مانگتی ہوگی۔ ہانیہ! پھر تم کرنا۔“ صبا نے فوراً ہانیہ کی طرف رخ کیا۔
”میں ہانیہ بھی نہیں کرے گی اور صبا! ایسے مذاق نہیں کرتے۔ تم خود سوچو، اگر خدا انخواستہ کوئی حادثہ ہو جائے تو۔“ فروا نے فوراً کہا۔
”تم کبھی اپنی کالی زبان سے اچھا نہ نکالتا۔“ صبا نے ناک چڑھا کر کہا۔
”آپ! ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ ہانیہ نے بھی فروا کا

ساتھ دیا۔

”تم تو چپ ہی رہو۔ تم ہو ہی اس کی چچی، پھر تمہیں کیوں غلط لگے گا۔“ صبا نے ہادیہ کو جھڑک دیا۔
”اور اب تم لوگ کل تک صبر کر لیتا، میں خود ہی کچھ کر لوں گی۔“ صبا کہتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ گئی اور وہ دونوں بس دیکھ کر رہ گئیں۔

”فروا! یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔“ ہانیہ جو کافی دیر سے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی فروا کو چاند سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ خود بھی لان میں آگئی۔
”افسوس۔ ہوں۔۔۔ کچھ نہیں۔“ فروا نے کسی خیال سے چونک کر کہا۔

”آر یو اوکے؟“ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“ ہانیہ نے کہا۔
”فروا! اپنی سوچ کا کنارہ پاتے ہی فوراً ہانیہ کی طرف مڑی۔

”ہانیہ! تم ایک کام کرو گی؟“ فروا نے بے چینی سے پوچھا۔ جیسے وہ یہ کام جلد از جلد کرنا چاہتی ہو۔
”جی ہاں! کیوں نہیں، لیکن آپ! ایسا کون سا کام ہے جس کے لیے آپ اتنی پریشان ہیں؟“ ہانیہ نے حیرانی سے پوچھا۔ فروا اپنی جلد بازی پر قابو پاتے ہوئے رخ موڑتی۔

”کیا ہوا آپ! بتائیے نا؟ چپ کیوں ہو گئیں۔“ ہانیہ گھوم کر فروا کے سامنے کھڑی ہوئی۔

”او! ادھر بیٹھو۔“ فروا ہانیہ کا بازو پکڑ کر سیڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ”دیکھو ہانی! تمہیں معلوم ہے نا صبا جیسا کہتی ہے ویسا کرتی بھی ہے۔“ فروا نے کہا۔
”ہاں آپ! لیکن آپ کیوں اتنی پریشان ہیں؟“ ہانیہ نے کہا۔

”تم اسے منع کرو وہ ہادی کو فون نہ کرے۔ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“ فروا نے کہا۔
”لیکن آپ! یہ سب تو مذاق ہے نا؟“ اب کی بار ہانیہ نے کچھ الجھ کر جواب دیا۔

”ہاں! یہ سب مذاق ہے، لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ہانی! پتا ہے ایسا ہی ڈر مجھے ابو کی وفات کے وقت محسوس ہوا تھا۔ بے شک میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ لیکن وہ ڈر مجھے آج بھی محسوس ہو تو میں کانپ جاتی ہوں۔ پلیز ہانی! میں بہت پریشان ہوں۔ صبا کو کہو کہ ایسے مذاق نہیں کرنے چاہئیں۔ پلیز اسے کسی طرح سمجھاؤ۔“

ہانیہ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں چھپے ڈرو خوف کو دیکھتے ہوئے کچھ پل کے لیے کچھ بول ہی نہیں سکی۔
”وہ کسی کی نہیں مانتیں آپ! ہانیہ نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

”ہاں! میں جانتی ہوں، لیکن تم ہادی سے کہو کہ۔۔۔“ نہیں، نہیں! آپ مجھے مروا میں گی صبا آپ کی باتھوں۔“ ہانیہ نے فروا کی بات پوری ہی نہیں ہونے دی۔

”آپ! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ صرف مذاق کر رہی ہیں۔“ ہانیہ نے فروا کو بولنے کے لیے لب کھولتے دیکھ کر کہا۔
”لیکن ہانی! جھوٹ تو مذاق میں بھی بولنے کی اجازت نہیں ہے اور پھر وہ تو یہ سب مغربی روایت کو نبھانے کے لیے کر رہی ہے۔ یہ تو اس سے بھی غلط ہے نا۔“ فروا نے کہا۔

”اچھا چھوڑیں آپ! رات کافی ہو گئی ہے، آپ خواجواہ پریشان ہو رہی ہیں، کچھ نہیں ہوتا۔“ ہانیہ نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئی۔

”کیا؟ کک۔۔۔ کون۔۔۔ کون سے اسپتال میں ہے؟“ ہانیہ جو پاس ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسپتال کا نام سن کر پاس چلی آئی اور فروا کے کانپے ہاتھوں سے رہے پور لے کر کان سے لگایا اور اب ہانیہ کی حالت بھی فروا جیسی تھی۔ تھوڑی دیر میں سب جمع ہو گئے۔
”میں منع کیا تھا نا، یقیناً۔“ یہ سب تمہاری وجہ

سے ہوا ہے۔“ فروا نے صبا کو دیکھا تو برواشت کھو بیٹھی۔

”ہولو! تم نے کی تھی کال؟“ لیکن صبا صاف مگر گئی۔
”کون سی کال کی بات کر رہی ہو اور کیا ہوا ہے؟“ سب لوگ اصل بات سے بے خبر حیران و پریشان کھڑے فروا کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس لمحے شاید اپنے آپ میں نہیں لگ رہی تھی۔

”آپ! پلیز چپ کریں۔ ہادی بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں۔ حالت نازک بتائی ہے۔“ ہانیہ نے انک انک کر تمام بات بتائی، جسے سن کر سب دنگ رہ گئے۔

”یہ فون والا کیا معاملہ ہے؟“ کشمالہ آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی متوجہ ہوتا، ڈرائیور نے گاڑی نکال لی۔ نجمہ، کشمالہ اور صبا چلی گئیں۔ فروا نے جانے کی کوشش کی، لیکن صبا نے روک دیا۔ ہانیہ نے فروا کو صوفے پر بٹھا کر پانی لا کر دیا اور پھر فون کی طرف بڑھ گئی۔

ہادی کی حالت بہت نازک تھی۔ ایک ٹانگ میں شدید زخم آئے تھے۔ سر میں بھی چوٹیں لگی تھیں۔ اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ سب کورڈرو میں گھوم رہے تھے۔ کوئی دعا مانگ رہا تھا اور کوئی بیخ پرہ رہا تھا۔ جواد اور سجاد بھی سیدھے اسپتال گئے تھے۔ سب بہت پریشان اور دعا گو تھے۔ نجمہ کارو رو کر بہت برا حال تھا۔ لیکن ان سب سے الگ تھلک ایک ایسا وجود بھی تھا جو دعا کی بجائے سوچنے میں مصروف تھا۔ دوسروں کو آزمائے، آزمائے خود اپنے لیے آزمائش کھڑی ہو گئی۔

صبا نے بہت رازداری سے سم تبدیل کر کے کال کی تھی۔ آواز بھی کافی حد تک تبدیل کر لی تھی۔ ہادی میٹنگ میں مصروف تھا۔ موبائل پر آنے والے نئے نمبر کو دیکھ کر کال کٹ دی۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ آنا شروع ہو گئی۔ اپنے دوست وقار کے کہنے پر کہ ”ضروری کال بھی ہو سکتی ہے۔“ کال ریسیو کی اور پھر صبا کے اسپتال میں ہونے کی خبر سن کر وہ میٹنگ بھی

بول گیا۔ اتنا بھی دھیان نہیں رہا کہ صبح تو ٹھیک چھوڑ کر آیا تھا، اب اچانک ایسا کیا ہو گیا کہ اسپتال پہنچ گئی اور دوسری طرف صبا اس کی حواس باختہ آواز سن کر خوش ہو گئی۔

دوسرے دن وقار ہادی کی خبر لینے آیا اور سجاد کوئی بھن میں ڈال گیا۔ ”وہ کون ہو سکتا ہے جس نے ہادی اس فہم تک پہنچایا۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سب کے درمیان آکر کھڑے ہو گئے۔ ہادی کو خوش آیا تھا۔

”ہادی کو کسی لڑکی کا فون آیا تھا کہ صبا اسپتال میں ہے۔ ہادی اسی کی کال سن کر جا رہا تھا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے جس نے اتنی کڑی ہوئی حرکت کی۔“ سجاد بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔ شاید اولاد کا غم ایسا ہی ہوتا ہے۔ صبا پہلے تو بہت خوفزدہ ہو گئی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ خوف کم ہوتا گیا۔ دماغ میں ایک نئی ترکیب سوچ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔

”میں بتاتی ہوں انکل!“ سب کے پاس صبا کی آواز گونجی اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”پرسوں!“ پریل فول۔ ”تھا۔“ فروا نے پہلے مجھے کہا کہ ہادی سے مذاق کرتے ہیں، لیکن میں نہیں مانی اور اسے بھی ایسا کرنے سے منع کیا تو وہ کہنے لگی ”یہ صرف مذاق ہے کچھ نہیں ہوتا۔“ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ حرکت اسی کی ہے۔“ صبا نے ہچکیوں کے درمیان جھوٹا قصہ سنایا۔

پلوچو دو بار کو تمام کر نیچے بیٹھ گئیں۔ سب بہت حیران ہوئے کسی کو ابھی فروا سے ایسی حرکت کی امید نہیں تھی۔

”ہانیہ! تم کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔“ فروا نے کہا جو پچھلے دو دنوں سے اسپتال جانے کو بے تاب تھی، لیکن گھر میں کھانا بنانے کی ذمہ داری اس پر ہونے

کی وجہ سے جا نہیں سکی تھی۔ وہ ابھی پریشانی کھانا بنا کر کمرے میں آئی تھی۔ ”نہیں! آپ! میں نہیں بتاتی۔ آپ تو اس دن بہت جذباتی ہو گئی تھیں۔“ ہانیہ نے کہا۔ ”ہاں! بس بتائیں مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا۔“ فروا نے کہا۔

باہر جو ادھو کھانا لینے کی غرض سے آئے تھے کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ سے الٹ بھی نہیں سکے۔ جس بھانجی کو ہاتھ کا چھالنا پنا کر رکھا اسی نے اتنا بڑا مذاق کر دیا۔ اسے کیا دشمنی تھی ہادی سے جو ایسا گھٹیا مذاق کیا۔ وہ کافی دیر تک سوچتے رہے اور پھر وہیں سے آواز لگا کر کھانا منگوایا اور ان کے کہنے کے باوجود انہیں نہیں لے کر گئے۔ انہیں بھانجی سے زیادہ بڑی کا دکھ ہوا جس سے وہ صبا سے زیادہ پیار کرتے تھے۔

آج ہادی پندرہ دنوں کے بعد واپس چارج ہو کر گھر آ رہا تھا۔ سب سے زیادہ فروا کو انتظار تھا۔ وہ پندرہ دنوں میں کئی بار کوشش کر چکی تھی لیکن کوئی اسے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں مانا۔ البتہ ہانیہ دوبار زبردستی ہو آئی تھی۔ فروا نے زبردستی کرنا سیکھی ہی نہیں تھی۔ آج سب کو اس کی یہ عادت بھی بہت بری لگ رہی تھی۔ ایک دم شور بلند ہوا تو اس نے بچن کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔

ہادی ناموں کے سارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آ رہا تھا۔ فروا نے بے اختیار دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا اور دوبارہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

ہادی اب صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ سر کی چوٹیں تو ٹھیک ہو گئی تھیں، لیکن ٹانگ ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ فروا نے پیالے میں سوپ ڈالا اور دیوہ دست کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہو گئی۔

”اسلام علیکم۔“ اس کے سلام کرنے پر سب نے عجیب نظروں سے

دیکھا لیکن وہ نظر انداز کرتے ہوئے ہادی کی طرف بڑھ گئی۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ فروا نے سوپ کا پیالہ آگے کرتے ہوئے پوچھا۔ ”لیکن ہادی نے پیالہ پکڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ بھی دوسروں کی زبانی سن چکا تھا کہ اسے یہاں تنک لانے والی وہی ہے۔ اسے یقین تو نہیں آیا تھا لیکن اپنی حالت اتنی آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”ہوں! تو موصوف ناراض ہیں۔ کوئی بات نہیں“ میں سوری کر دیں گی اور بتا دوں گی کہ میں نے بہت کوشش کی تھی اسپتال جانے کی لیکن کوئی لے کر ہی نہیں گیا اور پھر پریشانی کھانا بھی بنانا تھا۔“

فروا سوچتی ہوئی دوبارہ بچن کی طرف بڑھ گئی۔ ہانیہ بھی اس کے پیچھے ہی بچن میں آئی تھی۔

”دیکھو بسن! ہم تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔“ فروا نے خود سے معافی نہیں مانگی تو ہم بھی مجبور نہیں کریں گے، لیکن دوبارہ اس بات کا ذکر نہ سنوں۔ کل کلاں کو رشتہ بھی کرنا ہے اور پھر لوگ کیا کہیں گے۔ اس طرح بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی اختیار کر لی جائے۔“ سجاد نے مریم کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اٹھ کر کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

ہادی کو سارے کی ضرورت رہتی تھی اسی لیے ہر وقت ایک مودگھ میں موجود ہوتا تھا۔ ہادی اکثر لٹو لھٹا رہتا یا بیوی دیکھ لیتا تھا۔ ایک کیپشن کے لیے یہ زندگی بہت مشکل تھی، لیکن گزارنی تھی۔ صبا پہلے کچھ دن تو خوب باتیں کرتی رہی، لیکن پھر اس زندگی سے بور ہو گئی۔ اب وہ زیادہ وقت ہادی کے ساتھ گزارنے کی بجائے کمرے میں گزارتی اور ہادی کے پوچھنے پر کوئی بمانہ بنا دیتی۔

اب بھی فروا ہی پریشانی کھانا بناتی تھی گو کہ نجمہ منع کرتی رہتی تھیں۔ لیکن اسے ہادی کے کام کرنا اچھا

لگتا تھا۔ لیکن پھر بھی ہادی صحیح طریقے سے بات نہیں کرتا تھا۔

فروا، ہانیہ سے پوچھتی تو وہ ”بیباری کی وجہ سے چڑھا ہو گیا ہے“ کہہ کر ٹال دیتی۔ ہادی کی ٹانگ کے زخم خاصے بگڑ گئے تھے۔ اسے اسپتال میں دوبارہ داخل کر دیا گیا۔ پاؤں زیادہ خراب ہو جانے کی وجہ سے کٹنا پڑا۔

سب کے لیے یہ دل دہلا دینے والی خبر تھی۔ لیکن ہادی کی خاطر برداشت کر لیا تھا۔ ہادی کو بھی پتا چل گیا تھا لیکن وہ بھولن کی خاطر برداشت کر گیا اور وہ تو پھر جہاں خدار لھے وہیں خوش رہنے والا بندہ تھا۔

زندگی دوبارہ معمول کے مطابق چل پڑی۔ وہی دن وہی راتیں اگر فرق آیا تھا تو وہ صبا اور ہادی کی زندگی میں۔ صبا اب ہادی سے دور بھاگتی تھی بلکہ ایک دوبار کہہ بھی چکی تھی کہ وہ اب معذور کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ وہ ایک معذور کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ وہ اس بندھن سے جان چھڑوانے کے نئے نئے منصوبے بناتی رہتی، رہی سہی کسر دوستوں نے پوری کر دی۔

”صبا! تم اتنی خوبصورت ہو۔ کیا ساری زندگی ایک معذور کے ساتھ گزارا کر لو گی۔ وہ تمہیں دے گا ہی کیا؟ چھوڑو یار!“ اس کی دوستیں اب اس کے کمرے میں عبادت کے لیے تھیں، لیکن اب اس کے کمرے میں پیچھے نئے مشوروں سے نواز رہی تھیں۔ صبا جب سے ہی سوچوں میں گم تھی کہ ایسا کیا جائے کہ ”سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ اتنے میں ہادی نے بلاوا بھیج دیا۔

”صبا! آپ! آپ کو ہادی بھائی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔“ ہانیہ کہہ کر بھاگ گیا اور صبا ہادی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔ ہادی ویل چیمبر بیٹھا کسی گرمی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ دستک پر چونک گیا۔

”مجھے اس بات پر اندامت ہو رہی ہے کہ آپ میری بہن ہیں۔“ ہانیہ صبا کے کمرے میں چلی آئی۔
”کیوں؟ ہمیں نے ایسا کیا کر لیا ہے؟“ صبا نے منہ ہٹا کر جواب دیا۔

”آپ کی وجہ سے ہادی بھائی یہاں تک پہنچے اور آپ کو ذرا اندامت نہیں ہے۔ یہ کیسی محبت ہے آپ کی؟ ایک ہادی بھائی ہیں جنہوں نے صرف آپ کی خاطر انکار کر لیا۔ صرف آپ کی زندگی کی خاطر اور آپ کو ذرا دکھ نہیں ہوا بلکہ دھک تو کیا خوشیاں منا رہی ہیں۔“ ہانیہ بولنے پہ آئی تو بولتی چلی گئی۔ ان کی آواز سن کر کشمالہ بھی اُدھر ہی آگئیں۔

”کیا ہوا ہے ہانیہ؟“ اس نے ہانیہ سے پوچھا۔
”ہونا کیا ہے ماما! اس سے میری خوشیاں برداشت نہیں ہو رہیں۔ یہ چاہتی ہے کہ میں ایک معذور کے ساتھ پوری زندگی سسک سسک کے گزار دوں۔“ ہانیہ سے پہلے صبا نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟ پوری بات بتاؤ۔“ کشمالہ نے دونوں کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ آج سے پہلے کبھی دونوں اس طرح نہیں جھگڑی تھیں۔
”ماما! اس کی وجہ سے آج ہادی کی یہ حالت ہے۔“ ہانیہ نے کشمالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیوں؟ میری وجہ سے کیوں ہے؟ وہ صرف ایک مذاق تھا۔ ویسے بھی سب قسمت کی بات ہے اور پھر میں نے نہیں ہادی نے شادی سے انکار کیا ہے۔“ کشمالہ کے سر پر دھماکا ہوا۔

”ہادی نے تمہارے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ماما! وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے جیسے کسی مکمل انسان سے شادی کروں لیکن یہ سب ہانیہ سے برداشت نہیں ہو رہا۔“ صبا نے کہا۔

”مجھے بھی اس بات کی بہت فکر تھی۔ چلو! شکر ہے ہادی نے خود ہی انکار کر دیا۔“ ہانیہ کی آنکھیں اپنی ماں کی بات سن کر کھلی رہ گئیں۔

”کیا ماما آپ بھی؟“ دکھ کی وجہ سے ہانیہ سے بولا

”تمہیں دستک دینے کی ضرورت کب سے پیش آنے لگی؟“ ہادی نے صبا کو دیکھ کر کہا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے کمرے میں بغیر دستک کے جاتے تھے۔
”جی! آپ نے بلایا تھا؟“ صبا نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

ہادی گہرا سانس لے کر بولا۔ ”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے صبا! بیٹھو۔“ بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ صبا کو نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔

”صبا! میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔“ ہادی اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ اس کے لیے یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔
”آپ چپ کیوں کر گئے ہادی!“ صبا نے بے چینی سے کہا۔ اس کی سانس اٹکی ہوئی تھی ہادی کیا کہنا چاہتا ہے۔

”میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔“ وہ ایک بار پھر چپ ہو گیا۔ صبا کی بے چینی اور بڑھ گئی۔

”آپ بتائیے نا ہادی! چپ کیوں ہو گئے؟“
”تم۔۔۔ تم کسی اور سے شادی کر لو۔ میں اب تمہارے قابل نہیں رہا۔“ ہادی نے اٹک اٹک کر بیان کیا۔ صبا کے سینے سے بھاری سل ہٹ گئی۔
”لیکن آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟“ اس کا دل ناپنے کو چاہ رہا تھا لیکن ایسا ممکن نہیں تھا اسی لیے مارے صروت کہ اسے پوچھنا پڑا۔

”میں اب معذور ہوں۔ میں خود دوسروں کا محتاج ہوں پھر تمہیں کیسے خوش رکھ سکوں گا۔“ ہادی کے لیے یہ سب بہت مشکل تھا۔ صافورا! اٹھ کر باہر بھاگ گئی۔ اسے ڈر تھا کہیں اندر کی خوشی باہر نہ نکل پڑے۔ باہر کھڑی ہانیہ ایک طرف ہو گئی۔ صبا کے جاتے ہی قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہادی بھی یہ بات کہہ کر اتنا ہی خوش ہے جتنی سن کر صبا۔

ہادی کی بند آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ جس خاموشی سے اندر گئی تھی اسی خاموشی سے باہر آگئی۔



نہیں گیا۔

”تو؟“ والدین اپنے بچوں کے بارے میں اچھا ہی سوچتے ہیں۔ تم اچھی نادان ہو۔ تمہیں کیا پتا زندگی کیسے گزرتی ہے۔ کشملا نے ہانیہ کو جھاڑ دیا۔ ہانیہ آنسو ضبط کیے سر جھکا کر باہر کی طرف چل پڑی۔

”ہادی نے صبا سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔“
دو دن بعد ہی پورے گھر میں یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب نے باری باری ہادی سے پوچھا، سمجھایا، لیکن اس کی نہ ”ہاں“ میں نہیں بدلی۔ ہانیہ کو اپنی بہن پر بہت غصہ آ رہا تھا، لیکن بہنوں کی وجہ سے خاموش تھی۔ اس کا زیادہ وقت ہادی کے ساتھ گزرتا۔ بہت بار ہادی سے پوچھا، لیکن وہ مسکرا کر ٹال دیتا۔ پھر بہت جلد ہی فروا کے لیے آیا ہوا رشتہ صبا کے لیے پسند کر لیا گیا۔ انہیں تو پہلے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ صبا کو برا تو بہت لگا لیکن پھر ایاز کے ڈاکٹر ہونے اور معذور شخص سے اتنی جلدی جان چھوٹ جانے پر مطمئن بھی تھی پھر اس خوشی کے آگے نفرت، غصہ سب کچھ ماند پڑ گیا کہ وہ ایک بار پھر فروا سے جیت گئی ہے۔

ایاز کو لندن میں ملازمت مل گئی تھی گوکہ وہ پاکستان میں بھی اچھی جاب کر رہا تھا لیکن انسان کو ہمیشہ بہتری تلاش رہتی ہے۔ اس طرح ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی اور وہ دونوں لندن چلے ہو گئے۔

ہادی کو مصنوعی پاؤں لگوا دیا تھا۔ شروع میں مشکل تو ہوئی لیکن پھر آہستہ آہستہ عادت ہو گئی۔
آج اس کا ایکسیڈنٹ کے بعد آفس میں پہلادان تھا۔ سب لوگ اس کی نیوٹ پوچھ رہے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو خیریت پوچھنے کے بجائے پاؤں دیکھنے کے لیے زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔
ہادی ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ ہر کسی کا جواب

مسکرا کر دے رہا تھا۔ بظاہر تو سب ٹھیک تھا لیکن یہ کوئی ہادی کے دل سے پوچھتا کہ پاؤں کے بارے میں کیسے لگے ہر سوال پر اسے سختی تکلیف ہوتی تھی۔

چھ مہینوں کے بعد دفتر آیا تھا۔ اسے امید تو نہیں تھی کہ دوبارہ جاب کے لیے اجازت ملے گی لیکن یہاں پر اس کی قابلیت کام آئی تھی۔ آج اسی سلسلے میں ایک میٹنگ رہی گئی تھی۔ سب میٹنگ روم میں جمع ہو گئے تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ہادی خود میں بہت نہیں بارہا تھا۔ دوسری بار انٹرکام بجائے تو اسے حوصلہ پیدا کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا میٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر اسی انداز سے چلا ہوا اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کرسی کے پاس جا کر ایک بار پھر ہمت کھودی۔

اس کے اندر اس بل بہت کچھ ٹوٹ کے بکھرا تھا۔ پچھلے چھ مہینوں میں اس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اپنا پاؤں، جان سے عزیز صبا۔ اسی جگہ پر کال آئی تھی اور پھر بہت کچھ غلط ہو گیا تھا۔ کسی کی مذاق میں گئی کال نے اسے ہمیشہ کے لیے ادھورا کر دیا تھا۔ وہ یہ سب کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن آج تو اسے اپنی سوچ پر بھی قابو نہیں رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کرسی کی پشت کو تھام لیا۔

میٹنگ کے لیے آئے ہوئے سب لوگ میٹنگ بھول چکے تھے۔ ہادی کو کانپتا ہوا دیکھ کر فروا ”وقار آگے بڑھا اور اسے کرسی پر بٹھادیا اور میٹنگ کینسل کرنے کو کہہ دیا۔ ہادی کے وجود نے کانپنا بند کر دیا اور اب تو آواز سے اس کی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا۔ وقار اس کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ آج پہلی بار رویا تھا اور شاید آخری بار بھی۔ وقار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چھٹی دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔
ہادی پہلے کی طرح ڈیوٹی پر جاتا تھا لیکن اب وہ بہت

خاموش ہو گیا تھا۔ مسکراتا تو جیسے بھول ہی گیا تھا۔ صبح آفس جانا اور واپسی پر پہلے کی طرح چمچیر جھاڑ کرنے کی بجائے سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا اور زیادہ تر رات کا کھانا بھی اپنے کمرے میں ہی منگوا لیتا۔

اب سب لوگ اس کی شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے اور لڑکی بھی ان کی نظر میں تھی۔ ان سب کا خیال تھا کہ جس نے ہادی کی زندگی کو ادھورا کر دیا تھا اب وہ ہی اسے پورا کرے۔ شاید اسی طرح خدا اسے بھی بخش دے۔

اور آج اسی سلسلے میں سجاد اس کے کمرے میں آئے تھے۔
”پاپا! آپ نے مجھے بلوالیا ہوتا۔“ ہادی باپ کو دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا اور کمپیوٹر بند کر دیا اور پھر اپنے باپ کے منہ سے شادی کے لیے فروا کا نام سن کر حیران رہ گیا۔

”پاپا! آپ میرے لیے اس لڑکی کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے میری زندگی برباد ہوئی؟“
”بیٹا! خدا شاید اسی طرح اسے بخش دے۔“ سجاد نے کہا۔

”نہیں پاپا! میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کبھی اسے خوش نہیں رکھ سکوں گا۔“

”تمہیں اب بھی اس کی خوشیوں کا خیال ہے؟“
سجاد نے غصے سے کہا۔

”کیا میں بھی ویسا ہی کروں جیسا اس نے کیا؟ نہیں پاپا! ہرگز نہیں اور پلیز آپ مجھے مجبور مت کریں میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ اور پھر اس کی ماں نے بھی بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔

یہ خبر صبا تک بھی پہنچ گئی جو آج کل پاکستان آئی ہوئی تھی۔ سب گھر والے راضی تھے فروا سے کسی نے پوچھنے کی ضرورت تک نہیں سمجھی تھی، لیکن ہانیہ یہ سب برداشت نہیں کر سکی اور فروا کے پاس پہنچ گئی۔

”آپ کس مٹی سے بنی ہیں آپ! آپ کبھی کیوں

نہیں؟ کسی کی سزا آپ کو کیوں ملے؟“
”چپ کر جاؤ ہانیہ! آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔“ اس کا ڈانڑی بڑھتا ہوا ہاتھ لفظ ”مسرا“ پر رک گیا تھا۔
”کیوں نہ کیوں نہ کہوں؟ آپ کو کیا سمجھ رہا ہے سب نے؟ آپ میں اتنی ہمت نہیں ہے تو میں کہہ دیتی ہوں۔“

”کہنا ہانیہ! چپ کر جاؤ اور دعا کرو جیسا سب چاہتے ہیں ویسا ہی ہو جائے۔“ فروا نے مسکرا کر کہا۔
”یہ آپ کیا کہہ رہی ہے آپ! ہانیہ حیران رہ گئی۔ فروا مسکرا کر دوبارہ مصروف ہو گئی۔ ہانیہ صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی مسکراہٹ نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا وہ جس طرح چیختے چلاتے ہوئے آئی تھی اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گئی۔

صبا پاکستان آئی ہوئی تھی۔ ایاز اور صبا سب سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سب نے انصرار کر کے صبا کو رات تک روک لیا تھا۔ ایاز کو کام تھا، جس کی وجہ سے وہ نہیں رکا۔ ایاز کے جاتے ہی سب صبا کے سر ہو گئے کہ وہ ہادی کو شادی کا کہے، وہ اس کی بات نہیں ٹالے گا۔ سب کے بار بار کہنے پر صبا کا سر خسرے بلند ہو گیا۔

وہ جو اپنے لندن کے قصے سنائے کو بے تاب تھی، سب بھول گئی اور ہادی کے کمرے کی طرف چل گئی۔
آج اتوار تھا۔ ہادی بھی گھر ہی تھا۔ وہ کچھ دیر ایاز کے پاس بیٹھ کر اٹھ آیا تھا اور اب کمپیوٹر پر ٹائپنگ کرنے میں مصروف تھا۔ صبا دستک دے کر اندر آ گئی۔
”کیسے ہو ہادی؟“ وہ ہادی کے پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ارے صبا تمہیں؟“ کی بورڈ پر چلتی ہوئی انگلیاں ایک بل کے لیے رکیں اور پھر اسی رفتار سے چلتی گئیں۔

صبا خاموشی سے ہادی کو دیکھتے ہوئے داغ میں الفاظ

ترتیب دینے لگی۔ اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔
”ایک بات مانو گے ہادی؟“ صبا نے بالا خربات شروع کی۔

”بولو“ ہادی اس کی طرف متوجہ ہوا۔
”پہلے وعدہ کرو؟“ اس کے اجازت دینے پر اس نے شرط بھی رکھ دی۔

”وعدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہاری کوئی بات نہیں ٹالی۔“ ہادی نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

”ہادی! تم فروا سے شادی کرو۔“ صبا نے اس کے سر پر ہموں بٹھا دیے۔
”صبا! یہ تم کہہ رہی ہو؟“ ہادی نے بے یقینی سے صبا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مصل میں ہادی! فروا بہت شرمندہ ہے اور وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی ہے اس نے کہا ہے کہ میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔“ صبا نے جلدی جلدی جواب دیا۔

”لیکن صبا! میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔“ ہادی نے اس کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

”لیکن ناممکن تو نہیں ہے۔ پھر تم جانتے ہو کہ سب گھر والے بھی یہی چاہتے ہیں۔“ فروا اچھی لڑکی ہے۔“ صبا نے کہا۔ ہادی نے صبا کی آنکھوں میں جھانک دیا۔ پھر جانے کا کوئی ملال نہیں تھا۔ اس کے اندر دکھ کی ایک لہر دوڑ گئی۔

”تم بھی تو اچھی لڑکی تھیں، پھر مجھ سے محبت بھی کرتی تھیں۔ جب تم نہیں تو پھر خاندان کی کوئی اور لڑکی کیوں؟“ وہ یہ سب صرف سوچ رہا کہ کہنے سے کچھ واپس نہیں آسکتا۔

”میں آج کے بعد تم سے کچھ نہیں کہوں گی لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اچھی زندگی گزارو۔ صرف یہی بات مان لو۔“ پلین شادی کرو۔“ صبا نے ہادی کو اپنی طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو جلدی میں جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

”ٹھیک ہے! تم جاؤ۔“ اب ہادی نے سخت لہجے میں کہا تو صبا فوراً اٹھ گئی اور جاتے جاتے ایک بار پھر فروا کا نام یاد دلانا نہ بولی۔

پھر سب نے ہادی کا اقرار سنا۔ صبا کو واپس جانا تھا۔ اس لیے پندرہ دن کے بعد ہی سادی سے شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

کوئی اور خوش تھا یا نہیں لیکن فروا بہت خوش تھی۔ اب بن سمندی سب بہت سادی سے ہوا۔

مختلف رسموں کے بعد فروا کو ہادی کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ میروں لینے میں فروا پر روپ آیا تھا تو ہادی بھی بلیک ٹری پیس میں بہت سچ رہا تھا۔

اس کے جاتے ہی فروا نے سادہ کپڑے اٹھائے اور ہاتھ روم میں گھس گئی۔ وہ ہادی کے آنے سے پہلے پہلے شکرانے کے لہلہ بڑھنا چاہتی تھی۔

فروا شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد کچھ دیر تک ہادی کا انتظار کرتی رہی۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ جب خاصی دیر ہو گئی تو اس نے تکیہ اٹھایا اور صوفے کی جانب بڑھ گئی۔

جس خاموشی سے شادی ہوئی تھی ویسہ بھی اسی خاموشی سے گزر گیا اور زندگی دوبارہ اپنی ڈگر پر چل پڑی۔ ہادی کو اب اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے نوکرائی کو آواز نہیں لگانا پڑتی تھی۔ کتنا تو وہ فروا کو بھی نہیں تھا، لیکن وہ خود ہی ہر چیز تیار رکھتی تھی۔ وہ فروا کو اس کا مقام نہیں دے پا رہا تھا۔ سوچوں کو کم کرنے کے لیے زیادہ وقت باہر گزارا۔ فروا کو کوئی شکایت نہیں کرتی تھی اور کوشش کرتی کہ اسے بھی شکایت کا موقع نہ دے۔

ہادی پہلے دن کی طرح ہی ڈرننگ روم میں سوتا تھا۔ البتہ فروا نے بیڈ پر سونا شروع کر دیا تھا۔ فروا خود ہی سامنے کم آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہادی اسے دیکھتے ہی ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ اسے کسی قسم کی

تکلیف سے دوچار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ صبا کی تین دن کے بعد فلائٹ تھی۔ وہ آج ملنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

اس وقت ہانیہ، فروا اور صبا لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ صبا کو آج لندن کے قصبے سنانے کا موقع مل گیا تھا اور وہ خوب بڑھاپا ہا کر سنارہی تھی۔

”فروا! تم لوگ ہنی مومن کے لیے کب جا رہے ہو؟“ مجھے تو ایاز نے پورا لندن ہی دکھا دیا ہے۔ تم لوگ بھی لندن ہی آنا ہنی مومن کے لیے۔“ صبا نے بالوں کو کچھو میں باندھتے ہوئے کہا۔

”ہم لوگ ہنی مومن کے لیے نہیں جائیں گے۔“ فروا نے کہا۔

”کیوں... کیوں نہیں جاؤ گے؟“ صبا نے حیرانی سے دیکھ کر کہا۔

”بس ویسے ہی نہیں جائیں گے۔“ فروا فصول خروچی کا کتے کتے رک گئی۔

”وا! اچھا تم بھی تمہاری بات گھما کر کرنے سے باز نہیں آتیں۔ سیدھی طرح کہو کہ ہادی کے پاؤں کا مسئلہ ہے۔ بے چارہ۔“ صبا تقبہ لگا کر ہنی اور اندر داخل ہوتے ہادی کے قدم دبیں۔ جم گئے۔

”صبا! تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ہادی کو ایسا کچھ کہو۔“ فروا نے غصے سے کہا۔

”تو چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔“ صبا نے ناک مسکوڑ کر کہا۔

”اپنی! آپ کو شرم آتی چاہیے۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا اور آپ ہی مذاق اڑا رہی ہیں۔“ ہانیہ سے رہانہ کیان بول پڑی۔

”تم بھی تنگ اس کی چیچی ہو؟ اسے تو اچھا بننے کا شوق ہے، تم بھی اسی کی طرح کسی اندھے، لنگڑے کا انتخاب نہ کر لیتا۔“ صبا نے فوراً کہا۔

فروا خاموشی سے انڈھ کر اندر چلی گئی۔ صبا سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جتنا سمجھانے کی کوشش کرتی بات کو استہسا ہی بڑھاتی۔

”میں کسی اندھے کا انتخاب کروں یا لنگڑے کا لیکن

آپ کی طرح کسی سہیلیش نہیں بن سکتی۔“ ہانیہ سے دکھ کی وجہ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”تم نے کیا میری خود غرضی دیکھی ہے؟ اپنا کون برا سوچتا ہے؟ میں نے تو پھر فروا کی محبت کی قدر کی ہے۔ اس کی خاطر ہادی کو منایا ہے ورنہ وہ تو شادی ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ صبا نے کہا۔

ہادی کے لیے آپ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس مڑ گیا۔

ہادی کولان میں بیٹھے نجانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور کتنا مزید گزر جاتا اگر فروا وہاں نہ آ جاتی۔

وہ روزانہ ہادی کا انتظار کرتی، پھر کھانے وغیرہ کا پوچھتی اور چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھا کر جگہ پر رکھتی تھی۔ جب تک ہادی ڈرننگ روم میں نہ چلا جاتا۔ وہ یونہی اس کے آگے پیچھے بھرتی رہتی۔ اکثر اسے ہادی پر بہت ترس آتا۔ اس کی وجہ سے اسے ڈرننگ روم میں سونا رہتا تھا لیکن وہ کوشش کے باوجود بیڈ پر سونے کے لیے گہم نہ پاتی۔

آج بھی جب ہادی کمرے میں آیا ہی نہیں تو اسے فکر ہونے لگی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد لاؤنج میں نکل آئی لیکن جب وہاں بھی نہ پایا تو لان میں آگئی اور اب ہادی کو اتنی سردی میں لان میں کرسی پر بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھ دیر تک کھڑی دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہادی کی طرف بڑھ گئی۔

”ہادی!۔“ فروا نے دھیمی آواز میں پکارا۔ لیکن جب کچھ دیر تک ہادی نے کوئی جواب نہ دیا تو ایک دم پریشان ہو گئی اور فوراً ”آگے بڑھی۔“

”ہادی!۔“ ہادی اکیا ہوا ہے آپ کو؟“ فروا نے ہادی کو کندھے سے پکڑ کر بلایا۔

چاند کی روشنی میں گالوں پر شبنم کی طرح پھیلے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر وہ ایک بل میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اسی دن کے ڈر سے وہ خود جتنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ محبت کا دکھ جانتی تھی۔

وہ وہیں بیٹھ گئی اور ایک بار پھر ہادی کو پکارا۔ ہادی نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں اور اپنے پاس بیٹھی فروا کو دیکھا تو خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور روتے ہوئے فروا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”مجھے معاف کر دو فری! میں نے تمہیں بہت دکھ دیا۔ ایک بار بھی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی اور تم نے بھی نہیں بتایا۔“ وہ معافی مانگتے مانگتے شکوے پر اتر آیا۔

فروا نے ہادی کے ہاتھ تھام لیے۔
”یہ ہاتھ معافی مانگنے کے لیے نہیں بنائے گئے ہادی! میں جانتی ہوں۔ آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کی بات کبھی جھوٹی نہیں لگتی۔ اگر میں بتاتی تو آپ کو کبھی یقین نہیں آتا تھا۔“ اس نے ہادی کے گالوں پر لڑھکتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”اندر چلیں۔ باہر بہت سردی ہے۔ جو کچھ ہوا“ اسے بھلا دیں۔ یاد کرنے سے صرف تکلیف ہوتی ہے۔“ فروا ہادی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔



آنکھوں سے نفرت کی نئی اتاری تو اسے سب کچھ بہت اچھا لگنے لگا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا کہ اسے فروا جیسی محبت کرنے والی بیوی ملی۔ خدا کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ صبا جیسی خود پرست، انانیا ماری ہوئی لڑکی کے ساتھ ہادی جیسے نفیس بندے کی زندگی بہت گراں گزرتی۔ ہادی سب کو بتانا چاہتا تھا لیکن فروا نے منع کر دیا۔

صبا واپس لندن چلی گئی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ سب بہت مطمئن تھے کہ ایک بار پھر بھونچال آگیا۔ صبا کو لندن گئے ہوئے سات ماہ ہوئے تھے کہ ڈاکٹر ایاز کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ صبا کا بیٹا تین مہینے کا تھا۔ ایاز کی جان بچ گئی تھی، لیکن، بیشک کے لیے معذور ہو گیا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد وہ پاکستان شفٹ ہو گئے۔

صبا بہت جلد ایاز کی معذوری سے تنگ آ گئی، لیکن اب اس کا بیٹا حسام اس کے رستے کی دیوار بن گیا۔ اس کی حالت اب ایسی تھی کہ نہ اگل سکتی نہ نکل سکتی۔ اسے اب پیچھتاؤں نے گھیرنا شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پیچھتاوے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اسے ایسے لگتا کہ فروا کی بددعا لگ گئی ہے۔
”میں فروا کے ساتھ کتنی زیادتی کرتی تھی اس کی محبت کو پھینکنا اس کی ہر چھوٹی موٹی خوشیوں کو پھینکنا اور کبھی احساس تک نہیں ہوا۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوا ہے۔“

جب انسان اپنی حدود سے نکل جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی رسی کو پھینچ لیتا ہے۔ ایسے میں اس کے پاس پیچھتاوے کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ معافی مانگنا چاہتی تھی۔ فروا سے ہادی سے سب سے۔ لیکن خود میں اتنی ہمت نہیں پاری تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے اپنے کے لیے سزا اب تمام عمر بھگتنی تھی۔ بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ ہادی سے تو جان چھڑوا لی تھی، لیکن ایاز سے جان بھی نہیں چھڑوا سکتی تھی۔



”صبا کتنے دن رہے گی یہاں؟“ ہادی نے فروا سے پوچھا جو اس کی چیزیں اٹھا کر رکھ رہی تھی۔
”شاید دو دن۔ آپ ملے ہیں اس سے؟“ فروا نے جواب کے ساتھ ہی سوال کر ڈالا۔

”ہاں! بہت چپ چاپ تھی۔ بس سلام کیا اور دوبارہ حسام کے ساتھ مصروف ہو گئی۔“ ہادی نے کہا۔
”مجھے دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے، میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ نہ ہی کبھی بددعا دی تھی میں تو بس، بیشک دعا مانگتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے۔“ فروا نے ہادی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کچھ لوگ ٹھوکر کے بغیر نہیں سنبھلتے فری! یہ دنیا تو مکافات عمل کا نام ہے۔ جو عیاں ہوتا ہے وہی سب کاٹنا ہے۔ چھوڑو! ہم کن باتوں میں الجھ گئے اللہ تعالیٰ اسے اپنے گھر میں سکون دے۔ آمین۔“ ہادی نے کہا

اور ساتھ ہی ڈرنگ روم کی طرف چل پڑا۔
دوسرے دن چھٹی تھی۔ سب لوگ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ چھٹی کے دن ہی سب اکٹھے ناشتا کرتے اور دھیر ساری باتیں کرتے تھے، لیکن آج سب خاموش تھے۔ سب کو صبا کا بہت دکھ تھا۔ صبا کھانا کھانے کی بجائے سلاکس ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں مناسب الفاظ ترتیب دے رہی تھی۔
”دعائیں آپ سب سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔“ صبا نے سلاکس پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور اب ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ سب نے حیران ہو کر سر اٹھایا۔
”ماں نے ہادی اور فروا کے ہادی تو کل ہی جان گیا تھا کہ وہ معافی مانگنے آئی ہے۔“

”کس بات کی معافی بیٹا!“ حجاب نے پوچھا تو وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور ساتھ ہی ساری بات کہہ ڈالی۔ سب کے ہاتھوں سے کانٹے، چمچے ٹیبل پر گر گئے۔
”یہ تم کیا کہہ رہی ہو صبا!“ حجاب نے اونچی آواز میں کہا۔

”بیٹا! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔“ وہ فوراً ”اٹھ کر فروا کے قدموں میں بیٹھ گئی۔“ مجھے معاف کر دو فروا! میں نے بیشک تمہارے راستے میں کانٹے بوئے۔ تم پر الزام لگایا۔ لیکن تم نے کبھی پلٹ کر کچھ نہیں کہا۔ پلیز فروا! مجھے معاف کر دو۔“ صبا نے روتے ہوئے فروا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو صبا! اگل ہو گئی ہو کیا؟“ فروا نے کرسی دھکیل کر صبا کو کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔
سب کرسیاں جھوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ صبا اب ہادی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی، لیکن ہادی خاموشی سے اندر کی جانب بڑھ گیا اور اس کے پیچھے ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔

اسے کسی نے معاف کیا تھا یا نہیں، وہ نہیں جانتی تھی لیکن اب وہ پہلے کی طرح بے سکون نہیں تھی۔

ایاز نے اسے فون کیا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آ رہا تھا۔ صبا ایک بار پھر ہادی سے معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن فروا نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ اسے پہلے ہی معاف کر چکا ہے۔

”تو ہادی پہلے ہی سب کچھ جان گیا تھا۔ کتنا ظریف ہے ہادی کلا ایک بار بھی جگہ نہیں کیا۔“
گاڑی کا مخصوص ہارن سن کر وہ فوراً ”اندر کی جانب بڑھی۔“

ڈرائیور نے جلدی سے وہیل چیئر نکالی اور ایاز کو سہارا دے کر اوپر بٹھایا ایاز ایک سیٹلٹ کے بعد پہلی بار اٹھا تھا۔ سب بڑے کمرے میں جمع ہو گئے۔ ڈرائیور وہیل چیئر کو گھماتے ہوئے اندر لے آیا۔ کچھ دیر بعد صبا تیار ہو کر حسام کو اٹھائے وہیں آ گئی۔

”چلو صبا! امی انتظار کر رہی ہوں گی۔“ ایاز نے کھانا کھاتے ہی کناٹا صبا بھی اٹھ گئی۔ سب انہیں چھوڑنے کا ڈی تک آئے۔ آج شادی کے بعد پہلی بار سب جمع تھے۔ ایاز سے ملنے کے بعد سب صبا سے مل رہے تھے۔

صبا سے شرمندگی کے باعث نظرس اٹھائی نہیں جا رہی تھی۔ ہانیہ اپنی بہن کا یہ روپ دیکھ کر بہت خوش تھی۔ صبا سے ملنے کے بعد مبارک باد دیتے ہوئے فروا کے گلے لگ گئی۔ سب نے صبا کو معاف کر دیا۔ صبا کو رخصت کرنے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔
سوئے ہادی اور فروا کے۔

ہادی پاس ہی کیا ریوں میں لگے ہوئے گلاب کے پھول تو ڈر فروا کی طرف بڑھ گیا جو ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔

”میری محبت کی پہلی نشانی۔“ ہادی نے ہاتھ میں پکڑا پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔
فروا نے مسکراتے ہوئے پھول لے لیا۔

”محبت سچی ہو اور پانے کی لگن ہو تو اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں کو واپس نہیں کرتا۔“
میرس پر کھڑی مسکراتے ہوئے نیچے دیکھتی ہانیہ نے سوچا۔



کای مولا علی قصبی

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں، مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جھانی اپنے بچوں نعمان، ثوبان، فرید، فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں، ثوبان اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں، عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ، عادلہ اور حمیدال کی تندی ہیں، ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال، جمال ملک سے باہر مگر اس کی بد مزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابراہیم جیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے، باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چاچا کی کبریٰ کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ بڑوائی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشری کی ابراہیم سے شادی ہو جائے مگر ابراہیم صاف انکار کر دیتا ہے۔ اصغر کو غصہ آتا ہے وہ ابراہیم پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ ابراہیم ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے اور شہر آکر حمیدال کے گھر رہنے لگتا ہے۔ برکت حسین اس کی ماں کے چچا زاد بھائی ہیں۔ حمیدال ابراہیم سے سخت بیزار رہنے لگتی ہیں۔

ناولٹ



نعمان اپنے اسٹور سے سودا لینے والے ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ کو پسند کرتا ہے۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر ہے۔ نعمان عاکشہ
ماں سے رشتے کی بات کرتا ہے اور ان سے فاطمہ کی شادی تک انتظار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ حمید داں کا دونوں بیٹوں سے
پہلے بیٹوں کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ عائشہ اور اس کے گھر والے تھوڑی سی جیل حجت کے بعد ماں جانے
ہیں۔

عادلہ نبیلہ کے کہنے پر بچت کر کے عریشہ کے لیے سوئے کا سیٹ بنواتی ہیں۔ عادلہ کے منع کرنے کے باوجود عریشہ حمید داں
کو وہ سیٹ دکھا دیتی ہے۔ حمید داں کی عریشہ سے لگاؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔
فاطمہ کی شادی پر حمید داں عادلہ سے وہ سیٹ مانگتی ہیں۔ عادلہ پریشان ہو جاتی ہیں کیونکہ انہوں نے وہ سیٹ عریشہ کے
لیے بہت مشقت سے بنایا ہوتا ہے۔ حمید داں بھند ہوئی ہیں کہ فاطمہ کو شادی پر سوئے کا سیٹ دیا جائے جبکہ ان کی حیثیت
نہیں ہوتی۔ وہ ٹوبان کی فیس کے پیسے نکال لیتی ہیں۔ ٹوبان بہت بگڑتا ہے۔ عریشہ ٹوبان کی پریشانی دیکھ کر چپکے سے وہ سیٹ
نکال کر حمید داں کو دے دیتی ہے۔

شادی والے دن نبیلہ فاطمہ کے گلے میں وہی سیٹ دیکھتی ہیں تو عادلہ سے کہتی ہیں۔ عادلہ عریشہ سے پوچھتی ہیں تو وہ
بجائے شرمندہ ہونے کے دھڑلے سے اعتراف کرتی ہے کہ اس سے ٹوبان کی پریشانی نہیں دیکھی گئی۔ عادلہ عریشہ کی
حرکت سے اتنی دل برداشتہ ہوتی ہیں کہ ان کا دل بند ہو جاتا ہے۔ عریشہ پچھتاتی ہے۔ ٹوبان لگاؤ سے اسے ہسلانے کی
کوشش کرتا ہے۔

ابراہیم کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ عریشہ ٹوبان کو پسند کرتی ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ ٹوبان اپنے فائدے کے لیے
سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی خود غرضی جان کر ابراہیم اس سے سخت کبیدہ خاطر ہو جاتا ہے۔
حمید داں کو نعمان کی خواہش کا علم ہو جاتا ہے اور جب عائشہ کی والدہ عادلہ کی تعزیت کرنے حمید داں کے پاس آتی ہیں تو وہ
ان سے خوش اخلاقی سے نہیں ملتیں۔

”آج کل ماں باپ نے لڑکوں کو پھانسنے کے لیے اپنی لڑکیوں کو آگے کر رکھا ہے اور لڑکیاں خود ہی معاملہ سیٹ کر لیں
ہیں۔“ جیسے سخت الفاظ کہہ کر ان کی بے عزتی کر دیتی ہیں۔

عائشہ کی والدہ دہراشتہ ہو کر ان کے گھر سے چلی جاتی ہیں بلکہ وہ عائشہ کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چند دنوں کے لیے
دوسرے شہر چلی جاتی ہیں۔ نعمان اس تمام عرصہ میں سخت پریشان رہتا ہے۔ ان کی واپسی پر ان کے گھر جاتا ہے تو وہ بتاتی ہیں
کہ انہوں نے عائشہ کا کہیں اور نکاح کر دیا ہے۔ وہ مغموم سا واپس آ جاتا ہے۔

نبیلہ عریشہ کا سیٹ لے لینے پر فاطمہ سے برگشتہ ہوتی ہیں تاہم فاطمہ کے وہ سیٹ لوٹا دینے کا وعدہ کرنے پر وہ راضی
ہو جاتی ہیں۔

ابراہیم باسط کو یوشن پڑھانے جاتا ہے۔ وہاں باسط کی بڑی بہن صنعیہ کے ساتھ ٹوبان کی بے تکلفی دیکھ کر حیرت کا
اظہار کرتا ہے۔

ابراہیم عریشہ کو ٹوبان کے ساتھ چھت پر تنہا دیکھ کر اسے متنبہ کرتا ہے کہ دونا محرم کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔
گاڈ میں کوئی جمیلاں کی بھیئیں کو زہر دے کر مار دیتا ہے۔ عریشہ اور مریم نے بی ایڈ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مریم کا
کوئی ایئر شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے عریشہ بے خبر ہوتی ہے۔

صنعیہ ٹوبان کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ٹوبان انکار کر دیتا ہے تو صنعیہ بالکل پروا نہیں کرتی۔ ٹوبان نعمان سے باہر
جانے کے لیے پیسے مانگتا ہے۔ اس کے انکار پر دونوں میں تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔ نعمان حمید داں سے کہتا ہے کہ وہ عریشہ سے
شادی کرنا چاہتا ہے۔ حمید داں مان جاتی ہیں۔ نعمان کے انداز بدل جاتے ہیں۔ عریشہ گھبرانے لگتی ہے۔

حمید داں مریم کی زبردستی منگنی کر دیتی ہیں۔ وہ پھر بھی فائدے راجے میں رہتی ہے۔ نبیلہ کے پاس جاتی ہے۔ نبیلہ اسے
سمجھاتی ہیں، مگر وہ نہیں مانتی۔ کاغذات لے کر وہ گھر آتی ہے تو حمید داں، ٹوبان اور نعمان کی باتیں سن لیتی ہے۔ جس میں
اس کے مکان اور دکان کو ہتھیانے کا منصوبہ بتا رہے ہوتے ہیں۔ وہ غصے میں ٹوبان کا گریبان پکڑ لیتی ہے۔ ابراہیم اسے
کے پاس لے جاتا ہے۔

بڑی اپنے سرال میں خوش نہیں رہتی۔ نعمان فائدہ اور مریم کو ایک ساتھ دیکھ لیتا ہے۔ اور گھر آ کر خوب ہنگامہ کرتا
ہے۔ مریم کو بتاتا ہے اور جلد نکاح کرنے کا کہتا ہے۔
عریشہ نبیلہ سے کہتی ہے کہ حمید داں سے مکان خالی کروادیں۔ عریشہ مکان کی چابیاں لینے حمید داں کے گھر جاتی ہے۔
وہاں حمید داں اور نعمان اس سے زبردستی نکاح نامہ پر سائن کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سکاتوں قید میں

نعمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
”اماں! تم جاؤ۔۔۔ میں اس سے خود بات کرتا
ہوں۔“

نعمان کی آواز ونگاہوں نے عریشہ کے وجود میں
پھریری کی بیڑا دی۔
اسے یقین تھا تائی نہیں جائیں گی۔ مگر اس کی
آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب اس نے تائی کو
ڈیوڑھی کے دروازے کو پار کرتے اور پھر روانہ بند
کرتے دیکھا۔

وہ ان کے پیچھے لپک کر جانے کو تھی جب نعمان
نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے دھکیلا۔ عریشہ کے لبوں
سے تیز چیخ نکلی۔ مگر نعمان کے ہاتھ نے اس کی چیخ کا
گلا گھونٹ دیا۔ وہ پوری طرح اس کے شکمے میں گھس اور
وہ اسے کھینچ کر کمرے میں لے جانا چاہتا تھا شاید وہ ڈرنا
تھا کہ کہیں ہمارے اس کی چیخ و پکار نہ سن لیں۔ مگر
عریشہ کی مزاحمت شدید تھی۔

”الو کی پچی۔۔۔“ نعمان نے ہاتھ ہٹا کر پوری قوت
سے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ عریشہ کا ہونٹ
پھٹ گیا۔ وہ پورے فائدے سے گھر گئی۔ نعمان کے ہاتھ
سے کاغذ بھی پھوٹ گیا۔ عریشہ نے جنونی انداز میں
اس کاغذ کو بڑے بڑے کر ڈالا۔

نعمان گویا غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ عریشہ کو تا بڑوڑ
مکوں اور لاتوں کی زد پر رکھ لیا۔

اس کی چیخوں نے آسمان ہلا ڈالا۔
”میں دوں گی۔۔۔ مارو گے تب بھی نہیں دوں گی
۔۔۔ یہ میری جانب ادب ہے۔ میرے باپ کی ہے۔“

”کیسے کاغذات۔۔۔؟“ عریشہ نے حیرت سے کاغذ

دیکھا۔

”یکل نامہ ہے۔“ نعمان ہنسا۔
”کیا کو اس ہے۔۔۔“ وہ ڈر گئی۔ ”جائیں یہاں سے
ورنہ میں شور مچا دوں گی اور تائی! آپ! آپ کو شرم
نہیں آئی۔؟ آپ کے اپنے گھر میں بھی بی بی ہے اور
۔۔۔“

”ایس کو اس کر رہا ہے تو ہٹ پیچھے۔۔۔“ تائی
نے دھپ لگا کر نعمان کو پیچھے کیا۔

”دیکھ عرشی! میں تیری ماں کی جگہ ہوں۔۔۔ ہمیشہ
عادلہ سے بڑھ کر تجھے چاہا۔۔۔“ حمید نے چاہلو سنا
انداز میں کہنا شروع کیا مگر عریشہ نے تلخی سے بات
کاٹ دی۔

”ہاں! اپنے مقصد اور فائدے کے لیے۔“

”چلو اپوں ہی سہی۔۔۔ اب تو اتنا بڑا مکان اور
دکانیں رکھ کر کیا کرے گی؟ تیرے کون سے استے
خرچے ہیں۔ سائن کروے۔ مریم کی شادی بھی کرنی
ہے اور۔۔۔“

”میں نے آپ کے سارے کام سنوارنے کا ٹھیکہ
لے رکھا ہے۔“ عریشہ بھڑک گئی۔ ”کبھی فاطمہ کی شادی
ہے، کبھی مریم کی۔ آپ جیسے لالچی اور خود غرض لوگ
میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ میں اور میری ماں آپ کو
بہت کچھ دے چکے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں۔۔۔
آپ لوگ چلے جائیں۔ ورنہ میں چیخ چیخ کر سارا محلہ
اکٹھا کر لوں گی۔“

”عرشی! میری بات۔۔۔“ حمید نے کچھ کہنا چاہا مگر

نجانے اس میں اتنی بے خوفی کہاں سے آئی کہ وہ پورے مقابلے پر اتر آئی تھی اور یہی چیز نعمان کو پاگل بنانے لگی۔ ظلم و تشدد کا دورانیہ نجانے کتنا طویل ہوتا کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر ابرار اندر آ گیا۔ عریشہ اور نعمان کی آواز دو بار بار بھی سنائی دی تھی تب ہی وہ بغیر سوچے بچھے پرانی آگ میں کود پڑا تھا۔

”تو ہونا کون ہے ہمارے گھر کے معاملے میں بولنے والا؟“ نعمان اس پر پل بڑا۔

”گھر کا معاملہ تھا تو آوازیں باہر کیوں گئیں؟ شکر کریں کہ میں آیا ہوں، ساتھ میں پولیس کو نہیں لایا۔“

”تیری یہ اوقات کہ مجھے پولیس کی دھمکی دے دی؟“

”اوقات تو آپ نے دکھائی ہے۔ جائیداد کے لیے مرحوم چچا کی بیٹی پر ظلم کرتے ہو۔“

”بیچہ گری عریشہ نے سر اٹھا کر مددگار فرشتے کو دیکھنا چاہا مگر آنکھیں دھندلا گئیں۔

اب وہ دونوں دست و گریبان تھے۔

ابرار نے بڑے زور سے نعمان کو دھکا دیا۔ وہ جا کر دیوار سے ٹکرایا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ پلٹ کر عریشہ کو اٹھانے لگا۔

”ڈوبتے ڈوبتے کا سہارا کے مصداق عریشہ نے اس کا بازو بوجھ لیا۔

اور وہی لمحہ تھا جب بیرونی دروازہ ٹھہا کی آواز کے ساتھ کھلا اور محلے کے چند لوگ اندر گھستے چلے آئے۔

حمیدہ ان میں سب سے آگے تھیں۔

”لو۔ دیکھ لو۔ اپنی آنکھوں سے اس کے کروت۔ یہاں یہ گل کھلائے جا رہے ہیں۔ نعمان کی جگہ کوئی اور غیر مند ہوتا؟ بھی یہی کچھ کرتا۔“

چند لمحوں کے حمیدہ کی بات کو سمجھنے میں۔

ابرار کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور عریشہ بے جان گڑیا کی طرح زمین بوس ہو گئی۔

”دونوں کو زمین میں زندہ گاڑ دوں گا۔“

غیرت نہیں ہوں۔ مرحوم چچا کی عزت کو مجھے ملانے ڈرا حیانہ آئی۔

”ہائے۔ ہائے۔ لیاں باپ سر پر نہ ہوں تو ان کی یوں عزت نیلام کرنے لگتی ہیں۔“ حمیدہ سینہ دھڑک رہی تھیں۔

عریشہ نے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولا اور اس نفرت بھری نگاہ نعمان اور حمیدہ پر ڈالی۔ ہرگز رونا کی لوگوں کا کچھ نیاروپ سامنے لا رہا تھا۔

عریشہ نے نفرت سے زمین پر ٹھوک دیا۔

”دیکھا۔ دیکھا اس کی اکثر۔“ نعمان کی ٹھوکر نے عریشہ کا جگر ہلا دیا۔

بے ہوشی کے آخری لمحوں میں اس نے سب کے عقب میں جھانکتے اس چہرے کو بھی دیکھا جسے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔

اس چہرے پر بھی عریشہ کے لیے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

اگلے پل عریشہ نے خود کو طویل اندھیروں کے چہرے کر دیا تھا۔

”میں نے کہا بھی تھا۔ ہاتھ ہولار کھنا۔ رو تو بٹھنے میں جلاؤں گیاتھا۔“ حمیدہ نے دو ہنر نعمان کے بارے تو وہ جھنجھلا کر ہڑا ہو گیا۔

”بس کرو اماں۔ تم بھی تو ساتھ ہی تھیں۔ بلکہ سارا پلان تمہارا ہی تھا۔ خود ہی کہہ رہی تھیں کہ تم سے وہ جھٹکا بھر لڑی ڈرائی نہیں جاتی۔ میں تو صرف ڈرا دھکا کر سائن کروانا چاہتا تھا۔ تم نے پکڑ کر اس پر الزام ہی دھر دیا۔“

”اوسے میں نے کب؟“ حمیدہ کے ہاتھوں کے تو نے برکت حسین کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر اڑا گئے۔

”تو یہ سارا کچھ تیری شہ پر ہوا ہے۔ بے غیرت عورت! یہ بھی بھول گئی کہ تیرے اپنے گھر میں وہ بیٹیاں ہیں۔ اب جو عریشہ کے غصے میں نبیلہ نے قاتل

کر کے نکال دیا تو؟“

برکت حسین کو حقیقی غصہ آیا تھا۔ حمیدہ زندگی میں پہلا بار گھبراہٹ میں حواس باختہ تو نعمان بھی ہو گیا تھا۔ محلے میں الگ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ پھر نبیلہ کے رد عمل کا خطرہ بھی تھا۔

”ارے! انہیں نکالتے فاطمہ کو۔ کیوں دہلائے دیتے ہو؟“

”بے شرم۔ بے غیرت لوگ۔ میری بیٹی پر الزام دھرتے حیانہ آئی؟؟“

”تو زندہ تھا۔ ایسی سچ حرکت۔“

”بس کرو برکت حسین۔ پہلے تو یتیم بھتیجی کا خیال نہ آیا۔“

”یہ تو ہے ہی شاطر عورت۔ اور تو تو کسی ٹرین کے نیچے آکر مر بھی جائے مجھے تب بھی افسوس نہ ہو۔“

”ہائے! اللہ نہ کرے۔“ حمیدہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

”اپنی اولاد کی دفعہ بہت دکھ ہوتا ہے اور اس لڑکی کو جو جیتے جی مار ڈالا۔“

”کچھ نہ کچھ دیکھا تھا تب ہی کہا تھا۔“ حمیدہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

”بس کرو حمیدہ! خود پر اور اپنی اولاد پر رحم کر۔ اپنا کیا ہی آگے آتا ہے۔ عریشہ بھتیجی تھی تو وہ لڑکا بھی میری نظروں کے سامنے ہی رہتا تھا۔“

نعمان جھنجھلا کر باہر نکل گیا۔ اسے احساس ہوا ان کے پیچھے لگ کر معاملہ بالکل ہی اُلٹے رخ پر چلا گیا ہے۔

برکت حسین سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ انہیں زندگی میں پہلی بار لگا کہ ان کے گھر میں کچھ غلط ہو رہا ہے۔ ورنہ وہ تو سب کچھ حمیدہ کے ہاتھ میں دے کر بے فکر بیٹھے تھے۔

ابرار نے ہلکا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو عریشہ کے پاس بیٹھی نبیلہ نے مڑ کر دیکھا، پھر ابرار کو چپ کا اشارہ کیا۔ ابرار دروازہ بند کر کے کوریڈور میں آکھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں نبیلہ اس کے پاس تھیں۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ ابرار نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔ دوا کے زیر اثر سو رہی ہے۔“

”فاطمہ آپ نے کھانا بھجوا دیا ہے۔“

”ابرار! وہاں کیا ہوا تھا؟“

”پتا نہیں خالہ! میں دیر سے پوچھا۔“ وہ نظریں چرا گیا۔

”عریشہ پر ہاتھ کس نے اٹھایا؟“ وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ رخ ہی بدل گیا۔

”ابرار! مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ کھل کر بتاؤ۔“ نبیلہ کے لہجے میں سختی ہی در آئی۔

”خالہ! عریشہ ہوش میں آئے گی تو خود ہی بتا دے گی۔ میں گاڑی سے سلمان نکال لوں۔“

”یہ بھی شکر ہے کہ محسن شہرے باہر ہے۔ ورنہ جذباتی ہو کر نجانے کیا کر بیٹھتا۔“ وہ بڑبڑا میں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

فائرہ اختار کے 4 خوبصورت ناول

آئینوں کا شہر	قیمت - 500/- روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت - 500/- روپے
یہ گلیاں یہ چو بارے	قیمت - 300/- روپے
بھلاؤ دے رنگ ہزار	قیمت - 250/- روپے

ناول منکوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

منکوانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

ابرار نظر انداز کر کے چلا گیا۔ محسن کی گاڑی اسی کے پاس تھی کچھ دوستوں کی مہربانی سے وہ ڈرائیونگ بھی سیکھ چکا تھا۔
نبیلہ اندر آگئیں۔ عریشہ کسمپرسی تھی۔
وہ لپک کر قریب آئیں اور پیار سے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”عرشی! میری جان! اب کیسی طبیعت ہے؟“
”ای! ای!“

”عرشی! ادھر دیکھو، میں ہوں تمہاری پھوپھو۔“
وہ اس کے گل تھتھانے لگیں۔
”میری ای! پھوپھو۔ میری ای مرگئیں۔ میں نے انہیں مار ڈالا۔“ وہ چلانے لگی۔ اسے خود بھی یاد نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اسے صرف ماں یاد آرہی تھی۔

اسے یہ یاد آ رہا تھا کہ ان لوگوں کے لیے اس نے اپنی ماں کے ساتھ کیا کیا۔
اسے یہ احساس مار رہا تھا کہ ماں نے کس کس طرح اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ اپنی نادانی میں سمجھ ہی نہ پائی۔

اسے دکھ حمیدہ کے رویے پر تھا، نہ نعمان کے سلوک پر۔

اسے تو ثوبان کی بے بسی، دھوکے بازی، خود غرضی کسی سے بھی غرض نہ رہی تھی۔

بس اک دکھ پشیمانی، بہت کچھ ختم ہو جانے اور اپنی جنت کھودینے کا احساس ہر جذبے پر حاوی تھا۔

نبیلہ نے اسے خود میں سمیٹ لیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی عریشہ کو اس احساس زیاں سے نکال نہیں سکتی تھیں۔

کچھ دنوں میں وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو گئی۔
وجود کے زخم بھر گئے، مگر روح کے زخم نامور بننے جا رہے تھے۔

”عریشہ! اوور لے لو۔“ فاطمہ کی آواز پر کھڑکی سے باہر جھانکتی عریشہ نے چونک کر دیکھا، مگر ہاتھ نہیں بڑھایا۔

فاطمہ نے گلاس میز پر رکھا اور خود بھی بیٹھ گئی۔
”کل محسن واپس آ رہے ہیں۔“ فاطمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

عریشہ! میں جانتی ہوں، گھر والوں نے تمہارے ساتھ بہت براسلوک کیا ہے۔ میں اس سب کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ عین جانو! میں نے سب سے رابطہ ختم کر لیا ہے۔ کسی سے نہیں ملتی۔“

عریشہ نے الجھ کر اسے دیکھا۔ فاطمہ یہ سب اس سے کیوں کہہ رہی ہے۔ نبیلہ یا عریشہ نے تو اسے اس کے گھر والوں سے ملنے سے منع نہیں کیا تھا۔

”میری اچھی بہن پلین۔ تم محسن سے کچھ مت کہنا، وہ تمہارے معاملے میں بہت پی پی ہیں۔ عریشہ! سن رہی ہو۔ میرا گھر خراب ہو جائے گا۔“ فاطمہ رو ہانسی ہو گئی۔

”نہیں کہوں گی۔“ عریشہ نے تین لفظوں میں بات ختم کر دی۔

فاطمہ کچھ اور شرمندہ ہو گئی۔ اس نے بے اختیار عریشہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم بہت اچھی ہو۔ پلین! جو کچھ ہوا۔“
عریشہ نے ہاتھ چھڑا لیا۔ تب ہی نبیلہ آگئیں۔

”تم نے ابھی تک وہ نہ نہیں پایا؟“
”وہی تو اصرار کر رہی ہوں، مگر یہ مان ہی نہیں رہی۔“

فاطمہ نے گہرا کر گلاس اٹھایا۔
”عریشہ! نبیلہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔“

”تم ہی تم صدم کیوں پیشی ہو۔ کچھ بولا کرو۔“
”کیا بولوں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔“
عریشہ نے حیران کن نظروں سے انہیں دیکھا۔

ابھی تو اس کی چونٹوں کے نشان بھی مندل نہ ہوئے تھے۔
”جو الزام ان لوگوں نے مجھ پر لگایا ہے۔ پھوپھو!

نجانے کس کس نے اعتبار کیا ہو گا۔“
”عرشی! لوگ اندھے نہیں ہیں۔“

”کسی کی پارسل پر حرف آئے تو سب پتھر مارے۔“

واپس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جج جھوٹ کی کھوج کون کرتا ہے۔“

فاطمہ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ اپنے گھر والوں سے بہت کی توقع رکھتی تھی سوائے اس ایک کے۔
”کیا کوئی اتنا سفاک اور بے حس ہو سکتا ہے؟“

میں نے ان کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ اپنی ماں کو بھڑایا۔ وہ میری وجہ سے مر گئیں۔ صرف اس لیے کہ میں نے ان کی نسبت ان لوگوں کو اپنا سمجھا۔ میں کیوں نہیں پہچان سکی۔ ہر دن ان کے چروں سے نیا

قلب نوج لیتا ہے اور میں بکا بکا رہ جاتی ہوں۔ یہ کسے خوں رشتے ہیں، جنہوں نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میرا مان، اعتبار، میری جنت۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں خالی ہوں۔ میرا دل خالی ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ انہیں میری دکانیں اور مکان چاہیے۔

سب لے لیں۔ سب کچھ لے لیں، بس! میری ای! واپس لو لادیں۔ میرا اعتبار، میرا گھر، سالوٹا دیں۔“

وہ جنونی انداز میں رونے اور چلانے لگی۔
فاطمہ نے گہرا کر گلاس رکھا اور روتے ہوئے باہر نکل گئی۔

نبیلہ نے اسے خود میں بھینچ لیا۔ یہاں تک کہ وہ روتے چلائے نہ ڈھال، ہو کر بستر پر گر سی گئی۔



ثوبان اپنے کمرے میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے کھومتے، نظریں جمائے ہوئے چٹ لینا تھا۔ ذہن میں خیالات کی رفتار بچکے کی رفتار سے بھی زیادہ تیز تھی۔

سنیہہ ابھی تک امریکا سے نہیں لوٹی تھی۔ اور ہر گز راتوں اس کے حوصلے پست کر رہا تھا۔ اس تمام

مرحے میں اس نے ایک بار بھی عریشہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ہی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں اس کی بے لطف نگاہیں

لب بھی بے سکونی پھیلا تھیں۔ لیکن وہ دانستہ اس

احساس ندامت سے نظریں چرائے صرف سنیہہ اور اس سے وابستہ اپنے روشن مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا۔

”شاید مجھ سے غلطی ہوئی، مجھے اسی وقت سنیہہ کے پروپونل پر ہاں کہہ دینی چاہیے تھی۔ آخر اتنی انا دکھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کاش! وقت پلٹ جائے اور میں اس بل کو مٹھی میں جکڑ لوں۔ قسمت کی دیوی کو قید کر لوں یا خود اس کا غلام ہو جاؤں۔“

اس کے عین نیچے والے کمرے میں نعمان بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

”یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اتنا غصہ اتنی جذباتیت۔؟ اماں کی باتوں میں اگر میں نے بہت ہی غلط قدم اٹھایا۔ اس طرح تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ پھوپھو اور محسن اب کبھی یہ دکانیں میرے نام نہیں ہونے دیں گے۔ عریشہ کی شادی ثوبان سے ہو جاتی، تب بھی دکانیں کھر میں ہی رہتی تھیں۔ پھر وہ اس سے محبت بھی تو کرتی تھی۔“

”محبت؟“ وہ اس لفظ پر اٹک سا گیا۔
”اسی محبت کے چھن جانے نے مجھے اتنا انتقامی بنا دیا کہ میں۔“

وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے عائنہ بے حد شدت سے یاد آئی۔

”اگر مجھے عائنہ مل جاتی تو کیا میں تب بھی یہ سب کرتا۔؟“

اس نے اپنے ہی سوال کے اندر سے اٹھتے جواب پر غور کیا۔ اس کے اندر آتش فشاں اٹھنے لگا۔

”ہاں! اٹھیک ہے، جب میرا دل ویران ہو چکا۔ تو کسی کا کیوں آباد ہو۔ یہی سب ہونا چاہیے تھا۔“

وہ اپنے اندر کے غصے پر قابو پا ناگھر سے ہی نکل گیا۔



”کب تک اپنے ہوتے سوتے کو روتی رہے گی؟“
حمیدہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

مرحوم نے آنکھوں سے بازو مارا انہیں دیکھا۔

حشا

بہنوں کا اپنا ہاتھ
لاہور

جولائی 2012 کا شمار شائع ہو گیا ہے

جولائی 2012 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ اداکار ”میاں مرغوب احمد ہمدانی“

سے کاشف گورچیک کی ملاقات،

☆ ”خواہشوں کا موسم“ **ہما عامر** کا مکمل ناول،

☆ ”احساس وفا“ **قرۃ العین رائے** کا مکمل ناول،

☆ ”ستم گزیدہ“ **سدرہ سحر عمران** کا مکمل ناول،

☆ ”سچ کی سبولی“ **سندس جبین** کا مکمل ناول،

☆ ”مجھ پر یقین رکھنا“ **نازیہ مغل** کا ناول،

☆ اس کے علاوہ **حمین اختر، ہمارا، شائستہ ساجد، بشر ناز،**

کنول ریاض اور خدیجہ فضل کے افسانے،

☆ ”وہ ستارہ صبح اُمید کا“ **فوزیہ غزل** کا

سلسلے دار ناول،

☆ ”تم ہی آخری جزیرہ ہو“ **ام مریم** کا

سلسلے دار ناول،

☆

☆

بیارے نئی عکاسی کی باتیں، انشاء نامہ، انٹرویو اور شوہر کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ کتاب کے سبب مستقل سلسلے شامل ہیں

جولائی 2012ء

کا شمار آج ہی ہے فریق یک اس سال سے طلب کریں

”ہاں کرلوں گی جا کر؟“ عریشہ کے لمبے میں تلخی سمٹ
تلخی جا کر کیا کرے گی؟“ وہ مسکرایا۔ عریشہ کو اس کی
سکراہٹ نہ ہر گز۔

”آپ کا فائل ایئر ہے۔“
”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اب کس کے لیے
پہنا ہے۔ کون ہے جو میری کامیابیوں کا شکر ہو گا؟“
”بے زاری سے بولی۔“ ”زندگی تو یوں بھی گزر رہی
جائے گی۔“

”تھک کہا آپ نے؟“ زندگی تو یوں بھی گزر جائے گی۔“
اس نے فوراً اتفاق کیا۔ ”لوگ تو خواہنا خواہ اتنی
اسٹرنگ میں لگے ہیں۔ حالانکہ زندگی تو ایک کرسی پر
بیٹھ کر بھی گزر جائے گی۔“
”تم۔۔۔“ عریشہ نے جھنجھلا کر کچھ کہنا چاہا۔ ابرار
نے سنجیدگی سے بات قطع کی۔

”عریشہ بی بی! زندگی کی علامت آپ رول ہے
ایک جگہ ٹھہرنا تعفن، گدلا پانی نہیں۔ لوگ بھی
آپ رول کی رولائی دیکھتے ہیں۔ ٹھہرے پانیوں کا تعفن
سو گھٹنے نہیں بیٹھ جاتے۔ اب آپ کو کئے کرنا ہے کہ
آپ خود کو کس مقام پر رکھتی ہیں۔“
عریشہ کچھ لمحے بول ہی نہیں سکی۔ وہ اس کے
ساتنے بڑی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ جما کر جھکا۔
”ابھی تک ٹوبان کو بھولی نہیں؟“

ایک غیر متوقع سوال۔ عریشہ تڑپ کر رہ گئی۔
”میں اسے اپنی نفرت کے قاتل بھی نہیں سمجھتی۔“

”ویری گنڈ۔“ اس نے کرسی پر ہاتھ مارا۔
”تو پھر یوں جوگ لے کر اس کی ٹوکسین کا سامان
کیوں بناری ہو؟“ اس نے جہیں چپٹ کیا۔ تمہاری
محبت کا مذاق بنایا۔ گھر والوں نے تمہارے کردار پر کچھ
اچھا اور تم منہ چھپا کر بیٹھ گئیں۔ کم آن عریشہ! بیرو
بنو۔ ثابت کرو کہ تم اتنی گزور نہیں ہو کہ لوگ یوں
تمہیں ریگید کر گزر جائیں۔ اس خود ترسی سے نکلو۔
خود کو اس مقام تک لے جاؤ کہ یہ لوگ تمہیں کھونے

کھڑی ہو کر میری بیٹی پر الزام لگا رہی ہیں؟“
ہوش میں آکر غصے سے بولیں۔
”میں نہیں لگا رہی۔ اس کے عاشق کا خون کیا
اگر لڑکی راضی نہیں۔ تو کیوں زبردستی لے جا رہا
ہوں۔ اس نے صاف کہا ہے کہ یہ لڑکی اس سے
کرتی ہے۔ زبردستی ہوئی تو پھر سے بھاگ جائے گی۔
حمیدہ دل پر ہاتھ رکھے کرسی پر ڈھے گئیں۔
مریم خود بھی حق پر رہ گئی تھی۔
خاتون اچھی طرح برس کے اور انگوٹھی منہ پر لٹا کر
چلی گئیں۔
مریم نے نظریں اٹھا کر کہاں کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا
وہ چپل لے کر اس پر ٹوٹ پڑیں گی، مگر وہ اپنی جگہ
ساکت و صامت بیٹھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

فضائیں ڈھلتی سہ پہر کی اداسی تھی، آسم کے درخت
پر پتوں میں چھپی کوئل دھیرے دھیرے کوک رہی
تھی۔ عریشہ نے پورے لان پر بے تو جی سے نگاہ
ڈرائی۔ وہ کب سے بیرونی کوریڈور میں کرسی پر بیٹھی
تھی۔ ذہن مختلف سوچوں کی آگاہ جگہ بنا تھا، مگر کسی
ایک نقطہ پر جتنا تھکا ہوا بنیلا اسے دو تین بار کہہ کر
تھیں۔ مگر وہاں سے اٹھنے پر آمادہ نہ تھی۔ آخر تک
کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اندر چلی گئیں۔ ابرار
نے اسے گٹ سے ہی دیکھ لیا تھا مگر اس کے برتنے
میں قدم رکھنے تک عریشہ متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ
ہولے سے کھنکارا۔

”السلام علیکم! عریشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
کچھ لمحے غائب دماغی سے دیکھنے کے بعد سر جھکا لیا۔
”طبیعت کیسی ہے؟“ ابرار نے نرمی سے پوچھا۔
”اچھی ہے۔“ آواز اتنی مدھم تھی کہ ابرار کو
صرف اندازہ ہوا کہ جواب آیا ہے۔
”یونیورسٹی کب سے جاری ہیں؟“
”یونیورسٹی؟“ وہ مگر ٹکرا ہوا کی شکل دیکھنے لگی۔
”میں جا رہی ہوں؟“ ابرار کو اندازہ ہوا۔

”جب تک مجھے اس کمرے میں بند رکھیں گی۔“
”مجھے کوئی شوق نہیں تیرے جیسی اولاد کو گھر میں
رکھ کے گنڈا لے گا۔“

”تو کدیں رخصت۔۔۔ جان چھڑا لیں اس گندے۔“
وہ بد لحاظی سے گویا ہوئی۔

”وی کرنے لگی ہوں۔۔۔ آئی بیٹھی ہے تمہاری
ساس۔ ابھی شادی کی بات کر کے دفع کرتی ہوں۔“
”ماں۔۔۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اب ایک لفظ نہ کہنا زبان کاٹ دوں گی۔ اب اٹھ
کر حلیہ ٹھیک کر اور چائے لے کر آ۔ تیرا پاپو ہوں بیٹھا
ہے۔ زیادہ آنا کالی کی تو نعمان کو بلا لوں گی۔“ حمیدہ
غضب ناک ہوئیں۔

”جس کو مرضی بلا لیں۔ میں چائے نہیں بنا رہی۔“
مریم ہٹ دھرمی سے بولی۔

”بے غیرت، کمینہ!“ حمیدہ ہاتھ تان کر اس کی
طرف لپکیں۔

”ہن جی۔۔۔!“ مریم کے عین سر پر جا کر انہیں
ساکت ہونا پڑا۔ پھر کھینکی سی ہنسی ہنسنے لگی۔

”وہ میں۔۔۔“
”ہاتھ نیچے کر لیجئے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
حمیدہ نے کھینک کر ہاتھ نیچے کیا۔

”ذرا صل اس کی طبیعت۔۔۔“
”جانتی ہوں اور یہ بھی پتا ہے کیوں خراب ہے۔“

ان کے لمحے میں طنز ہی طنز تھا۔ مریم نے بھی ابھ کر
انہیں دیکھا۔

”آپ بیٹھیں۔۔۔“
”میں بیٹھنے نہیں۔۔۔ صرف اتنا کہنے آئی ہوں کہ

اپنے گھر کا گندا اپنے گھر میں ہی سنبھال کر رکھیں۔“
”جی۔۔۔“ حمیدہ ہکا بکار رہ گئی۔

”میرے اپنے گھر میں بیٹیاں ہیں اور ایک مچھلی
سارے جل کو گندا کرتی ہے اور اس قسم کی لڑکیاں
پورے خاندان کو بدنام کرتی ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ
سے مریم کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کیا بولے جا رہی ہیں؟ میرے ہی گھر میں

حرف افسوس میں۔ اس طرح ہار کر بیٹھ جانے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ سوائے اس کے کہ لوگ تم پر نہیں گئے، تمہاری کمزوریوں کو اچھا نہیں گئے۔ اور عریشہ اتم کمزور نہیں ہو۔ وہ ہم لہجے میں سمجھاتا چلا گیا۔

عریشہ نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ لبوں پر جیسے منجمد ہو گئے۔

”سوری! میں شاید کچھ زیادہ بول گیا۔ لیکن میری باتوں پر غور ضرور کرنا۔ میں خالہ سے مل لوں۔“ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

عریشہ نے دھندلائی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھا۔

”کیا واقعی کچھ لوگوں کے چند لفظوں میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ حوصلہ ہارے لوگوں کو پھر سے کھڑا کر دیں۔“

عریشہ کو واقعی لگا کہ وہ اسے دھیرے سے کھڑا کر گیا ہے۔

ثوبان نے اپنے سامنے بیٹھی سنیعہ کو پر شوق نگاہوں سے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت اور چار منگ ہو گئی تھی۔ رتھ ٹورنٹ کی نیم تاریک فضا میں وہ ہیرے کی طرح دکھ رہی تھی۔

”اور سناؤ! کیا ہوتا رہا؟“ سنیعہ نے بے حد نزاکت سے اپنے لب نشو سے صاف کیے۔

”وہی روٹن ورک۔“ ثوبان نے جوس کا گھونٹ بھرا۔

”شادی کر لی۔؟ وہ تمہاری کزن۔ کیا نام تھا؟“

”عریشہ۔“ ثوبان نے دم لہجے میں بتایا۔

”ہاں! عریشہ۔ کیسی ہے؟ اب تو بچہ و بچہ بن گئی ہو گی۔“

”پتا نہیں۔“ ثوبان نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کیا مطلب پتا نہیں؟ وہ تم لوگوں کے ساتھ ہی تو

رہتی تھی۔“ سنیعہ نے حیرت سے پوچھا۔

”اب نہیں رہتی۔“ ثوبان نے مختصراً کہا۔

از جلد اس موضوع سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ الجھ گئی۔

”سنیعہ! ہم یہاں عریشہ کو ڈسکس کرنے بیٹھے ہیں۔“ وہ بے حد آکٹا ہٹ سے بولا۔

وہ اس سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ کیسے اس نے پل سنیعہ کے لوٹنے کا انتظار کیا تھا۔ اور یہ کہ وہ اس نیلے ٹاپ اور سفید ٹراؤزر میں کتنی یک اور خوب صورت لگ رہی ہے۔ حالانکہ سنیعہ کو خود بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا۔

سنیعہ نے غور ثوبان کو دیکھا اور مسکرا دی۔

”آف کورس! ناٹ۔“

”تم نے اتنا عرصہ کیوں لگا دیا۔ جبکہ گئی تو صرف وہاں کے لیے تھیں۔“

”وہاں سے واپسی کا دل کہاں چاہتا ہے۔ اب بھی سمجھو! یہاں کے کچھ ادھورے کام وائز اپ کرنے آئی ہوں۔“ سنیعہ نے مینیو کارڈ اٹھاتے لاپرواہی سے کہا۔

ثوبان نے اسے رشک سے دیکھا۔ وہ جس دن سے پاکستان آئی تھی۔ ثوبان اس سے ملنے کے لیے مسلسل رابطہ کر رہا تھا۔ بس سنیعہ کے پاس ہی وقت نہیں تھا۔ آج بھی بڑی مشکلوں سے بچ کے لیے آلاہ ہوئی تھی۔ ثوبان آج دل لگا کر تیار ہوا تھا۔ خوشی سے قدم زمین پر نہیں ٹھہر رہے تھے۔ آج وہ اپنی زندگی کا بہت اہم فیصلہ کرنے جا رہا تھا۔ ایسا فیصلہ جس کے بعد وہ

لبوں میں آسمان چھونے کو تیار تھا۔

”بس اماں! دیکھنا اب تیرے بیٹے کے دن پھر نے والے ہیں۔“ اس نے خود بڑھیر سارا رنوم چھڑکتے ہوئے ماں سے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسی سرشاری تھی کہ نعمان بھی ٹھٹھک کر رہ گیا اور طعنے سے کہنے لگا۔

”کیوں تمہاری لاٹری ٹکٹ والی ہے؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ ثوبان نے ہنسنے لگایا، پھر مصنوعی حیرت سے نعمان کو دیکھا۔

”مگر بھائی جان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟“

”ہاں! اجا کر عریشہ کی منتیں کریں۔ ورنہ ایسا نہ ہو جس دن میں میں لاکھ کی گاڑی میں بیٹھوں۔ آپ سڑک پر آجائیں۔“ نعمان اس کا گریبان پکڑنے کو تیار تھا مگر

ہند چل میں آگئیں۔

سنیعہ نے مختصراً آڑو دیا۔

”بس۔؟“ ثوبان نے حیرت سے پوچھا۔ ورنہ وہ

بٹ خاخواہ ڈشٹر منکواتی جاتی خواہ بعد میں چھکنے کی بات بھی نہ آئے۔

”ہاں! سنی! تمہاری جیب کا خیال بھی تو کرتا ہے۔“

آخر یہ سنی! تمہاری طرف سے ہے۔“ وہ ہنسی۔

ثوبان کو ایک ہی بل میں اپنی اوقات یاد آگئی۔ وہ

پچکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

”تم چینیج ہو گئے ہو یا مجھے لگ رہا ہے؟“ وہ اب

فرصت سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”نہیں تو ویسے کاویا ہوں۔“

”اب تمہیں شادی کرنی چاہیے۔“ کس بات کا

انتظار ہے؟ وہ اپنی انگلی میں بڑی انگلی تھما رہی تھی۔

”تمہارا۔“ ثوبان نے اس پل کو گزرنے نہیں دیا۔ فوراً پکڑ لیا۔

سنیعہ اس کے انداز پر ٹھٹھکی پھر لاپرواہی سے کندھے اچکا کر بولی۔

”تو جلدی کرو۔ میں تو یہاں صرف ایک ماہ کے لیے ہوں۔ اس کے بعد جازب کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو جاؤں گی۔“

احساس ہوا۔ لائف پارٹنر ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ آپ پر رشک کریں تاکہ ترس کھائیں۔ انسان کی حیثیت شادی کے بعد کچھ اور بلند ہو۔ آپ اپنے اسٹیپ سے کئی اسٹیپ اوپر چلے جائیں۔ یہ نہیں کہ خود نیچے اترا پڑے۔ اور ثوبان! تمہارا گل ٹھیک تھے۔

تمہارے لیے وہی لڑکی مناسب ہے۔ عریشہ ساری زندگی تم سے محبت بھی کرے گی اور خدمت بھی۔

اس نے شرارتی انداز میں لفظ خدمت ادا کیا۔ ”تم دونوں ایک جیسے ہو۔ تمہارا انٹینس، لائف اسٹائل میرے ساتھ بھی مینج نہیں کر پاتے۔ ویسے بھی تم نے انکار کر دیا تھا تو مجھے نہیں تو شادی کرنا ہی تھی۔“

وہ کھکھلا کر ہنسنے ہوئے اپنے بال ٹھیک کرنے لگی۔ اس کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ دک رہی تھی۔

لیکن ثوبان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ کچھ لمحوں پہلے وہ آسمان پر تھا اور اب قدموں تلے

زمین بھی نہ تھی۔

ویٹر کھانا چنے لگا۔

ثوبان نے اپنی پچی کچی ہمت مجتمع کی اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

سنیعہ اس کی حرکت کو اپنی توہین سمجھتی، مگر ثوبان کی کیفیت سمجھ نہ رہی ہوئی۔

اس نے اطمینان سے نہیکنی بچھایا اور کھانا کھانے لگی۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ یہ لڑکی کوئی نہ کوئی گل کھلائے گی۔ اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں اماں! بس تم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔“ بانو کی پاٹ دار آواز پورے صحن میں گونج رہی تھی۔

”اچھی تک تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ پر تو ایسا کر لاؤڈ اسپیکر لے کر پورے محلے میں شکر کر آ۔ آہستہ آواز

میں بات نہیں کر سکتی؟“ حمید نے جل بھن کر کہا۔

”مفتی ٹولی ہے۔ خبر تو پھیلے گی۔ ایسی باتیں چھپی تھوڑی رہتی ہیں۔ یوں، یوں۔“ چٹکی بجاتے

”وہ میرا جذباتی پن تھا۔“ سنیعہ نے ازلی اطمینان سے بات کا آغاز کیا۔ ”لیکن وہاں اپنے کزن سے مل کر

ہوئے ”پھیلتی ہے۔“

لگ ہی نہیں رہا تھا کہ ان کی بیٹی ان کا دکھ بانٹنے آئی ہے۔ وہ تو کسی گنتی کی محلے والی کی طرح چپکے لے رہی تھی۔ حمیدہ بد مزہ ہو گئیں۔

”کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا“ اسے کہاں دفع کروں۔۔۔ اور نعمان کتنا ہے ہفتے کے اندر اندر رخصت کرو۔ ورنہ گلا خوںٹ کر مار دوں گا۔“ حمیدہ بچ مچ پریشان تھیں۔

”تو اسی کو بلا لو۔۔۔ ساتھ میں دفع کرو۔۔۔ ایویں کیوں پریشان ہوتی ہو اماں۔۔۔ جب لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔“ بانو نے مزے سے مشورہ دیا۔

”نعمان نے اسے نہ دیکھا ہوتا تو بہانے سے بلواتی، اب سامنے آیا تو نعمان نے دونوں کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔“

”ہے کہاں؟“ بانو نے تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”دکان پر ہو گا۔“

”مریم کا پوچھ رہی ہوں۔“

”کمرے میں ہی ہو گی۔“

”ویسے ایک بات کہوں۔“ بانو نے رک کر کہاں کو دیکھا۔

”تب سے باتیں ہی کیے جا رہی ہے۔ آگے بول۔۔۔“ حمیدہ بے زار ہوئیں۔

”اکرم کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔“ بانو نے اپنے دیور کا نام لیا۔

”ہیں۔“ حمیدہ جو ڈھیلی ڈھالی بیٹھی تھیں غورا ”چو کنہا ہوئیں۔“ اب وہ مان جائے گا؟

”کیوں نہیں مانے گا۔ لالچ ہی ایسا دوں گی۔“

”کیسا لالچ؟ ہمارے پاس کون سی زمین جائیداد ہے جو مریم کے نام لگا دوں گی۔“

”سیدھی سی بات ہے۔ مریم کا رشتہ اب کہیں اور نہیں ہونے والا۔ جنہوں نے مفتی توڑی ہے وہ چپ نہیں رہیں گے۔ ہر جگہ مفتی ٹوٹنے کی وجہ دوسے ضرب لگا کر دیں گے۔ اور ایسی باتیں جنگل کی آگ

کی طرح پھیلتی ہیں۔ بدنامی تو ہو گی۔ ان حالات میں اکرم سے اچھا رشتہ مریم کے لیے نہیں ملے گا۔ بس اتنا کرو کہ نعمان کے لیے میری منہ کا رشتہ لے لو۔“ حمیدہ حق دتی رہ گئیں۔

”تو بڑی چالاک ہے بانو۔“

”میری منہ اتنی بھی بری نہیں۔“ ایف اے پاس ہے۔ سلائی کر رہا لی میں ماہر ہے اور تجھے کیا چاہیے اماں! دونوں ایک گھر میں نمٹ جائیں گے۔“

”سمجھانے والے انداز میں بولی۔“

”لیکن اگر اس کے ہوتے سوتے نے پھر فون کر دیا تو۔۔۔؟“ حمیدہ متعذب تھیں۔

”اماں! تو اکرم کو کیا سمجھتی ہے۔ سارا محلہ اسے اکرم بد۔۔۔“ بانو نے ”بد معاش“ کہتے کہتے زبان دانتوں تلے دالی۔ ”فون کرنے والے کی کچی موڑ دے گا۔۔۔ میں پہلے ہی اس کے کان میں یہ بات ڈال دوں گی کہ کوئی آوارہ لنگھا ہماری مریم کو تنگ کر رہا ہے۔ اسی لیے تو جلدی جلدی شادی کرنا پڑی۔“

”بانو! تو بچ بڑی چالاک ہے۔“ حمیدہ کانوں کان راضی ہو گئی۔

”اماں! آخر تیری بیٹی ہوں۔“ بانو نے خود ہی اپنے کندھے پر تھپکی دی۔

”پر اماں! تجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ مریم کا اس لڑکے کے ساتھ رابطہ کیسے ہو رہا ہے؟“

”لو۔۔۔ رابطہ کیسے ہو گا؟ عزت کے ذریعے اس کی نوکری چھڑا کر گھر بٹھالیا۔ سارا دن کمرے میں بند رہتی ہے۔“

”نہ اماں! ایسے کام بغیر بطوں کے نہیں ہوتے۔“ بانو نے پرسوج انداز میں سر ہلایا۔ ”کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ہے۔“

”کیا ذریعہ ہو گا؟ عریضہ ہوتی تو میں سمجھتی اس کے ذریعے رابطہ ہے۔ وہ بھی دفع ہوئی۔ ابراہیم چلا گیا۔۔۔ یہاں نہ کوئی آئے، نہ جائے۔ میں اور تمہارا باپ سارا دن گھر ہی ہوتے ہیں۔“

”چھا۔“ بانو سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔

”تو نے واپس جانا ہے؟“ حمیدہ نے پوچھا۔
 ”نہیں! رات رکوں گی۔“
 ”بچے ساتھ نہیں آئے۔۔۔؟“
 ”رہ گئیں کے دادی کے پاس۔۔۔ کون سا چھوٹے ہیں۔“
 بانو نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا۔
 ”اچھا۔۔۔ میں ہانڈی پڑھاؤں۔“
 ”ہاں اور اماں! نعمان سے بھی بات کر لیتا۔ یہ نہ ہو کہ عین وقت پر مکر جائے یہ روز روز کے تماشے اچھے نہیں۔“
 ”ہاں۔۔۔ ہاں کر لوں گی۔“
 تب ہی ثوبان اندر آیا۔ اور ان کی طرف دیکھے بغیر سیدھا بیڑھیاں چڑھ گیا۔
 ”نہ سلام نہ دعا۔۔۔ اس کا بوتھا کیوں سو جا ہوا ہے۔“
 بانو نے تیوری چڑھا کر کہا۔
 ”اللہ جانے! کیا تو بڑا خوش باش تھا۔“ حمیدہ بڑبڑائیں۔

فاطمہ، محسن اور نبیلہ کے سامنے ناشتے کے لوازمات چن رہی تھی۔
 ”عریشہ کو بھی بلالیا کرو۔۔۔“
 ”بہت زور دیتی ہوں، مگر وہ آتی ہی نہیں ہے۔۔۔ اسی لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔“ نبیلہ نے بتایا۔
 ”میں جب سے واپس آیا ہوں۔۔۔ اسے بہت گم صم اور اداس دیکھ رہا ہوں۔ بیونورٹی بھی نہیں جاتی۔“ محسن نے شکر انداز میں کہا تو فاطمہ نے گہرا کر نبیلہ کو دیکھا۔
 ”کبھی کبھی ڈپریشن میں آجاتی ہے۔۔۔ تو یوں ہی ہر چیز سے کٹ جاتی ہے۔“ انہوں نے نارمل انداز میں بتایا۔
 ”یہ تو اچھی بات نہیں۔۔۔ اسے کسی سائیکلائسٹ کو دکھائیں۔“
 ”دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے تھوڑا

وقت دو۔۔۔ سنبھل جائے گی۔“
 ”بہت برا سلوک کیا ہے ماموں لوگوں نے مجھ کے ساتھ۔۔۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے۔“ اس نے دے دے کر لہجے میں شدید غصہ تھا۔
 فاطمہ نے سر جھٹک لیا۔
 ”بس! جو ہو گیا۔ اسے بار بار دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ نبیلہ نے ہاتھ اٹھا کر محسن کو مزید کچھ بھی نہ سے روک دیا۔
 ”جی! آپ کے تو بھائی بھانوج ہیں۔ آپ کیوں کہتے ہیں۔“
 ”جو غلط ہے وہ غلط ہے، لیکن ناشتے کے وقت اس ٹاپک کو چھیڑنا ضروری ہے؟“
 نبیلہ کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی، جسے محسن کر کے محسن چپ کر گیا۔
 ”فاطمہ! ڈھنگ سے ناشتا کرو۔“
 نبیلہ کے کہنے پر محسن نے چونک کر فاطمہ کو دیکھا۔ وہ اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ اسے بھی احساس ہوا کہ اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔
 ”بس! عریشہ پر بہت ترس آتا ہے۔ اتنی سی عمر میں اتنے سارے دکھ دیکھ لیے، اس لیے کبھی کبھار جذباتی ہو جاتا ہوں۔“ یہ معذرت خواہانہ انداز بھینچا فاطمہ کے لیے تھا۔
 فاطمہ نے ہلکی سی نظر اٹھا کر محسن کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ لیکن دروازے میں کھڑی عریشہ ابھی محسن کے جملے پر انگی تھی۔
 ”تو کیا واقعی وہ اب اسی قابل ہے کہ لوگ اس پر ترس کھائیں؟“
 وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔
 ”لیں! نعمان بھی آگیا۔۔۔ اماں! اس سے بات کرلو تو میں آج ہی گھر بات کر سکتی ہوں۔“ بیونورٹی دروازے سے اندر آتے نعمان کو دیکھ کر بانو نے سر کو شی میں کہا۔
 ”کیسی ہو آپا۔۔۔“ نعمان قریب آگیا۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔“

”اماں! فون کر دیتیں۔ میں بچوں کے لیے کچھ پھل تلے آتا۔“
 ”بچے تو ساتھ آئے نہیں۔ رات ادھر ہی ہے جو مرضی ہے آتا۔“ حمیدہ نے کہا۔
 بانو ہانے سے اٹھ کر مریم کے کمرے میں آگئی۔
 ”مریم نہانے گئی تھی۔ بانو نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی مجلس طبیعت نے اسے بیٹھنے نہیں دیا۔ تب ہی وہ مریم کی الماری تپت کرتے لگی۔ ایک ایک کپڑا جھاڑ جھاڑ کے دیکھا۔ پھر نیچے بیٹھ کر جوٹوں والا خانہ بھی ٹھیل لیا اور جوٹے کے ڈبے میں اسے گھر مقصود مل گیا۔
 ”یہ کوئی بات ہے کرنے والی۔“ نعمان جھنجھلا گیا۔
 ”میں نے مجھے ساری بات کھول کر بتادی ہے۔۔۔ آگے اپنی مرضی دیکھ لے۔۔۔ میرا کچھ پر کوئی زور نہیں پر کیا کروں؟ پیٹ کی جتنی ہے۔۔۔ آخر کدھر دکھاؤں۔۔۔“
 ”میں نے کہا نا۔۔۔ جو بات تھی، تجھے بتادی۔۔۔ آگے تو مختار ہے۔“ حمیدہ اولاد کے ہاتھوں بے بس ہو چکی تھیں۔
 ”کیا تھا اماں! جو تو میری شادی عاشق سے ہو جانے لگی۔“ دل میں تیر کی طرح کڑا شکوہ زبان پر آہی گیا۔
 ”حمیدہ ہری طرح چونکیں۔
 ”میں۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟“
 ”نہیں! اچھی طرح پتا ہے اماں! ساری زندگی تو نے ہر اچھی چیز ثوبان کو دی اور میں نے خوشی خوشی دے بھی دی۔۔۔ بس! ایک میرے دل کی خوشی مجھے دے دیتیں۔۔۔ میں ساری زندگی احسان مند رہتا۔“ وہ انفس اور تلخی سے کتا چلا گیا۔
 ”میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔ پھر تو نے کون سا مجھے بتایا تھا کہ تو اس استانی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ خود ہی تو عریشہ کے پیچھے پر گیا تھا۔“ حمیدہ بوکھلائی۔
 ”ٹھیک کہا ساری غلطی تو میری ہی تھی، بہر حال۔۔۔ وہ کڑا ہوا۔“ یہ بے جوڑ شادی نہیں ہو سکتی۔
 ”لیکن مریم۔۔۔“

”جہنم میں جائے مریم۔ میں نے اس سارے خاندان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے سارے مسئلے میں نے ہی حل کرنے ہیں؟ وہ نواب کا بچہ بھی تو ہے۔ اس کی کرو۔“ وہ بھڑک اٹھا تب ہی اندر شور سا ہوا۔
 ”مریم نما کر تو لیے سے بال رگڑتی غسل خانے سے نکلی تو بانو کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر بوکھلا کر کہیں۔“
 ”آپا! یہ۔۔۔“
 ”اچھا۔۔۔ تو اس پہ سارے صلاح مشورے ہوتے ہیں۔“ بانو نے موبائل لہرایا۔
 ”آپا! یہ مجھے واپس کر دیں۔“ اس نے لپک کر پکڑنا چاہا۔ بانو نے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔
 ”تو تو کچھ زیادہ ہی بے حیا ہو گئی ہے۔۔۔ تیرے جیسی بے شرم لڑکی تو ہمارے پورے خاندان میں نہیں۔۔۔ کھے ڈال رہی ہے بوڑھے ماں باپ کے سروں پر۔“ وہ زور زور سے بولنے لگی۔ مریم کو ڈر تھا، آوازیں باہر نکلتیں تو نعمان اندر آجائے گا۔
 ”آپا! یہ مجھے دے دیں۔ اس کے بعد بات کریں گے۔“ وہ موبائل جھیننے کی کوشش کرنے لگی۔
 ”کیوں؟ اب اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے کے منصوبے بنانے ہیں؟ بے غیرت! ڈوب کے مر جا۔“ وہی ہوا۔ بانو کی چیخ و پکار پر نعمان اور حمیدہ اندر آ گئے۔
 ”کیا آفت آگئی ہے۔۔۔؟ اس گھر میں کوئی بات سکون کے ساتھ نہیں ہو سکتی؟“ نعمان چلایا۔
 ”نعمان! یہ دیکھ اس کہنی کے کروت۔ اس موبائل پر رابطے رکھے ہوئے ہیں اور میری بھئی ماں کہتی ہے رابطہ کیسے ہو سکتا ہے۔“
 بانو نے لپک کر موبائل نعمان کو تھمایا۔
 ”مریم اپنی جگہ بہت دن گئی۔
 نعمان نے پہلے موبائل کو پھر مریم کو شعلہ بار لگا ہوں سے دیکھا۔
 ”دوسرے لمحے موبائل پوری قوت سے مریم کے سر کے عین پیاس دیوار سے ٹکرایا۔
 (باقی آئندہ اہل ان شاء اللہ)

اکسپریس



اس کے ارد گرد ہنستے کھلکھلاتے شور مچاتے
زندگی سے بھرپور لوگوں کا ہجوم سا تھا۔ وہ سب لوگ
کاروبار زندگی اور مصروفیات کو ترک کر کے کچھ دیر کے
لیے زندگی کے کچھ فارغ لمحات سے لطف اندوز ہونے
کے لیے ہی تو سی ویو پر آئے تھے۔
وہ بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ بہت
مصروف رہنے والا انسان آج چھٹی کے دن فارغ وقت
کو خوب صورت طریقے سے گزارنے کے لیے میاں
چلا آیا تھا۔

پچھلی شب اس کی بہت تکلیف میں گزری تھی۔
ساری رات جاگتے اور سر گیٹ پھونکتے ہوئے وہ اک
کچھ میں آنے والی ذہنی ودلی اذیت میں مبتلا رہا تھا اور
ایسی جاگتی مضطرب بیشیاں راتیں تو اب اکثر و بیشتر ہی
اس کی زندگی میں آنے لگی تھیں۔ اچھیں اور
دوسے بڑھنے لگے تھے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے ٹوکے
سوالوں سے گھبرانے لگا تھا۔ فرار کے کئی راستے تلاش
مکمل کاسکون کئی راستے پر بھی میسر نہیں تھا۔
ابھی بھی گھر سے تو وہ اکیلا ہی نکلا تھا مگر اس وقت

نکولٹ



یاسیت اور حسرت بھرے دل کے ساتھ کھڑا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے ہر کام سوچ کر اس کے نتائج اور اثرات کو مد نظر رکھ کر کیا تھا اور اسے اپنی خواہشوں اپنے کاموں اور اپنے فیصلوں پر ناز تھا کہ آج تک اسے کسی خواہش کے لیے شرمندہ حسرت ہونا پڑا تھا۔ ناکامیوں کا سامنا بہت کم ہوا تھا۔ مگر ایک فیصلہ جو اس نے ایک منہ زور خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا، آج وہ فیصلہ ایک پیچھے تاؤ بن کر لمحہ لمحہ اسے دستا رہتا تھا۔

”ہائے حذیفہ!“ اک خوش کن اور دوستانہ سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا اور اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر اسے حیرانی کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

”انصر تم!“ اس کے لہجے میں بے یقینی کے ساتھ ساتھ بے ساختہ خوشی کا تاثر بھی تھا۔ انصر اس کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا اور آج تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد اس کے رو بہ تھا۔

”ہاں یار! میں انصر ہی ہوں کیا میری شکل چنچ ہو گئی ہے جو تمہیں پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہے۔“ اس کا وہی نٹ کھٹ اور لا پرواہ اساندا تھا۔

”تم بالکل نہیں بدلے ہو یار! شکل و صورت اور انداز سب ویسے ہی ہیں۔“ اسے گلے سے لگاتے ہوئے حذیفہ نے صاف گویا سے کہا۔

”مگر تم تو پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ اور ریزرو محسوس ہو رہے ہو!“ انصر نے بے تکلفی سے کہا اور غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھا تھا۔

”ہاں یار! حالات کر دیتے ہیں سنجیدہ۔۔۔ تم بتاؤ پاکستان کب آئے؟ اپنے آنے کی خبر تک نہیں دی۔“ حذیفہ نے خوشگوار انداز میں پوچھا۔ اتنے عرصے بعد انصر سے مل کر وہ دلی خوشی محسوس کر رہا تھا جو اس کے چہرے سے بھی عیاں تھی۔

”تقریباً تین ماہ ہو چکے ہیں پاکستان آئے ہوئے۔“ انصر نے سامنے بچی کی طرف قدم بڑھاتے

”یہ بتاؤ لائف کیسی جا رہی ہے۔ گھر والوں کا کیا حال ہے۔ بھائی اور اپنے بیٹے کے بارے میں بتاؤ!“ وہ بچے کے قریب آچکے تھے۔ انصر نے ناخنیں پھیلا کر بیچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”سب ٹھیک ٹھاک اپنی اپنی جگہوں پر فٹ فالت ہیں۔ تم سناؤ مستقل پاکستان آئے ہو یا پھر عارضی طور پر؟“ حذیفہ نے ایک پاؤں بچ پر رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”یار! امی ڈیڈی نے اصرار کر کر کے بلایا ہے ان کا کہنا ہے کہ میری شادی ہر حال میں پاکستان میں ہی ہونی چاہیے کسی مشرقی لڑکی سے، پھر چاہے دوبارہ واپس چلا جاؤں مگر حقیقتاً وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ میں بڑے بھائی جان کے ساتھ مل کر اب ڈیڈی کا بزنس سنبھالوں اور انگلینڈ واپس جانے کا ارادہ ترک کر دوں۔

مگر مجھے ان کی یہ دونوں باتیں ناقابل فہم لگتی ہیں۔ بھلا اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ پاکستان لڑکی ہی ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہو سکتی ہے اور جب سرور بھائی اتنے اچھے طریقے سے یہاں بزنس کو دیکھ رہے ہیں تو مجھے وہاں اچھی خاصی جاب آفر ہو رہی ہے۔ میں تو اب واپس انگلینڈ جانا چاہ رہا ہوں مگر ممی کتنی ہیں شادی کیے بغیر نہیں جانا۔۔۔ بقول ان کے میری عمر کے لڑکے اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کروا رہے ہیں۔“ اس نے آخری جملے پر حذیفہ بے ساختہ ہنسا۔

”آئی کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ اب تمہیں گھر بسانا چاہیے۔ تمہاری زندگی میں کبھی لڑکیوں کی کمی نہیں رہی خوب صورت سے خوب صورت لڑکیوں سے دوستی رکھی ہے مگر شادی کے لیے جس نے کہا تم نے

رہ چیکٹ کر دیا۔ کیا بڑھاپے میں کرو گے؟“ ”یار! شادی کے لیے کوئی لڑکی ملے بھی تو فریڈ شپ تو ہزاروں لڑکیوں سے کی جاسکتی ہے مگر شادی ہر ایک سے نہیں کی جاسکتی۔ شادی تو ایک ہی لڑکی سے کروں گا اور وہ ایک لڑکی ابھی تک ملی نہیں مجھے۔“ انصر کے لہجے میں محسوس کی جانے والی جستجو تھی

”مغرب و مشرق کی کئی لڑکیوں سے دوستیاں رکھنے کے باوجود تمہیں اپنی من پسند لڑکی نہیں ملی کہیں امیر کی بددعا تو نہیں لگ گئی تمہیں۔۔۔ یاد ہے نا تمہیں امیر اب یہ نہ کہنا کہ اتنی ساری لڑکیوں کے جھرمٹ میں مجھے امیر بھول گئی۔“ حذیفہ نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یاد ہے یاد ہے اور میری حالیہ معلومات کے مطابق وہ اپنے شوہر اور ایک عدد بے بی کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے انگلینڈ میں۔“ انصر کا انداز بیزار سا تھا۔

”تمہیں اس کو ریجیکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا اتنی زیادہ اینڈر اسٹینڈنگ تھی تم دونوں کی۔۔۔ اور پھر وہ پاکستانی بھی تھی۔ انگلینڈ کی مینشپلی بھی تھی اس کے پاس اتنے امیریاپ کی بیٹی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تم سے محبت کرتی تھی اور خود اس نے اپنا پروپوزل تمہیں دیا جسے تم نے بے دردی سے ٹھکرا دیا۔ کتنا روٹی تھی بے چاری اور تقریباً ایک مہینہ بیمار رہی تھی۔ میں آج تک حیران ہوں تم نے اسے کیوں ٹھکرایا جبکہ تمہاری فیملی بھی اس لڑکی کو پسند کرتی تھی اور سب سے اہم بات پوری یونیورسٹی میں اس کی صرف تم سے دوستی تھی اور کوئی اس کا بوائے فرینڈ نہیں تھا۔“ اس بات کو دہراتے ہوئے آج بھی حذیفہ کے لہجے میں حیرانگی تھی۔

”اونہ۔۔۔ محبت۔ تم تو فارغ ہوتے ہی پاکستان آ گئے تھے اور ان دنوں وہ میرے عم میں بٹلا پھر تھی مگر بعد میں جب میں نے تحقیق کی اور اپنی اس خوش فہمی کو یقین دلانا چاہا کہ اتنی حسین امیر گیر اسٹائنلش سی لڑکی واقعی مجھ سے ہی محبت کرتی ہے تو معلوم ہوا وہ

ابارشن کرانے کی وجہ سے بیمار پڑی تھی اور یہ اسے اس وجہ سے کرانا پڑا کیونکہ پاکستان سے گئے اپنے ایک کزن میں وہ کچھ زیادہ ہی اتوالو ہو گئی جس کی وہ آج کل بیوی ہوتی ہے۔ بس تب سے ان اسٹائنلش اور ماڈرن

”اونہ۔۔۔ محبت۔ تم تو فارغ ہوتے ہی پاکستان آ گئے تھے اور ان دنوں وہ میرے عم میں بٹلا پھر تھی مگر بعد میں جب میں نے تحقیق کی اور اپنی اس خوش فہمی کو یقین دلانا چاہا کہ اتنی حسین امیر گیر اسٹائنلش سی لڑکی واقعی مجھ سے ہی محبت کرتی ہے تو معلوم ہوا وہ

ابارشن کرانے کی وجہ سے بیمار پڑی تھی اور یہ اسے اس وجہ سے کرانا پڑا کیونکہ پاکستان سے گئے اپنے ایک کزن میں وہ کچھ زیادہ ہی اتوالو ہو گئی جس کی وہ آج کل بیوی ہوتی ہے۔ بس تب سے ان اسٹائنلش اور ماڈرن

”اونہ۔۔۔ محبت۔ تم تو فارغ ہوتے ہی پاکستان آ گئے تھے اور ان دنوں وہ میرے عم میں بٹلا پھر تھی مگر بعد میں جب میں نے تحقیق کی اور اپنی اس خوش فہمی کو یقین دلانا چاہا کہ اتنی حسین امیر گیر اسٹائنلش سی لڑکی واقعی مجھ سے ہی محبت کرتی ہے تو معلوم ہوا وہ

ابارشن کرانے کی وجہ سے بیمار پڑی تھی اور یہ اسے اس وجہ سے کرانا پڑا کیونکہ پاکستان سے گئے اپنے ایک کزن میں وہ کچھ زیادہ ہی اتوالو ہو گئی جس کی وہ آج کل بیوی ہوتی ہے۔ بس تب سے ان اسٹائنلش اور ماڈرن

”اونہ۔۔۔ محبت۔ تم تو فارغ ہوتے ہی پاکستان آ گئے تھے اور ان دنوں وہ میرے عم میں بٹلا پھر تھی مگر بعد میں جب میں نے تحقیق کی اور اپنی اس خوش فہمی کو یقین دلانا چاہا کہ اتنی حسین امیر گیر اسٹائنلش سی لڑکی واقعی مجھ سے ہی محبت کرتی ہے تو معلوم ہوا وہ

حذیفہ جیسے بت بن گیا تھا اور بے یقین ساکت نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”یار! حیرت کے مارے کہیں زمین بوس نہ ہو جانا اور سچ پر بیٹھ جاؤ۔“ انصر نے بچ پر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

”مجھے حیرت اس لیے ہو رہی ہے کہ میں ہی بدھو آدمی ہوں جو عورت کو پہچان نہیں سکا یا پھر عورت اصلی روپ ہی ظاہر نہیں ہوتا۔“ حذیفہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔

”بچپن میں کبھی اپنے دادا کے منہ سے سنا تھا کہ عورت کی چال ڈھال اس کے کردار اور اس کے خیالات کی عکاسی کر دیتی ہے۔ تب تو یہ بات سر سے گزر گئی مگر گزرتے وقت نے اس بات کا مفہوم بتا دیا۔

یار! شادی صرف نفس کے لوازمات پورے کرنے کے لیے تو نہیں کی جاتی۔ شادی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ شادی دو انسانوں کے درمیان ایک عہد ہوتا ہے

”بچپن میں کبھی اپنے دادا کے منہ سے سنا تھا کہ عورت کی چال ڈھال اس کے کردار اور اس کے خیالات کی عکاسی کر دیتی ہے۔ تب تو یہ بات سر سے گزر گئی مگر گزرتے وقت نے اس بات کا مفہوم بتا دیا۔

یار! شادی صرف نفس کے لوازمات پورے کرنے کے لیے تو نہیں کی جاتی۔ شادی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ شادی دو انسانوں کے درمیان ایک عہد ہوتا ہے

”بچپن میں کبھی اپنے دادا کے منہ سے سنا تھا کہ عورت کی چال ڈھال اس کے کردار اور اس کے خیالات کی عکاسی کر دیتی ہے۔ تب تو یہ بات سر سے گزر گئی مگر گزرتے وقت نے اس بات کا مفہوم بتا دیا۔

یار! شادی صرف نفس کے لوازمات پورے کرنے کے لیے تو نہیں کی جاتی۔ شادی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ شادی دو انسانوں کے درمیان ایک عہد ہوتا ہے

”بچپن میں کبھی اپنے دادا کے منہ سے سنا تھا کہ عورت کی چال ڈھال اس کے کردار اور اس کے خیالات کی عکاسی کر دیتی ہے۔ تب تو یہ بات سر سے گزر گئی مگر گزرتے وقت نے اس بات کا مفہوم بتا دیا۔

یار! شادی صرف نفس کے لوازمات پورے کرنے کے لیے تو نہیں کی جاتی۔ شادی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ شادی دو انسانوں کے درمیان ایک عہد ہوتا ہے

”بچپن میں کبھی اپنے دادا کے منہ سے سنا تھا کہ عورت کی چال ڈھال اس کے کردار اور اس کے خیالات کی عکاسی کر دیتی ہے۔ تب تو یہ بات سر سے گزر گئی مگر گزرتے وقت نے اس بات کا مفہوم بتا دیا۔

”جیسے دونوں نے باؤفار طریقے سے ٹھکانا ہوتا ہے شادی کے بعد آگے ایک نسل کی افزائش ہوتی ہے اور میں چاہتا ہوں میری اولاد میری نسل ایک ایسی عورت کی گود میں پروان چڑھے جو اپنی ہی میں عورت ہو!“

انصر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ حذیفہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ کیا یہ وہی انصر ہے جو انگلینڈ میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اپنا بیرونی اشل اور کرل فرینڈ آئے روز تبدیل کرتا تھا بیوی کے لیے اس نے الگ سی معیار سوچ رکھا تھا۔

”انصر! تم جب شادی کرو گے تو کیسے جان پاؤ گے کہ جس لڑکی کا تم انتخاب کر رہے ہو وہ سچی مخلص باؤفارو باکرادار ہے؟“ حذیفہ کے لہجے میں تجسس تھا۔

”ہوں انٹر سٹنگ کو سنسنجن۔۔۔ اس کی آنکھوں میں تو حیا کا عکس ہو گا جب وہ بات کرے گی تو اس کے لفظوں میں سچائی کی نمک ہوگی۔۔۔ اور جب وہ باکرادار باحیا اور سچی ہوگی تو یقیناً ”بؤفارو“ بھی ہوگی اور ایسی لڑکی کو میں عزیزیوں کی محفل میں بھی بچان لوں گا خدا نخواستہ اگر وہ مجھے ایسی کسی محفل میں بھی ملی۔“

آخری جملہ اس نے ایسے یقین سے کہا تھا کہ حذیفہ کو اپنے آپ سے مذمت محسوس ہوئی کہ اس نے عورت کو پچاننے میں خاصی بد عقلی سے کام لیا تھا۔

”انصر! لڑکیوں سے دوستیاں پالنے کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ تمہیں لڑکیوں کو سمجھنا آگیا۔ میری طرح نا سمجھ نہیں ہو۔“ حذیفہ نے کچھ خفت آمیز انداز میں کہا۔

”اوہ یار! سارے مردوں کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ عورت کو پچان سکے خاص کر اس کے کردار کو۔۔۔ چاہے وہ لڑکیوں کے قریب رہے یا نہیں۔۔۔ اگر پچاننے میں غلطی کرتے ہیں تو اس میں ان کی اپنی سوچ اور نظریات کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔“

انصر کی پراعتاب بات نے حذیفہ کو ایک اور دھچکا لگایا۔

”چلو آج میری طرف سے لُچ۔۔۔ اتنے عرصے بعد

ملے ہیں۔“ اپنے اندر بڑھتے شور کو نظر انداز کرتے ہوئے حذیفہ نے لہجے کو شش کرتے ہوئے کہا۔

”وائے ٹائٹ۔۔۔ چلو چلتے ہیں!“ انصر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اب وہ دونوں اپنی اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے، جو کہ پارکنگ ایریا میں کھڑی تھیں۔



حذیفہ اور انصر دونوں بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلا تعلیم کے لیے ایک ہی سال انگلینڈ کی یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں اجنبی دیس میں پہلے پہل کنفیوز رہے مگر چند ہی دنوں میں انصر نے وہاں کے ماحول اور اثرات کو قبول کر لیا۔ لہذا غیر ملکی لڑکے لڑکیوں سے دوستیاں کرنے اور روابط بڑھانے میں اسے کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ غیر معمولی ذہانت رکھنے کے علاوہ وہ پرسکش اور پراعتاب شخصیت کا حامل زندہ دل، شوخ اور خوش مزاج سالز کا تھا۔ اس کی ہلکی گندمی رنگت اور کمری کلی سیاہ آنکھوں میں بہت جاذبیت پائی جاتی تھی۔ نیلی، مہذب، سنسری آنکھوں اور گوری رنگت والی انگریز لڑکیوں کو اپنے گھٹنے میں پھنسانا تو جیسے اس کے دامن ہاتھ کا کام تھا۔ وہ کروڑ پتی باپ کا بگڑا ہوا لاڈلا بیٹا تھا۔ جو زندگی کے ہر لمحے سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ تعلیم میں دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود وہ اسکول سے لے کر اب تک زہین اسٹوڈنٹس اور اچھی پوزیشن رکھنے والے اسٹوڈنٹس میں رہا تھا۔ مگر اس کا ذاتی کردار شریف النفس طالب علموں کے لیے ناپسندیدہ تھا۔

ہر لڑکی سے اس کا ایسا زور دار ایفیرنچلہ کہ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے اس کا آخری ایفیرنچ ہے۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد اس لڑکی کو پچاننے میں بھی اسے دقت کا سامنا ہوتا ہے اپنی اس ہرجائی فطرت کے باوجود وہ لڑکیوں میں مقبول تھا۔ شائون تک آتے لیے بال اور مسکرانے کا مخصوص ایشنل کسی بھی لڑکی کو بائگل کر دیتا تھا۔

اس کے برعکس حذیفہ طبعاً ”شریف محتاط اور

سنجیدہ“ تھا۔ وہ اپنے والدین کا کلا کلا مایا اور دو بہنوں کی امیدوں کا مرکز تھا۔ تعلیمی ریکارڈ اس کا بیسہ اچھا رہا تھا والدین کی سپورٹ اور اپنے شوق کی بنا پر وہ انگلینڈ تعلیم حاصل کرنے آتا تھا۔ اس کے والد سکندر علی جمی ایک بزنس مین تھے۔ مگر جلد ہی پستی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی شب و روز محنت کی بدولت آج بالی ہوسائٹی میں مقام پایا تھا۔ حذیفہ اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ اس کے والد صاحب نے جو کچھ بھی بنایا بہت محنت سے بنایا اور آگے جا کر اسے ہی یہ سب سنبھالنا ہے لہذا وہ پوری نیک نیتی سے خود کو اس قابل بنانا چاہتا تھا کہ والد کے بنائے ہوئے کاروبار کو مزید ترقی دے سکے۔ لہذا انگلینڈ جا کر مغربی فضا میں بھی اس کی توجہ کا مرکز اس کی بڑھائی تھی۔

پہلے پہل حذیفہ کو انصر ایک آنکھ نہ بھایا۔ مگر پھر کلاس میں اس کی نمایاں پوزیشن، پروفیسر پر سوالات کی پوچھا کر کے زچ کر دینے کا انداز اور اپنی متاثر کن شخصیت کی بدولت اس نے حذیفہ کو اپنی طرف کھینچ ہی لیا اور چند باریک ملاقات نے ہی حذیفہ کو باور کروا دیا کہ یہ لا بالابی اور کھلتی طبیعت رکھنے والا شخص اندر سے کتنا گرا اور ہرجیہ کا بغور مشاہدہ کرنے والی آنکھ رکھتا ہے۔

دونوں کے مزاج عادات اور فطری ذوق و شوق میں فرق کے باوجود دوستی ہوئی گئی اور پھر تعلیم مکمل ہونے تک رہی۔ حذیفہ نے فوراً ہی واپسی کی غلطی نہ تھی جبکہ انصر کافی اقبال کوئی پروگرام نہ تھا پاکستان واپس جانے کا۔ آج عرصے بعد ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کو ساتھ بیٹے دل یاد آئے اور دونوں ہی ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے تھے۔



”منیو! اٹھ جاؤ بچے کب تک سوؤ گی۔ دیکھو تو“ شام ہو رہی ہے۔ چلو اٹھو میرا بیٹا پھر رات ساری تمہیں نیند نہیں آتی ہے۔ یہ بے وقت کا سونا چھوڑ دو۔“ کلثوم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا پھر آگے

بڑھ کر کھڑی کے آگے پرہ بٹایا۔ وہ تھوڑا سا کسمسلسلی۔

”اٹھ جاؤ بیٹا! رونی کے ساتھ ذرا میسر و چلی جاؤ اس مینے کاراشن نہیں آیا۔ آج جس مارننگ ہو رہی ہے۔“ کلثوم بیگم نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔

”امی! ابھی صبح کے ساتھ آپ چلی جائیں یا سہیل بھائی کو بھیج دیں وہ آہی چکے ہوں گے۔“ بند آنکھوں کے ساتھ وہ تھمارا کو آواز میں بولی۔

”بیٹا تم جانتی ہو گاڑی مجھے بھی نہیں چلانی آتی اور نہ ہی رونی کو۔۔۔ ورنہ وہ اسی ہی چلی جاتی اور سہیل ابھی ابھی آیا ہے دفتر سے تھا کہ وہ۔۔۔ وہ جانا نہیں چاہ رہا۔ تم چلی جاؤ رونی کے ساتھ۔“

”کلثوم بیگم نے نرمی سے کہا تو منیو مزید پس و پیش نہ کر سکی۔ دو تین بار پلکیں مچھکھکانے کے بعد اس نے پوری آنکھیں کھولیں تو کلثوم بیگم کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

”کتنی بار کہا ہے یہ نیند کی کوئی مت لیا کرو۔“ کلثوم بیگم نے کہا تو ایک تلخ مسکراہٹ منیو کے ہونٹوں پر آئی۔

”امی! نیند نہ آئے تو کیا کروں۔ مجبوراً“ لیتی ہوں۔ شوق سے تو نہیں۔“ دھیمی آواز میں کہتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھی اور سلیر پر ہن کر کمرے سے ملحق ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ کلثوم بیگم کے سینے سے اک افسردہ سی آواز خارج ہوئی۔



میکرو کے پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ دونوں لڑکیوں کی طرف آئیں۔ رونی نے ایک ٹرائی گھسیٹ لی۔ منیو راتے بھر چپ چاپ ڈرائیونگ ہی کرتی آئی تھی۔ رونی کی ایک دیابت کے جواب میں اس نے فقط ہوں ہاں ہی کیا تھا۔ پھر رونی نے بھی اسے زیادہ مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ منیو ابھی بھی نیند کے زیر اثر ہے۔ خریداری بھی

روٹی کے خودی شروع کی۔ منیو بس چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔

ضرورت کی ہر چیز وہ تقریباً ”خرید ہی چکی تھیں اور پھر آخر میں وہ اس روٹی کی طرف آئیں جہاں چائینیز چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

”منیو اب یہاں شاپنگ کا مرحلہ نہیں سر کرنا ہے کیونکہ تم ہی جانتی ہو بچوں کی پسند۔“ روٹی نے اب اسے آگے کیا۔ وہ مسکراتے ہوئے چائینیز کی طرف آئی۔

”ہیلو! کیا آپ مجھے جاسکتی ہیں کہ روزانہ تین ٹائم کھانے میں اسپیکٹھی کھانا ہو تو ایک مینے کے لیے یہ اشاک کافی ہے؟“

اس کے قریب کھڑے شخص نے بہت بے تکلفی سے دریافت کیا تھا۔ منیو نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

گلابی ڈوروں والی ’صاف شفاف بچوں کی سی معصومیت رکھنے والی بڑی بڑی آنکھیں جن میں پھیلی حیرانی انہیں مزید غضب ناک بنا رہی تھی۔ پھر اس نے ٹرائی کی طرف دیکھا جس میں دس بارہ پیکٹ اسپیکٹھی کر رہے ہوئے تھے۔

”یہ بہت زیادہ ہیں مسٹر! کوئی بھی شخص روزانہ تین ٹائم کھانے میں اسپیکٹھی نہیں کھا سکتا۔ یہ مزے دار ہیں مگر کوئی چیز کتنی ہی مزے دار کیوں نہ ہو روزانہ تین ٹائم کھائی جائے تو اس سے دل اوب جاتا ہے۔ اور مزید یہ کہ ہر جانے انجانے سے بے تکلف ہونے اور مذاق کرنے کی عادت بھی خاصی خراب ہے۔“ بے تاثر لہجے میں جواب دیتے ہوئے آخری جملہ اس نے ذمت آمیز انداز میں کہا۔

”کبھی کبھی یہ عادت خاصی فائدہ مند بھی ہوتی ہے۔“ اس شخص نے فوراً ”جواب دیا۔

”جی۔“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”میرا کہنے کا مطلب ہے میں پہلی بار شاپنگ کر رہا ہوں گھریلو خاص کر کچن کی چیزوں کا کچھ تجربہ نہیں۔ اب میں اندازہ لگا لوں گا کہ کبھی کبھی اسپیکٹھی کھانے

کے لیے مجھے کتنے پیکٹ درکار ہوں گے ویسے میں بھی چائینیز کھانوں کا خاصا شوقین ہوں۔“

”جی اچھا! منیو نے لفظوں کو خاصا دبا کر ادا کیا اور آگے بڑھ گئی۔

”سینے پلینز۔“ پیچھے سے اس کی پکار پر وہ وائٹ کچکا پتے ہوئے مڑی۔

”آپ کی آنکھیں بے حد منفرد اور حسین ہیں۔“ حسب عادت اور حسب مزاج وہ یہ کہنا چاہتا تھا۔ مگر الفاظ اس کے لبوں تک نہ آ سکے۔

”آپ کا بہت شکریہ۔“ اس نے کھوئے سے انداز میں کہا تھا۔

منیو نے لوگوں کی موجودگی کے باعث اسے سخت ستانے سے پرہیز کیا اور روٹی کی طرف آگئی۔

اسے وہ لڑکی کچھ منفرد سی لگتی تھی۔ اس کی شکل و صورت میں انفرادیت تھی یا کچھ اور جس نے اسے اس لڑکی سے مخاطب ہونے پر اکسایا۔ کوئی بھی لڑکی پہلی نظر میں اسے متاثر کرتی تو وہ تعارف حاصل کرنے میں لمحہ نہ لگاتا۔

اپنی مطلوبہ چیزیں لینے کے بعد وہ میکرو سے نکلا اور گھر کی طرف جانے لگا گاڑی چلاتے ہوئے اس کے تصور میں بار بار منیو کی حیرانی بھری گلابی آنکھیں آتی رہیں۔ مئی اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیک اور ان کے اندر موجود اشیاء دیکھ کر خاصا حیران ہوئیں۔

”انصر بیٹا یہ سب کیوں لے آئے ہو۔ اس مینے کا سارا راشن تو میں ابھی تین دن پہلے لا چکی ہوں۔ اور یہ اسپیکٹھی کے اتنے پیکٹ؟“ وہ چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ممی! ایئر پورٹ پر دوست کو ریسپور کرنے کے بعد نکلا تو یاد آیا کہ ٹائی لپٹی تھی، بس وہیں سے میکرو چلا گیا اور یہ بھی خرید ڈالے۔“

صوفے پر بیٹھے انصر نے ٹی وی کے چینل چنچ کرتے ہوئے اطمینان سے بتایا۔ انصر کا سارا دھیان بظاہر ٹی وی کی طرف تھا۔ جہاں رسلنگ چل رہی تھی۔ مگر اندرونی طور پر وہ ابھی بھی میکرو میں ہی تھا۔

اس لڑکی کے ساتھ بلا مقصد باتیں کرتا ہوا اسے اس لڑکی کا نام تو معلوم ہو ہی گیا تھا جب ساتھ والی لڑکی نے اسے پکارا تھا۔ مگر بجائے کیوں وہ اس سے مزید تعارف حاصل کرنے کے لیے خود کو بے چین محسوس کر رہا تھا۔ کون تھی گلابی رہتی تھی گیا کرتی ہے۔ میو ہے یا ان میو۔ یہ سب سوال اس کے اندر اٹھ رہے تھے۔ اسی وقت اس کا سہل بچنے لگا۔ دانیال کا نمبر تھا۔ شاید گھر پہنچنے کے بعد وہ اسے کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسپو کرنے سے پہلے ٹی وی کا الیوم کم کیا۔



اگلے کئی دن ادھر ادھر گھومتے ہوئے بلا ارادہ ہی وہ ہر لڑکی کے چہرے میں سے اس کا چہرہ کھو جاتا رہا اپنی کیفیت پر حیران ہوتا رہا کہ آخر کیا کیا تھا اس سادہ سی لڑکی کی شخصیت میں جس نے اسے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی زندگی میں ہزاروں لڑکیاں آئی اور گئی تھیں اور کئی ایسی لڑکیاں جن کے ساتھ اچھا خاصا وقت بھی گزارا تھا پھر بھی ان کے چہرے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ مگر وہ لڑکی کیا تھی۔ اور اس کی آنکھیں۔

اسے ایسا محسوس ہوتا ”اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں پہلی بار ایسی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی بے نیازی گواہی اور پاکیزگی تھی اور شاید یہ اس کی گہری جستجو کا ہی نتیجہ تھا کہ اس دن طارق روڈ پر ہفت کی شام گھومتے ہوئے وہ اسے اچانک ہی نظر آگئی۔ اس کے ساتھ آج بھی وہی والی لڑکی تھی جو اس دن میکرو میں اس کے ہمراہ تھی۔

وہ دونوں پکڑے کی دکان میں کھڑی تھیں اور پکڑا ہاتھ میں پکڑے آپس میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ انصر کا دل یوں اسے اچانک سامنے پا کر بے ساختہ دھڑکا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ کس بہانے اس لڑکی کے قریب جانے اور اسے مخاطب کرے۔ پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑے وہ اسے دیکھ رہا تھا جب اس کی نظر منیو سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ایک نوجوان پر پڑی جو

میں محسوس انداز میں منیو پر اپنے موبائل کے میسرے کوفٹ کے ہوئے تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ نظر انداز کر گیا مگر پھر غور کرنے پر محسوس ہوا کہ وہ لڑکا منیو کی تصویر میں لے رہا ہے۔ اگرچہ منیو نے اچھی طرح ماتھے تک اسکارف لپیٹ رکھا تھا۔ لیکن چہرہ واضح تھا۔ گول بیضوی چہرہ اور اس پر سچے خوب صورت نقوش، جاذب نظر اور دلکش تھے۔ خصوصاً ”چہرے کی انفرادیت اور دودھیا چمکتی رنگت کسی کو بھی متوجہ کر سکتی تھی اور اس لڑکے کی حرکت انصر جیسے شخص کے لیے قابل مذمت یا معیوب نہیں تھی۔ مغربی ملک میں اس نے وہاں کے ماحول کو اپنا کر اپنی آزاد طبیعت کا ثبوت دیا تھا۔ مگر بجائے کیوں اس وقت اسے یہ منظر خاصا ناقابل برداشت لگ رہا تھا۔ ماتھے پر بل چڑھاتے ہوئے اس نے رخ بدل لیا۔ ایک لمحے بعد ہی اسے ایک لڑکی کے زور سے بولنے کی آواز آئی تو وہ بے اختیار پٹلا۔

”بے ہودہ انسان! تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری تصویر لینے کی؟“ عین غصہ میں بولتے ہوئے اس نے اس لڑکے کے منہ پر زور دار چٹنا رسید کیا۔ آپس پاس کے کئی لوگ متوجہ ہو گئے۔ وہ شاید جان لیتی تھی کہ وہ لڑکا چپکے چپکے اس کی تصویریں اپنے موبائل سے لے رہا ہے اور یہ جانتے ہی وہ آگ بولہ ہو گئی تھی۔ اس کے رد عمل نے نہ صرف اس لڑکے کو حواس باختہ کر دیا بلکہ انصر بھی دم بخود تھا۔ اس کا سفید دودھیا چہرہ غصے سے لال ہو کر تھم رہا تھا۔ صاف شفاف آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کسی انگارے کی طرح دھب رہی تھیں۔

اس لڑکے نے ایک لمحے کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگنا چاہا مگر اگلے ہی لمحے منیو نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ پھر اس کے بالوں سے پکڑ کر اس کے سر کو زور دار جھٹکے دیے۔ وہ لڑکا ہلبلا کر رہ گیا۔ موبائل اس کے ہاتھ سے گر کر زمین بوس ہو گیا تھا۔ جسے روٹی نے تیزی سے آگے ہو کر قابو میں کر لیا تھا۔ منیو کا انداز ایسا جھولی

موتے ہاتھ میں ہلوانہ بن جائے۔ اپنی سوانحیت کے وقار، شرم و حیا اپنی صنف کی آبرو کو اہم سمجھے۔ اس لڑکی کو جب پہلی بار اس نے دیکھا تھا تو اس سے دوستی کرنے کی خواہش ابھری تھی۔ آج دوسری بار دیکھا تھا تو فیصلہ بدل چکا تھا۔



انگلش گانے کی دھن پر سیٹی بجاتا ہوا وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ ”صاحبزادے! کہاں رہتے ہو سارا دان؟“ کبھی آفس بھی چکر لگایا کرو۔ اصغر تو آج سارا دان فیکٹریوں کے ٹور پر رہا ہے، تم نے آفس کا کام ہی دیکھ لیتا تھا۔“ صدیق صاحب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”اوسہ۔۔۔ دیکھنا ہے اس نے آفس کا کام۔ واپسی کے لیے بے تاب ہوا پھر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں آپ خود ہی اس کا رشتہ طے کر دیں۔ اسے تو ساری زندگی کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔“

اس کے بجائے مناز بیگم نے جواب دیا تھا۔ ساتھ ہی رائے بھی دی تھی۔

”ہاں تو بیگم لڑکی ڈھونڈنا اور سلیکٹ کرنا تو خواتین خاص کر ماؤں کا کام ہوتا ہے۔ آپ لڑکی پسند کر لیں میں تو خود کہتا ہوں۔ اب اسے ٹیکل ڈال دیں کافی عمر گزرائی آزار دہ کر۔“ چنیل چیچک کرتے ہوئے صدیق صاحب نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”سنو انصر! بالکل سنجیدہ ہوں آج میں اور تمہارے ڈیڈی اکرم صاحب کے ہاں ڈنر کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی بیٹی سونیا تعلیم مکمل کر کے یو کے سے واپس آئی ہے۔ اسی خوشی میں انہوں نے نزدیکی احباب کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ اگر مجھے سونیا پسند آئی تو میں اکرم اور ان کی منز سے آج ہی رشتے کی بات کر آؤں گی۔“

مناز بیگم کا انداز غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور دھمکی آمیز تھا۔ انصر کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

”اوسہ۔۔۔ تو آپ نے حتیٰ فیصلہ کر لیا۔“ وہ ان کے قریب آیا۔

”منیوہ! بس کرو۔ چھوڑو اسے۔۔۔ دیکھو کتنے لوگ اکٹھے ہو گئے اگر ان میں سے کسی نے ویڈیو بنا کر کسی چینل کو بھیج دی یا نیٹ پر اپ لوڈ کروادی تو زیادہ رسوائی ہے۔ بس چھوڑو اسے۔“ رولی نے اس کے قریب جا کر اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے لڑکے کو چھوڑ دیا اور تیزی سے رش میں سے نکل گئی۔

انصر جو اس سارے واقعہ کا خاموش تماشا بنی تھا اب ارادہ ہی ان کی گاڑی کا پیچھا کرنے لگا۔ جب منیوہ نے اپنے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو وہ قریب ہی سے گاڑی زن سے بھاگے گیا۔

یہ اپرٹل کلاس لوگوں کا اسیا تھا۔ منیوہ کا گھر دیکھ لینے کے بعد انصر کو اتنا تازہ ہو گیا کہ وہ کسی بہت امیر کبیر خاندان کی لڑکی نہ تھی۔ واپس گھر جانے تک وہ مسلسل اس لڑکی کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کو اس قدر مشتعل دیکھا تھا وہ بھی ایسی بات پر جو آج کل کی سوسائٹی میں عام ہو چکی تھی۔ عورتوں کے بارے میں تو اس کی ایک رائے کسی اصول اور فارمولے کی طرح پکی ہو چکی تھی کہ وہ اپنے حسن کی تعریف کروانا پسند کرتی ہیں اور غیر لڑکوں کو اپنی جانب متوجہ کروانا لڑکیوں کی کمزوری ہے۔ مگر آج اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا تھا۔

وہ بھی آج کے زمانے کی ہی لڑکی تھی جو غیر لڑکے کو اپنی تصویر لیتے دیکھ کر مشتعل ہو گئی تھی۔ اس کے تہجے کی غضب ناک، آنکھوں کے شعلے، گالوں کی متمتاہٹ، ہاتھوں کا بے لحاظ ہو کر اٹھنا اور اندھا دھند اسے مارنا۔۔۔ سارے منظر انصر کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

اس کی شدید خواہش تھی کہ کاش کبھی کوئی ایسی لڑکی بھی اس کے سامنے آئے جو غیر مرد کے متوجہ ہونے، تعریف کرنے پر خوش ہونے، خود پر فخر کرنے کے بجائے ایسے اپنی عزت اور غیرت سے کبھی منسلک کرے۔ اپنی تعریف کو اپنی کمزوری نہ بننے دے۔ ہر

”دیکھیں مہی! دل سے دل کو کس طرح راہ ہوتی ہے۔ آج ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔“

”کوئی لڑکی پسند کی؟“ اس کی بات مکمل ہوتے ہی ممتاز بیگم نے نہال ہوتے ہوئے پوچھا۔ صدیق صاحب کے چہرے کا تناؤ بھی خاصا کم ہوا۔

”جی لڑکی کو دیکھ کر ہی تو فیصلہ کیا ہے۔“ انصر نے مسکراتے ہوئے اعتاد سے کہا۔

”کون ہے؟“ کہاں ملی؟“ مہی کا لہجہ پر شوق اور دوستانہ تھا۔

”مہی! میں اس کے بارے میں فقط یہ جانتا ہوں کہ اس کا نام منیرہ ہے۔ وہ ایک متوسط فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور۔۔۔ اور ایک باکدوار لڑکی ہے۔ باقی اس کی انجو کیٹن کیا ہے۔ عادت اور مزاج کی کیسی ہے۔ گھر بڑا ماحول کیسا ہے۔ یہ سب بعد میں معلوم ہو گا۔ آپ کوئی الحال صرف اتنا کرنا ہے کہ میرا رشتہ لے کر جانا ہے ان کے گھر کا ایڈریس ہے میرے پاس۔ میں آپ کو دے دوں گا جب بھی آپ جانا چاہیں۔“ انصر نے سنجیدگی سے بات مکمل کی تھی۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”بیٹا! یہ کیا بات ہوئی کہ تم اس لڑکی کا صرف نام ہی جانتے ہو۔ کیا اس سے دوستی دینو نہیں ہے؟“ مہی نے متعجب ہو کر پوچھا۔

”مہی! اسے دیکھتے ہی ایسے لگا کہ مجھے اسی کی تلاش تھی۔“ انصر کا لہجہ گہرے اور گہرا تھا۔ ممتاز بیگم نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا پھر صدیق صاحب کی طرف۔

”بیٹا! اگر وہ لوگ امارت میں ہم سے کم ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض یا ہتک آمیز بات نہیں ہے۔ رشتہ کرتے وقت ہم نے تین باتوں کا خیال رکھنا ہے۔ پہلی تو یہ کہ وہ ہمارے ہم مذہب یعنی مسلمان ہوں۔ دوسرے خاندانی لوگ ہوں باعزت اور اچھی شہرت رکھنے والی فیملی ہو اور تیسری بات یہ کہ انجو کیٹن فیملی ہو۔ باقی ہمیں تمہاری پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا بلکہ اعتماد ہے کہ تم اپنے لیے بہترین چوننا سنا سنا

انتخاب کرو گے۔“

صدیق صاحب نے شفقت بھرے انداز میں بات کر کے ایک طرح سے اس کی پسند کو قبول بھی کیا اور دوسری طرف اسے محتاط رہنے کا بھی اشارہ کر دیا۔ مگر وہ ابھی اس کی محبت میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ لہذا اسے ان باتوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ اس بات کا اور اک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔

”مہی! آپ جائیں گی تو ان تین باتوں کا اندازہ لگا لیں گی کہ ان میں ہیں یا نہیں۔“ وہ مہی سے سنجیدہ انداز میں مخاطب ہوا۔

”کیوں نہیں بیٹا! اکل سٹڈے ہے۔ میں کل ہی جاؤں گی اور ان لوگوں کے رہن سہن کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام تو نہیں۔“

مہی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

اک طویل عرصے بعد اسے وہ لڑکی اس لحاظ سے پسند آئی تھی کہ اسے جیون ساتھی بنایا جائے۔ اس کے کردار کی مضبوطی ہی اس کے وفا شعار ہونے کا ثبوت تھی۔ ایسی ہی لڑکی مستقبل میں شوہر کی عزت پر بھی حرف نہ آنے دے گی اپنے کسی بھی عمل سے شوہر کا سر نہ جھکنے دے گی۔ اسے کسی دوست کے منہ سے یہ نہ سنا پڑے کہ یہ لڑکی اس کی بھی گرل فرینڈ نہ چکی ہے اور نہ ہی وہ کسی لڑکے کا تعارف اس سے اپنے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے کروائے۔

آئینے کے سامنے کھڑا اپنے چہرے میں اس کا عکس ڈھونڈتا تھا کہ اچانک اس کا سبیل فون بجنے لگا۔

”ہائے حذیفہ! کیسے ہو یار! اس دن کے بعد دکھائی ہی نہیں دیے۔“ بے تکلفی سے بولتے ہوئے شکوہ بھی کر دیا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس مصروفیت کی وجہ سے دوبارہ رابطہ نہیں کر سکا۔ سناؤ کیا ہو رہا ہے آج کل کہیں واپسی کا ٹکٹ تو نہیں کٹا لیا۔“

”نہیں یار! ابی الحال تو ملتی کر دیا۔ مسز کو ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔“ انصر نے ٹھیک وجہ بتائی۔

”واؤ! امیزنگ تو تم نے بھی فیصلہ کر لیا کوئی لڑکی

بھی شادی کے لیے پسند آئی یا معاملہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔“ حذیفہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل۔ لڑکی کو دیکھ کر ہی شادی کا خیال آیا۔ بس دعا کرنا وہ مان جائے۔“ انصر نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو حذیفہ ہنس کر بولا۔

”یار! اس لڑکی میں ہمت ہے تم سے شادی سے انکار کرے۔ میں نے تو آج تک لڑکیوں کو تمہارے لیے روئے دیکھا ہے۔ بائی واو ہے کون۔ کیا اس سے دوستی نہیں ہوئی جو تم قبول ہونے کے لیے دعائیں کر رہے ہو؟“ حذیفہ نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔

”نہیں یار! دوستی کرنے کی کوشش کی تو مارا جاؤں گا۔ لہذا اس سے شادی کا ارادہ کر لیا ہے۔“ انصر نے سادہ انداز میں کہا تو حذیفہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں ایسی لڑکی مل گئی جس کی تمہیں تلاش تھی۔“

”ہاں حذیفہ! اسے دیکھ کر ایسے لگا جیسے وہی میری منزل ہے۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ یقین کرو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سوائے نام کے میں نے زندگی پہلی بار کوئی بایا باکدوار اور شفاف لڑکی دیکھی ہے اور اس کی پاکیزگی اور اعلیٰ کردار کی مظہر اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔“ انصر جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہا تھا۔

”اچھا کیا نام ہے اس کا؟“ حذیفہ نے کچھ رشک سے پوچھا تھا۔

”منیرہ۔“ انصر نے فوراً بتایا تھا۔ دوسری طرف حذیفہ کے ہاتھ سے موبائل گر کر گرومیں آ گیا تھا۔ وہ بڑی طرح چونکا تھا۔ کانپتے دل کے ساتھ اس نے موبائل اٹھایا تھا۔ جس میں سے انصر کی ہیلو بیلڈی آواز آرہی تھی۔

”انصر! میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں اوکے پھر بات کریں گے ابھی مجھے امی جان کا بلاوا آیا ہے۔ میں ان کے پاس جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔“

انصر کا جواب سنے بنا حذیفہ نے کال منقطع کی۔

اسے ساڑھے پانچ سال قبل کی ایک کال یاد آگئی جو پاکستان آنے سے پہلے اس نے گھر پر کی تھی۔

”امی جان! اکل دوسری فلائٹ ہے میری ان شاء اللہ کل رات میں آپ کے پاس ہوں گا۔“

اس نے بہت خوشی سے فون پر امی کو بتایا تھا۔

”بیٹا! اب تو خوشی کے مارے رات بھر نیند بھی نہیں آئی۔ اور پتا ہے ہم نے تمہارے لیے لڑکی منتخب کر لی ہے۔ نیک سیرت، مصوم، صلوٰۃ کی باند پاک باؤ! اچھا باکدوار بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ ایسی کہ سب رشک کریں گے۔“ میمونہ بیگم لہجے میں فخر لیے ممتا بھری آواز میں بول رہی تھیں۔

”افوہ امی جان ابھی میں آیا بھی نہیں ہوں اور لڑکی آپ پہلے ہی پسند کر چکی ہیں۔ یہ تو بتاؤں ہے کون؟ نام کیا ہے؟“ حذیفہ نے کچھ جھپٹتے ہوئے کہا۔

”تمہاری چھو پھوکی بیٹی منیرہ۔“ میمونہ بیگم نے بہت نرم اور سیریں لہجے میں بتایا۔

حذیفہ کو ایسا لگا جیسے کرنٹ بھرے لفظوں نے اس کی سماعت کو چھوا ہے۔ یا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ وہ اس سے تقریباً دس سال چھوٹی تھی اور اسکول میں بڑھتی تھی۔ وہ اس کی شکل و صورت کو ذہن میں واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک ہی کال ڈس کنکٹ ہو گئی۔ دوبارہ کال ملانے کا ارادہ ملاتی کرتے ہوئے اس نے ریسپونڈ کرڈیل کر رکھا اور اپنی ہونے والی مگیت کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆☆☆

”مبارک ہو، مبارک ہو!“ وہ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے گنے دراز بالوں کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی جب معینز الہک الہک کر کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ہاتھ روک کر اس نے کچھ تعجب سے معینز کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور خوشی پر تھا۔

”کس بات کی مبارک باد دے رہے ہو۔“ اس نے بلا ارادہ پوچھا۔

”اس بات کی حذیفہ بھائی واپس آچکے ہیں۔“
”اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے وہ بڑھائی
کے لیے گئے تھے۔ بڑھائی مکمل ہوئی تو لوٹ آئے۔“
اگرچہ وہ خاص بات سمجھ چکی تھی تاہم بے نیازی سے
کہا۔

”اچھا تو یہ بات بھی خاص نہیں کہ ان کے آنے کی
خوشی میں کل شام کو میمونہ آنٹی نے سب کو پارٹی دی
ہے اور اسی پارٹی میں ہمیں حذیفہ بھائی کے نام کی اور
حذیفہ بھائی کو تمہارے نام کی انگوٹھی پہنا دی جائے
گی۔“ منیرہ کے لبوں پر بے ساختہ تبسم پھیلا وہ اپنے
تاثرات معینہ سے چھپانا چاہ رہی تھی مگر چھپانے والی۔
”اول ہوں۔ اب مان گئیں نا خاص بات کو؟“
معینہ نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا
تو وہ ہری طرح جھنجھلائی۔

”معینہ باز آجاؤ اپنی حرکتوں سے رونہ میں پٹائی کر
دول گی۔ سب لوگ تو کیوں کی سنگتیاں مٹا دیاں ہوتی
ہیں اس میں کون سی انگوٹھی بات ہے۔“ اپنی اندرونی
کیفیات پر قابو پاتے ہوئے وہ جھنجھلا کر بولی۔
”آج فیوڈ کلاس فیلو اور چچا زادو کزن ہونے کی بدولت
اگرچہ معینہ سے وہ کٹنی بے تکلف تھی۔ دونوں کی
آپس میں خوب ہنسی تھی مگر اس وقت تو وہ جیسے خود سے
بھی شرما رہی تھی۔ معینہ زور سے ہنسا اور پھر مسکراتے
ہوئے گویا ہوا۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو منیرہ۔ میں تو صرف یہ
جاننے کے لیے تمہیں مبارک دے رہا تھا کہ تم اس
رشتے پر خوش بھی ہو یا نہیں۔“
”تو تمہیں کیا معلوم ہوا؟“ منیرہ کا سوال بے ساختہ
تھا۔

”تمہارا چہرہ تو بتا رہا ہے، تم بہت خوش ہو۔ اچھی
بات ہے مشرقی لڑکیاں یونہی بھوں کے فیصلوں پر رضا
مند ہو جاتی ہیں۔ میں خود بھی بہت خوش ہوں۔“
معینہ نے بزرگوں کے سے انداز میں کہا۔
منیرہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔
”تم کیوں خوش ہو؟“ اس کا انداز تنقیدی تھا۔

”بھئی تمہارے ساتھ ہونے والے مقابلوں سے
جان چھوٹ جا۔“ گی۔ میمونہ آنٹی کا روگ گرام ہے کہ وہ
ایک سال کے اندر اندر حذیفہ بھائی کی شادی کر دیں
گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک سال بعد اسٹوڈنٹ
سے ہاؤس وائف بن جاؤ گی۔ پھر کوئی میرا مقابلہ تم سے
نہیں کرے گا اور نہ ہی تم سے زیادہ نمبر حاصل کرنے
کے لیے مجھے راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھنا پڑے گا۔“
معینہ نے اطمینان سے اپنی خوشی کی وجہ بتائی۔

”اونہ منہ دھو رکھو جناب! تم کیا سمجھتے ہو میں
شادی کے بعد بڑھائی چھوڑ دوں گی۔ امپا سبیل یا سٹری
ڈگری لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے والی۔ میں
بڑھائی جاری رکھوں گی اور دیکھنا تبصرے کی طرح تم سے
بستر کار کر دوں دیکھاؤں گی۔“ بالوں کی چوٹی بنا کر وہ پر عزم
انداز میں بولی۔

”اس۔۔۔ تم تو میری ڈبل بے عزتی کرواؤ گی سب
کہیں گے تمہارے جتنی ہے۔ شادی شدہ بھی ہو گئی
اور بڑھائی کے میدان میں بھی پیچھے چھوڑ رہی ہے۔
بھئی اب کوئی جگہ تو صرف میرے لیے رہنے دو۔ زندگی
کے سارے مرحلے ایک ساتھ طے نہیں کرنے
چاہئیں۔“ معینہ نے بے چارگی سے کہا اور وہ بے
ساختہ ہنس پڑی۔



اگلے روز سب ہی ہنسی خوشی جانے کی تیاری کر
رہے تھے شام کو مغرب کے بعد روانہ ہونا تھا۔ منیرہ
پہلے بھی کبھی کبھار ہی ماموں کے ہاں جایا کرتی تھی۔ مگر
آج شرم اور جھجک کے مارے پاؤں نہیں اٹھائے جا
رہے تھے۔ وہ عجیب سے احساسات اور جذبات سے
دوچار تھی۔

حذیفہ اسے پسند تھا۔ کزن اور بڑے بھائی کی
حیثیت سے وہ بہت فخر سے اپنی فریڈ کے ساتھ اس کی
باتیں کرتی تھی اور یہ سب باتیں کرتے ہوئے اس کے
کبھی وہ ہم وگماں میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن وہ اس
کے جیون ساھی کے حوالے سے سامنے آئے گا۔

وہ منیرہ سے تقریباً دس گیارہ سال بڑھا تھا۔ اسے یاد
تھا جب وہ چھوٹی تھی تو حذیفہ اسے اپنے پیچھے بانٹیک پہ
بٹھا کر آکس کریم کھلانے جاتا تھا۔ جب اس نے
پانچویں کلاس میں پہلی پوزیشن لی تھی تو حذیفہ نے
اسے بہت خوب صورت ڈانسننگ ڈول گفٹ کی
تھی۔ جب وہ انگلینڈ گیا تھا تب منیرہ میٹرک میں تھی۔
اس نے جب منیرہ سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے لیے
انگلینڈ سے کیا بھیجے تو اس نے فوراً جواب دیا تھا
چاکلیٹ اور ڈائری۔۔۔ جو اسے تقریباً چار ماہ بعد مل
بھی گئے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا
تھا۔

دونوں کے درمیان عمر کا فرق تھا۔ مگر منیرہ میمونہ
بیگم کو ایسی بھائی کہ انہوں نے اس فرق کو نظر انداز کر
کے اپنی منہ کلشوم بیگم سے اپنا مدعا بیان کیا۔ پہلے تو وہ
کافی حیران ہوئیں۔ تاہم بعد میں سوچا تو انہیں حذیفہ
کے ساتھ اپنی بیٹی کا مستقبل روشن نظر آیا سوانہوں
نے بھی عمر کے فرق کو درخور اعتنائے جانا۔ بات چلی اور
پھر سب کی رضامندی سے رشتہ طے ہو گیا جس کی
باقاعدہ رسم آج ہونا تھی۔

جب وہ لوگ پہنچے تقریباً ”سارے مہمان آچکے
تھے۔ میمونہ بیگم اور بانی گھر والوں نے بہت گرم جوٹی
سے ان کا استقبال کیا تھا۔ منیرہ بظاہر بہت پر اعتماد نظر
آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اندر ہی اندر سمجھتی جا
رہی تھی۔

اس نے گھرے نیلے رنگ کا سلک کا سوٹ زیب تن
کیا ہوا تھا۔ جس پر سلور کلر کا کام ہوا تھا۔ میچنگ
جیولری اور میچنگ شوژ پہن رکھے تھے۔ بلاشبہ وہ بہت
حسین لگ رہی تھی۔ شازبیہ اور نازیہ نے اسے
خصوصی پروٹوکول دیا۔

حذیفہ ڈرائنگ روم میں اپنے دوستوں سے مل کر
ہال میں آیا تو نئے آنے والے مہمان بڑے والہانہ
انداز میں اس سے ملے۔ کلشوم بیگم اور بانی سب بھی
بہت محبت سے ملے۔ دائیں طرف ایک کونے پر وہ
بھینسی بھینسی سی کھڑی تھی۔ حذیفہ کی نظر اس کی

جانب مڑی اور سر پٹا اس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ پہلے سے
کافی بدل چکی تھی۔
لسبقہ نازک سا پتلا سا سر لائے۔ گوری شبلی رنگت
بڑی بڑی حیران سی نظریں اور مسکراتے لب۔ چہرے
پر ہلاکی معصومیت اور سادگی تو خیر نے کی شگفتگی اور
مازنی حذیفہ کے دل کو بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔
یہ کھلتی تو خیر علی اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ اس کی
ہونے والی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی چمک آئی جس
نے منیرہ کو بھی متوجہ کر لیا۔ حذیفہ کو یوں اپنی طرف
دیکھتا یا کر اس نے شرار نظریں جھکالیں۔ اس کی یہ ادا
حذیفہ کو بے حد بھائی۔

سب کے درمیان بھی وہ الگ تھلک لگ رہی
تھی۔ اور جب انگوٹھی پہنانے کا مرحلہ آیا تو دونوں نے
شادو دوں کے ساتھ ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی۔
تقریب بخوبی اختتام پذیر ہوئی اور ساتھ ہی مہمان
بھی رخصت ہونا شروع ہوئے۔

منیرہ یوں تو کبھی بھی ماموں کے گھر سے خالی ہاتھ
نہیں گئی تھی مگر آج جو کچھ ہمراہ لیے ان کے گھر سے
نگلی وہ بھی پہلے نہیں ملا تھا۔ بہت سے ارمان بہت
حسین خواب اور نئی آرزوئیں ان کی نگلیں ساتھ لیے اس
نے ماموں کے گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ وہ خوش تھی اور
اپنی قسمت پر بے حد نازاں بھی۔ گھر آتے ہی نماز
عشاء کے بعد اس نے شکرانے کے دو نفل بھی ادا کیے۔



رجیم حسن اور کریم حسن، علیم حسن کے بیٹے
تھے۔ کلشوم اور عظمیٰ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ گاؤں
میں ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ بہت امیر کبیرو تھے مگر
بہت باعزت اور خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ انہوں
نے چاروں بچوں کو تعلیم دلوائی تھی۔ دونوں بیٹیوں نے
ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ رجیم حسن نے بی
اے کے بعد گاؤں ہی میں ایک جنرل اسٹور اور ساتھ

میں پی سی او کھول لیا۔ آمدنی میں اضافہ ہوا تو والدین نے فوراً شادی بھی کر دی۔ وہ ابھی بھی اسی گاؤں میں تھے جواب قصبے کی شکل اختیار کر چکا تھا کیونکہ وہاں جدید زمانے کی کافی سہولیات پہنچ چکی تھیں۔ جنرل اسٹور کے ساتھ انہوں نے ایک میڈیکل اسٹور بھی کھول لیا تھا، جو آگے ان کے بیٹے ہی سنبھال رہے تھے۔

علیم حسن کے بچوں میں سب سے قابل سب سے چھوٹے بیٹے کریم حسن تھے۔ وہ بچپن ہی سے ہر کام میں محنت کرنے کے عادی تھے اور پڑھائی میں تو انہوں نے خوب جی لگایا۔ تعلیم کے بعد انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا ایک پرائیویٹ کمپنی میں انہیں اچھے عہدے پر جاب ملی۔ اور پھر چند ہی سالوں میں وہ اسی فہم میں پار سن ہو گئے۔ اسی دوران ان کی شادی میمونہ بیگم سے ہوئی جو عادات و اطوار کی بہت اچھی ثابت ہوئیں۔

کلوٹم اور عظمیٰ کی شادی ایک ہی گھر میں تایا زاد کرزز سے ہوئی۔ دونوں بھائی گورنمنٹ ملازم تھے۔ کلوٹم کے شوہر عباس احمد واڈا کے محکمے میں ایک مناسب پوسٹ پر تھے اور عظمیٰ کے شوہر ریاض احمد محکمہ کیونٹینیشن میں تھے۔ ہمیں ابتدا میں ایک ہی گھر میں رہیں۔ مگر چند سالوں بعد جب بچے ہوئے، ذمے داریاں بڑھیں تو دونوں نے اپنے اپنے پورشن الگ کر لیے۔ ان کے گھرانے کا شمار ملل کلاس گھرانے میں ہوتا تھا۔ وہ سفید پوش اور خوددار لوگ تھے۔ بچوں کے اخراجات اور ان کی اچھی تعلیم کے لیے دونوں بہنوں کو اکثر و بیشتر پنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ کافی تنگی اور غریبی کی حالت میں بھی دونوں بہنوں نے اپنا بھرم نہیں جانے دیا تھا۔

کلوٹم بیگم کے چار بچے تھے۔ بڑے دونوں بیٹے روکیل اور سہیل اور پھر منیرہ اور صغیرہ تھیں۔ عظمیٰ کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی روہی جو سہیل سے ایک سال چھوٹی تھی اور بچپن ہی میں اس سے منسوب بھی ہو گئی۔ پھر معیض تھا جو منیرہ کا ہم عمر تھا

اور ایک ماہی منیرہ سے بڑا تھا۔ پھر وقاص تھا۔ دونوں بہنوں نے اپنے بچوں کی تربیت اخلاقی اقدار پر مبنی اصولوں پر کی تھی۔ اور بچوں نے اپنے والدین کی تربیتوں کا اثر بھی خوب لیا تھا۔ روکیل اور سہیل کی تعلیم مکمل ہوئے ہی انہیں جابز بھی مل گئیں۔ روکیل جو نئی الیکٹریکل انجینئر بنے، کلوٹم بیگم نے اپنی کزن کی بیٹی فائزہ سے اس کا بیاہ کر دیا اور شادی کے کچھ ہی عرصے بعد روکیل اپنی بیگم کے ساتھ اس فلیٹ میں شفٹ ہو گیا جو اسے کمپنی کی طرف سے ملا۔

سہیل کو بینک میں شیجر کی جاب مل گئی تھی۔ کلوٹم بیگم آج کل روہی کو بھی گھرانے کے چلوں میں تھیں کہ جب بالکل اچانک میمونہ بیگم نے منیرہ کو حذیفہ کے لیے مانگ لیا۔ دونوں میں منہ اور بھائی کی روایتی چپقلش کبھی بھی نہیں رہی تھی وہ دونوں بھی کھسار بھائی کے ہاں جاتیں تو میمونہ بیگم بہت خوشی سے ملتیں اور جتنی دیر بھی وہ وہاں ٹھہرتیں یا ان کے بچے وہ کبھی بھی تنگ نہ پڑتیں۔

ان کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا حذیفہ پھر شازیہ اور سب سے چھوٹی نازیہ۔ بچے بھی ماں کی طرح خوش اخلاق اور ہنسنا تھے۔ کلوٹم بیگم کو اپنی بھابھی میمونہ بہت پسند تھیں۔ مگر انہوں نے بھی کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ رشتہ مزید مضبوط ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں بچوں کی عمروں میں واضح تفاوت اور عدم توازن تھا اور دوسری وجہ رہن سہن میں فرق تھا۔ کریم حسن دو کنال کے گھر میں رہتے تھے۔ رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا امیرانہ تھا۔ گھر میں نوکر چاکر بھی تھے گاڑیاں بھی۔ پر آسائش زندگی گزار رہے تھے۔ جبکہ کلوٹم بیگم دس مرلہ کے گھر میں رہتی تھیں۔ جہاں کبھی اپنی تنگی دیکھنا پڑی تو کبھی اتنے دن۔۔۔ روکیل اور سہیل کے برسر روزگار ہونے کے بعد گھر کے حالات میں بہت خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھے تاہم اچھی بھی ان کا اور کریم حسن کے گھرانے کا مقابلہ نہیں تھا۔ اس سب کے باوجود میمونہ بیگم کامنیرہ کے لیے جھولی پھیلا کر کلوٹم بیگم کے لیے بہت بڑی

بات تھی۔ حذیفہ انہیں ہر لحاظ سے پسند تھا۔ سوائے اس بات کے کہ وہ عمر میں منیرہ سے گیارہ سال بڑا تھا۔ گمرہ بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کی وجہ سے انکار کیا جاتا۔ حذیفہ جیسا خوبو، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کاروباری لڑکا ماد کی حیثیت سے بھلا کس کو ناپسند ہوتا اور سب سے بڑھ کر وہ ان کا بھتیجا تھا۔

سب سے مشورے کے بعد باہمی رضامندی سے انہوں نے رشتہ قبول کیا تھا اور بہت خوش تھیں۔ منیرہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ وہ اور معیض ایک ہی کلاس میں تھے۔ بچپن ہی سے ان دونوں کا مقابلہ چلتا آ رہا تھا جو آج بھی جاری تھا۔ منیرہ کی پوزیشن اور نمبر ہمیشہ نمایاں ہوتے جبکہ معیض پڑھائی سے کچھ لاروائی برتا۔ اس کے باوجود بھی اچھے نمبر لے لیتا۔ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ ہی رہے تھے۔ لہذا دونوں کی آپس میں جتنی بھی خوب تھی۔ آج کل دونوں ایف ایس سی پری انجینئرنگ کے فاسٹل ایکڑام کی تیاری کر رہے تھے۔

”یو ویلکم مائی سن۔۔۔ آؤ آؤ۔“ آفس کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر کریم حسن نے فاصل پر سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور حذیفہ کو سامنے پا کر گرم جوشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بائیں پھیلا کر بیٹے کو خوش آمدید کہا۔ حذیفہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور باپ کے سینے سے لگ گیا۔

”آج تمہیں اپنے آفس میں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے میری برسوں کی محنتن اتر گئی۔ چلو، آؤ میں تمہیں اپنے سارے اسٹاف سے ملواتا ہوں۔“

دونوں باپ بیٹا آفس سے نکل کر باہر آئے۔ سب سے پہلے ریسپشن سے تعارف کروایا گیا۔ پھر منیجر کے دفتر کا رخ کیا گیا اور سب سے آخر میں سیکرٹری کے آفس میں وہ لوگ آئے۔

”بیٹا! یہ آپ کی سیکرٹری ہیں۔ مس ماہم نواز اور مس ماہم اباب یہ آپ کے باس ہیں مسٹر حذیفہ

حسن!“ کریم حسن نے تعارف کروایا۔ ”یو ویلکم سر۔“ شیریں لہجے میں بولتے ہوئے ماہم نے اپنا سپید نرم گداز ہاتھ آگے بڑھایا۔ حذیفہ نے سرسری سے انداز میں اس سے ہاتھ ملایا تاہم اس لڑکی میں کچھ ایسی بات تھی کہ لمحہ بھر کے لیے وہ اس سے نظر نہ ہٹا سکا۔

پلکے براؤن رنگ کی ٹی شرٹ کے نیچے گہرے براؤن رنگ کی لیڈر پینٹ پہن رکھی تھی۔ کندھوں تک آتے فاسٹ سے لٹے بال بے حد ریشمی اور چمک دار تھے۔ اس کے بالوں اور آنکھوں کے رنگ میں فرق تھا۔ پال لائٹ براؤن اور سنبر آنکھیں۔۔۔ اگرچہ وہ پاکستانی لڑکی تھی اور پاکستان میں ہی رہا سن پڑی تھی۔ مگر اس کے ہر انداز میں مغربی جھلک رہی تھی۔ اس کا یہ انداز حذیفہ کو کچھ ناگوار سا لگا۔

یہ آج آفس میں اس کا پہلا دن تھا۔ کریم حسن نے بہت محنت سے یہ سب اسمبلیشن کیا تھا اور ہر کام بہت طریقے سلیقے سے کیا ہوا تھا۔ کسی بھی پروجیکٹ میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ اس کا سیاب اور صاف تھوڑے کاروبار کو سنبھالنا اس کے لیے قطعاً مشکل نہیں تھا۔ بلکہ اب اسے اس کا دیوار کو مزید ترقی کے راستے دکھانے تھے۔ اس کے لیے حذیفہ کو اپنے باپ جتنا ہی قابل ہونا تھا۔ اور اسے اپنے باپ پر ناز تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے کافی کچھ سمجھ لیا تھا اور بہت ذمہ دارانہ انداز میں ایم ڈی کے فرائض نبھارہا تھا۔

رات کو وہ اپنے بیڈ روم میں آیا تو کچھ دیر کمرے میں ہی اوھر اوھر ٹھٹھا رہا۔ یوں توئی بار سے خیال آیا تھا کہ منیرہ سے بات چیت کرے۔ مگر ایک عجیب سی جھجک مانع تھی۔ مگر آج میمونہ بیگم کے کہنے پر اس کے شوق اور خواہش کو پر لگے تھے۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملائے لگا۔ منیرہ کے پاس اپنا فانی موبائل نہیں تھا۔ بی بی سی ایل پر نمبر ملایا۔ کلوٹم بیگم نے فون اٹھایا تھا۔

”السلام علیکم پھوپھو جان۔“ اس نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا تو کلثوم بیگم نے بھی بڑی شفقت سے جواب دیا۔

”وعلیکم السلام۔“ کیسے ہو حذیفہ بیٹا۔ آتے ہی مصروفیات پال لیں کہ آنا تو درکنار فون بھی اتنے دنوں بعد کیا۔ ”ان کے لہجے میں پیار بھر آشکوہ تھا۔

”بس پھوپھو جان۔ مصروفیت ہی آئے آگئی۔ آپ سنائیں باقی سب کیسے ہیں؟“ اس نے کچھ شرمندگی کا ثار دیتے ہوئے پوچھا۔

”پھوپھو جان اگر اجازت دیں تو منیروہ سے بات کر لوں!“ چند رسمی باتوں کے بعد وہ مطلب کی بات پر بھی آئی گئی۔

”آں۔ ہاں کیوں نہیں۔ وہ اپنے کمرے میں بڑھ رہی ہے۔ تم ہولڈ کرو میں بلائی ہوں اسے۔“ کلثوم بیگم نے کہا اور ریسیور رکھ کر منیروہ کے کمرے کی طرف چل گئیں۔ چند لمحوں بعد اسے فون پر منیروہ کی جھنجھٹی جھنجھٹی سی آواز آئی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام!“ کیسی ہو؟“ حذیفہ نے دھیمی اور گہمیر آواز میں پوچھا۔ وہ پہلے بھی اکثر حذیفہ سے فون پر باتیں کر لیا کرتی تھی مگر اس وقت وہ اس قدر کنفیوز تھی کہ ہاتھ میں پکڑا ریسیور بھی اسے کانپتا محسوس ہو رہا تھا اور ٹانگوں میں بھی ہلکی ہلکی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں! آپ کیسے ہیں!“

”میں بھی ٹھیک ہوں اور تمہیں مس کر رہا ہوں۔“ حذیفہ نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ منیروہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب اسے کیا کہنا چاہیے۔

”اچھا یہ بتاؤ گیا ہو رہا ہے۔ کیا مصروفیات ہیں آج کل۔“ حذیفہ نے پوچھا۔

”بدھ کو میرا سلاپیہرے فاسٹل ایگزام کا۔۔۔ اس کی

تیاری کر رہی ہوں۔ دعا کیجئے گا حذیفہ بھائی میرے نمبر بہت اچھے آئیں اور معین سے تو ضرور اچھے آئیں۔“ حذیفہ کا یہ سوال شاید اسے معقول لگا تھا۔ لہذا فوراً جواب دیا اور ساتھ ہی اپنے اور اس کے درمیان قائم نئے رشتے کو بھی بھول گئی۔

”حذیفہ بھائی۔۔۔ کیا اب بھی مجھے بھائی بولو گی۔“ حذیفہ نے چونکتے ہوئے کچھ حقلمی سے کہا۔

”اوہ۔۔۔ نہ۔۔۔ نہیں وہ۔۔۔ میں بھول گئی۔ وہ پہلے آپ کو۔ شاید اسی لیے یہ ہی لفظ منہ پر آ گیا۔ آپ سمانڈ کر گئے؟“ منیروہ کے لہجے میں گہرا ہنس تھی۔

”نہیں بالکل سمانڈ نہیں کیا۔ آئی انڈر اسٹینڈ۔ ابھی وقت تو لگے گارشتے کی نوعیت کو سمجھنے میں۔ کیا خیال ہے پرسوں میرے ساتھ باہر چلو گی گھومنے پھرنے۔“

”بہرہی کریں گے۔“ منیروہ کے لیے یہ بات خوش کن تھی۔ وہ بہت شوقین تھی گھومنے پھرنے کی۔ مگر اس وقت وہ پہلے کی طرح فوراً ”پر جوش انداز میں ہاں کہہ سکی۔

”میں امی سے پوچھوں گی اگر انہوں نے پریشن دی تو ضرور جاؤں گی۔“ اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”اوکے پھوپھو تو اجازت دیں گی ہی۔۔۔ بس تم تیار رہنا۔ پھر پرسوں ملاقات ہوگی۔“ حذیفہ کے انداز میں جلدی تھی۔

”جی۔۔۔ منیروہ نے ایک لفظ میں جواب دیا۔

”اچھا پھر میرے فرزند کی کال آرہی ہے۔ خدا حافظ۔“

حذیفہ نے فون بند کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے خدا حافظ کہا تو جواباً ”اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

انصر نے گاڑی ڈارک براؤن کلر کے گیٹ کے سامنے روکی تو ممتاز بیگم نے اس کی جانب دیکھا۔

”میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ سامنے والا گیٹ ہے۔“ انصر نے ان کی نظروں کا مقصود سمجھتے ہوئے بتایا اور ساتھ ہی اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ ممتاز بیگم بھی گاڑی سے نیچے اتر آئیں۔ ایک سرسری سی نظر سامنے نظر آئی عمارت اور آس پاس کے مکانوں پر

ممتاز بیگم جدی پستی رکھیں زاوی تھیں۔ انہوں نے تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ سوچا تھا کہ اپنے لٹائے پرس کی شان والے بیٹے کے لیے کسی ٹڈل کا اس گھرانے کا دروازہ کھلے گا۔ مگر آج بیٹے کی آمد کو معتبر سمجھتے ہوئے اور اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے یہ ناممکن کام بھی وہ ہنسی خوشی کر رہی تھیں۔

انصر کے دوبار ڈور تیل بجانے کے بعد دروازہ کھل چکا تھا۔ دروازہ کھولنے والی روٹی تھی۔ انصر کی نگاہوں میں فوراً ”ششاسانی کی رمتی ابھری۔ یہ وہی تھی جو اس دن طارق روڈ پر منیروہ کے ساتھ تھی اور میکرو میں بھی شاید وہی تھی۔“

”جی فرمائیے؟“ اس نے تعجب سے دریافت کیا۔

”میں انصر ہوں اور یہ میری مٹی ہیں۔ یوں دروازے سے کھڑا اپنا اتنا ہی تعارف کروا سکتا ہوں۔ بی بی! آپ ہمیں اجنبی مہمان ہی سمجھ لیں کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟“

روٹی اس پر اعتماد سے شخص کی باتوں پر الجھ سی گئی۔ اگر وہ اکیلا ہو نا تو شاید وہ اب تک دروازہ بند کر کے اندر اطلاع کرنے جا چکی ہوتی مگر اس شخص کے ساتھ کھڑی ماڈرن سی اور دھیمی مسکن والی خاتون کو دیکھتے ہوئے وہ ایسا نہ کر سکی۔

”جی جی آئیے۔“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے انہیں دعوت دی۔

انصر نے فوراً ”اندر قدم رکھا۔ ممتاز بیگم اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے داخل ہوئیں۔ روٹی انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باقی افراد کو مطلق کرنے چلی گئی ان اجنبی مہمانوں کے بارے میں۔ کچھ ہی دیر بعد کلثوم بیگم اور سہیل حیران سے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- سے بال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جزی بیوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ خودی حقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دتی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لیے آڈر بھیج کر جیٹر پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے نئی آڈر اس حساب سے بھیجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لیے = 250 روپے
- 3 بوتلوں کے لیے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آئل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ب مارکیٹ، سیکٹر فور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

”السلام علیکم یسین۔“ ممتاز بیگم فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور انکساری سے سلام کیا۔ جس کا انہیں جواب بھی ملا انصر اور سہیل نے بھی ہاتھ ملایا۔

”بیٹھے۔“ کلثوم بیگم نے کہا تو ممتاز بیگم مسکراتے ہوئے بیٹھ گئیں۔ وہ دونوں ہال بیٹھا بیٹھ چکے تو ممتاز بیگم شیریں آوازیں گویا ہوئیں۔

”یسین! اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہم آپ لوگوں کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ مگر میں آپ کو زیادہ دیر بتس میں رکھنا نہیں چاہوں گی میں ان فیکٹ آپ کی بیٹی سے ملنے آئی ہوں۔ بلکہ اس کے لیے سوالی بن کر آئی ہوں۔“

”جی۔“ کلثوم بیگم نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سہیل کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

”میرے شوہر کامیاب بزنس میں ہیں۔ ہم لوگ دفینس میں رہتے ہیں۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا میڈیٹھ ہے۔ یہ چھوٹا ہے انصر۔۔۔ پچھلے کچھ سالوں سے انگلینڈ میں تھا۔ ابھی حال ہی میں واپس آیا ہے اور

میری شدید خواہش ہے میں اس کی شادی کر دوں۔ لڑکیاں تو بہت دیکھیں مگر بیٹے کو کوئی پسند نہیں آئی۔ اس نے آپ کی بیٹی میرو کو نہیں دیکھا ہے اور یہ اس سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو

ہمارے بارے میں آئی میں فیملی کے بارے میں تحقیق کر داسکتے ہیں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ رشتہ اس طرح مانگا جاتا ہے۔ کوئی جان پہچان بھی نہیں۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ کسی رشتہ کروانے والی کو درمیان

میں لے آؤں مگر پھر خیال آیا اس طرح معاملہ لٹک بھی سکتا ہے اور خواجہ خانہ میں تیسرے بندے کو کیوں لایا جائے کسی لیے میں خود آئی ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں

گی کہ آپ آج ہی ہال کہہ دیں آپ کو پورا حق ہے کہ آپ اطمینان سے سوچیں، سمجھیں اور پھر جواب دیں

جواب اگر پوزیٹو ہو تو بہت ہی بہتر ہے۔“ کلثوم بیگم کے تاثرات کو جانتے ہوئے ممتاز بیگم

نے بات مکمل کی۔

”مگر اس طرح کیسے؟ آپ نے تو میری بیٹی کو دیکھا بھی نہیں ہو گا۔“ کلثوم بیگم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”میں آپ کی بیٹی کو ہی دیکھنے آئی ہوں ویسے مجھے اپنے بیٹے کی پسند پر پورا اعتماد ہے اور بیٹے کو بھی ساتھ لائی ہوں تاکہ آپ بھی دیکھ لیں۔ میرے بیٹے نے

آکسفورڈ یونیورسٹی سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی اعلا تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ کی بیٹی کہاں ہے لو انہیں گی جھ سے؟“ ممتاز بیگم نے اپنا نیت آمیز انداز میں پوچھا۔

”آں۔۔۔ ہاں میں ابھی اسے بلاتی ہوں۔“ کلثوم بیگم اٹھتے ہوئے بولیں۔

ڈرائنگ روم سے کچن تک آنے کئی طرح کے خیال ان کے ذہن کو چھو گئے کہ اگر لڑکا خود آیا ہے اور میرو کو جانتا بھی ہے تو کیا میرو بھی۔۔۔ مگر ان کا دل نفی میں جواب دے رہا تھا۔

”روٹی چائے بن چکی ہے تو میرو کے ہاتھ بھجواؤ اور ہال چائے کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی رکھ دو۔“

کچن کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے روٹی کو بلیات دیں اور خود میرو کے کمرے میں آئیں۔ وہ بیڈ پر آلتی پالتی مارے ڈانچت پڑھنے میں محو تھی۔

”میرو! صبح سے منہ بھی دھو یا ہے یا نہیں۔۔۔ چلو اغو فریش اپ ہو اور کپڑے چنج کر کے ڈرائنگ روم میں آؤ کچھ مہمان آئے ہیں۔“ انہوں نے کچھ ڈپٹنے کے سے انداز میں کہا تو میرو چونک کر متوجہ ہوئی۔

”کون مہمان آئے ہیں؟“ اس نے بے زار سے لہجے میں پوچھا۔

”جو بھی ہیں يتم آجاؤ۔“ کلثوم بیگم نے حکمہ انداز میں کہا اور واپس ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ سہیل اور انصر آپس میں باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔

میرو رانی گھٹینے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ انصر کے لبوں پر ہلکا سا مسم پھیلا تھا اسے دیکھ کر

سفید اور آسمانی رنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ بہت ساہ اور بے نیاز لگ رہی تھی۔ آسمانی رنگ کا سفیفون کا ڈیڑھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں سر پر اوڑھ رکھا تھا۔

سیاہ بالوں کی ابھی سی لٹ دائیں گال پر بے ترتیبی سے جھول رہی تھی۔

”یہ میری بیٹی ہے میرو۔“ کلثوم بیگم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”بشاء اللہ دیری کیوٹ۔۔۔ ادھر آؤ! بیٹی بیٹھو!“ ممتاز بیگم نے شیریں لہجے میں کہتے ہوئے ساتھ رکھے منگل صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مہمان خاتون کے دیکھنے اور بولنے کے انداز سے میروہ کو اندازہ ہو ہی گیا کہ وہ کس نوعیت کے مہمان ہیں۔ جو نمی انصر پر نظر پڑی وہ خاصی حیران ہوئی۔ وہ اسے پہچان چکی تھی اور اپنے ڈرائنگ روم میں پہلی بار اس کی موجودگی پر چونک چکی تھی۔ ”یہ یہاں کہاں؟“ حیرانی سے سوچتے ہوئے وہ طوعاً کرہاً صوفے پر بیٹھ گئی۔

تاہم ہل ہی دل میں کافی کوفت زدہ بھی تھی۔

”اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“ ممتاز بیگم نے سابقہ لہجے میں پوچھا۔ ملکی اور غیر ملکی ٹرانسپورٹ کے درمیان فرق پر سہیل کے ساتھ بحث کرتے ہوئے انصر کے کان بھی ادھر کو متوجہ ہوئے۔

”جی میں برائیسوٹ کالج میں لیکچرار ہوں مہتمس کی۔“ اس نے مینٹی سے انداز میں جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔ دیری گڈ۔۔۔ آپ نے مہتمس میں ماسٹر کیا ہے؟“

”جی۔“ ایک لفظی جواب دے کر وہ خاموش ہو گئی۔

وہ پھر سے کلثوم بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں جو چائے کا کپ ان کی طرف بصرہا رہی تھیں۔

”میروہ! تمہاری دوست کافون سے سن لو۔“ روٹی نے آکر اطلاع دی تو دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے وہ جلدی سے اٹھ کر چل دی۔ انصر کو ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں ہمار اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہو گئی ہو۔ اب باتوں میں پہلے سے زیادہ روانی آ

گئی۔

”اچھا یسین! بہت وقت لیا آپ لوگوں کا۔۔۔ مگر بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔۔۔ آپ کی بچی مجھے بہت پسند آئی ہے اور میری شدید خواہش ہے میروہ ہی میرے انصر کی لہسن بنے۔ آپ لوگوں کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہے۔ میری صرف درخواست ہے کہ جواب ہال میں ہوا بیٹے کو میں اسی لیے ساتھ لائی تھی تاکہ آپ لوگ دیکھ لیں۔“

چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ممتاز بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ باقی افراد بھی اپنی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی، جو بھی ہو بہتر ہو!“ کلثوم بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ الوداعی کلمات کے بعد وہ لوگ گیٹ سے باہر آ گئے۔



کلثوم بیگم نے جب یہ بات عباس احمد اپنی ساس اور دیگر افراد تک پہنچائی تو سب نے ہی سنجیدگی سے اس رشتہ پر غور کرنا شروع کر دیا۔ عباس احمد کے کہنے پر سہیل نے انصر اور اس کی فیملی کے بارے میں چند ضروری تحقیقات بھی کر لیں۔ سب کچھ قابل اطمینان اور تسلی بخش تھا۔ اس دوران ممتاز بیگم نے بھی فون کے ذریعے اصرار جاری رکھا۔ بالآخر سب نے ہی اس رشتے کو قبول کر لیا۔ سب کے باہمی فیصلے کے بعد جب میروہ کو اطلاع دی گئی تو وہ ایک دم پھرجی۔

”ای! لیہ سب آپ لوگ کیا فیصلے کرتے پھر رہے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ پھر آئے روز یہ سلسلہ کیوں شروع کر دیتی ہیں۔“

”ہیلے بھی اتنے اچھے اچھے رشتے آئے۔ تم نے کوئی نہ کوئی جواز نکال کے انکار کر دیا۔ ہم نے بھی اصرار نہیں کیا۔ سوچا وقت کے ساتھ سمجھ آجائے گی آخر کس بات کا سوگ منارہی ہو تم جس کا کوئی سرپرست ہی نہیں۔ لوگوں کی شادیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ نکاح ٹوٹ جاتے ہیں، تمہاری منگنی ہی تو تولی ٹکون سی قیامت

ای۔ اب وہ یہیں تو کوئی بھی نہیں۔ آخر کس کو سزا دے رہی ہو تم۔ کسی کو بھی نہیں۔ صرف خود کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو! زندگی میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ کئی آزمائشیں آن پڑتی ہیں۔ اب یہ تو نہیں کہ حوصلہ ہار کے بیٹھ جاؤ۔ ایک زخم کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہو اور باقی ہر رشتے، ہر خوشی سے منہ موڑ لو۔ ایک در بند ہو جائے تو صرف اسی کی دلیز کو کتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دروازے اور دروازے کھل رہے ہوتے ہیں۔ چند سالوں بعد لوگ بھی طعنہ دیں گے کہ لڑکی کو بوزھی کر دیا۔ دیکھو بیٹا ہم تمہارے ماں باپ، بھائی، کیا ہماری کوئی حیثیت نہیں، کیا ہم تمہارا برا چاہ سکتے ہیں صرف اس ایک شخص کے لیے زندگی کی باقی رعنائیوں اور خوشیوں سے منہ موڑ لیتا بھی زندگی کی سخت ناقدری ہے۔

یوں تو کلثوم بیگم اکثر اوقات ہی اسے سمجھاتی رہتی تھیں۔ مگر اس بار کچھ زیادہ ہی تلخ ہو رہی تھیں۔ مزید چپ چاپ آنکھوں میں بے بسی لیے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ کلثوم بیگم کی متابہ چین ہو گئی۔

”دیکھو میری جان! تمہاری یہ اداسی زندگی میں چھائی تو طبیعت اور ویرانی اب دیکھی نہیں جاتی۔ ابھی تک میں نجائے لیے تمہارے باپ کو پھنسل کرتی آئی ہوں ورنہ وہ تو کب کا تمہیں بیاہ چکے ہوتے مگر میں چاہتی ہوں تم اپنی خوشی سے نئی زندگی کا آغاز کرو۔ اگر تم سب کو ایک جیسا گردانتی ہو تو یہ حفاقت ہے اور میں نہیں چاہتی یہ حفاقت تمہارے لیے پیچھا توا بنے۔ اور کسی یہ نہیں تو اللہ پر یقین رکھو۔ کیونکہ اللہ نا انصافی نہیں کرتا۔“

بات مکمل کر کے کلثوم بیگم نے لمبی سانس کھینچی۔ ان کی ان سب باتوں کے دوران مزید موم کی طرح پھل رہی تھی۔ ماپوسی اور اٹل بننے کی دیوار اس نے اپنے ارد گرد تعمیر کرنی شروع کر دی تھی وہ لڑنے لگی تھی۔ اس کے اندر درازیں پڑ رہی تھیں۔

”ای جان! پہلے بھی میں نے آپ لوگوں کی رضا پر سر جھکایا تھا۔ مگر سوائے رسولی اور نارسائی کے

میرے پاس کچھ نہیں آیا۔ اب بھی میں آپ لوگوں کے فیصلے کو قبول کرتی ہوں۔ کیونکہ میں۔۔۔ میں اللہ سے پاپس نہیں ہوں۔“

شکتہ لہجے میں بولتے ہوئے وہ کلثوم بیگم سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کلثوم بیگم کے آنسو بھی چھلک پڑے۔ اپنی بیٹی کا دکھ وہی تو جانتی تھیں۔

”مس ماہم! مسٹر شمشاد رضوی والی فائل لے کر میرے کمرے میں آئیں۔“ انٹر کالم پر اس نے مصروف سے انداز میں سیکرٹری سے کہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ فائل لیے کمرے میں تھی۔

”بیٹھ جائیں آپ۔ فائل ادھر دیں۔“ اس نے سابقہ انداز میں کہتے ہوئے ماہم کے ہاتھ سے فائل لی۔ وہ سامنے رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔

”مس ماہم! یہ آپ نے کراس نہیں کیا ان میٹنگز کو جو ہو چکی ہیں اور ان کے ساتھ جو ڈیٹنگز ہو چکی ہیں۔ وہ کانڈزات کدھر ہیں؟“ فائل کے صفحے اٹھتے ہوئے اس نے کچھ ناگواری سے کہا۔

”اوہ سوری سر۔۔۔ مجھے یہ کانڈزات پن اپ کرنے یاد ہی نہیں رہے فائل کے اندر رہی ہیں سر۔“

”پلیز مس ماہم! آپ جائیں۔ میں اس فائل کو دیکھ لیتا ہوں۔“ وہ کچھ کنفیوز سا ہو کر بولا۔

ماہم کے گلانی ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری جسے اس نے نچلا لب دبا کر چھپایا اور ایک ادائے دلربائی سے باتوں کو جھکا دیتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔ اس کے بال حذیفہ کے چہرے سے ٹکرائے تھے۔ حذیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اوکے سر۔۔۔ میں جاری ہوں۔“ مترنم سے لہجے میں کہہ کر وہ آفس سے نکل گئی۔ لمحہ بھر کے لیے حذیفہ بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر فائل کی طرف متوجہ ہوا۔

اس رات جو نمی وہ لٹنے کے لیے سیدھا ہوا، موبائل پر میسج کی ٹون بجی۔ اس نے موبائل لیا۔ اس کی سیکرٹری ماہم کے نمبر سے میسج تھا۔ گڈ نائٹ کا میسج دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

”نجانے کیوں اسے محسوس ہوتا تھا ماہم اسے غیر ضروری اہمیت دیتی ہے۔ ہر روز صبح وہ اس کے آفس میں نافذ پھول گلہ ان میں سجاتی تھی پھول اپنے کھر سے لے کر آتی تھی۔ اکثر آفس میں معمولی معمولی باتوں کے لیے اس کے کمرے کے چکر لگا رہی ہوتی اور بعض اوقات ذاتی معاملات کو بھی ڈسکس کرنا شروع کر دیتی۔ بغیر دریافت کیے ہی۔“

حذیفہ کو معلوم تھا کہ وہ لوگ دو ہمیش اور ایک بڑا بھائی ہے، جو بیرون ملک چھوٹا مونا ٹام کراس ہے۔ باپ نے میڈیکل اسٹور کھول رکھا ہے۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ ڈنل کلاس گھرانے کی پرورہ ہے مگر اس کا لباس چال ڈھال، انداز و اطوار خاصے ماڈرن اور امیرانہ لگتے تھے۔ یہ تضاد حذیفہ کے لیے ناقابل فہم تھا۔ اس وقت وہ غیر ارادی طور پر اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

پہلی کی طرف آیا۔ میمونہ بیگم اس کا ہاتھ لگا چکی تھیں۔

”اوہ۔۔۔ تو آج بھائی جان منگیتر کے ساتھ چھٹی گزاریں گے۔ مگر بھائی جان! امیرہ تو بہت شرمیلی سی ہے۔ آپ نے ایک بھی رومینٹک جملہ بولا تو وہ بے ہوش ہو جائے گی۔“ لاؤنچ میں بیٹھی سنڈے میگزین دیکھتی تازہ نے فوراً ٹٹری دی۔

”فکر نہیں کرو، نہیں ہونے دوں گا بے ہوش تمہاری کزن کو۔“ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے حذیفہ نے کہا۔

تقریباً پونے ایک بجے وہ پھوپھو کے گھر پہنچا تھا۔ دروازہ یہیں نے کھولا۔ سامنے برآمدے میں تخت پر داوی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مودیانہ انداز میں انہیں سلام کرنے کے بعد وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ دائیں سائیڈ والا کمرہ جو کہ انہوں نے لاؤنچ کے طور پر سیٹ کیا ہوا تھا وہاں سے منیرہ اور معین کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کلثوم بیگم بھی کچن سے نکل آئیں۔ بہت پار سے جھپٹے کو ملیں۔ اسی وقت منیرہ معین کا منہ چڑائی کرے سے نکل رہی تھی۔ سامنے حذیفہ کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ساکت سی ہو گئی۔ پھر اچانک سلام کرنے کا خیال آیا۔ سلام کا جواب ملتے ہی وہ جھپٹاک سے کمرے میں چلی گئی۔ کلثوم بیگم فوراً اس کے پیچھے آئیں۔

”منیرہ! یہ کیا پچھتاہ ہے؟ تمہیں معلوم تھا کہ حذیفہ نے اتنا ہے تمہیں لینے۔ پھر ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں۔“ وہ تیوری چڑھا کر آواز دیا کر بولیں۔

”ای جان۔۔۔ وہ مم۔۔۔ میرے ایگزٹران ان کی تیاری نہیں کرنی۔“ وہ زرب منمنائی۔

”کچھ نہیں ہوتا ایگزٹرام کو۔۔۔ دن رات کتابوں میں گم ہوتی ہو، ابھی بھی تیاری نہیں ہے۔ دیکھو وہ آج پہلی بار تمہیں لینے آیا ہے۔ یوں مت کرو۔ ایسے ہی اس کا دل برا ہو گا۔ جاؤ جا کے جلدی سے تیار ہو!“

کلثوم بیگم نے کچھ حکم مہانداز میں سمجھایا تو وہ سر جھکا کر تیار ہونے چل دی۔

مخصوص چائے لے کر آئی ہوں۔“

سی گرین کلر کے کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس بیچنگ جو اپنے لمبے بالوں کو فولڈ کر کے پونی میں جکڑے وہ تیار ہو کر باہر نکلی۔ اس نے صرف کپڑے ہی بدلے تھے میک اپ برائے نام بھی نہیں کیا تھا۔ صرف آنکھوں میں کاجل کی دھار ڈالی تھی اور اسے سے ہی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ منیرہ کو دیکھ کر وہ بھی چونک سا گیا۔ صرف کپڑے تبدیل کرنے سے اس پر نیا نکھار اور روپ آ گیا تھا۔ کلثوم اور معین انہیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ دوپٹہ اچھی طرح سر پر بجاتے ہوئے منیرہ ڈرائیونگ سیٹ کے پلو میں بیٹھی۔ حذیفہ اسے سی ویو کی طرف لے آیا۔ سمندر کی بل کھاتی لہرائی موجوں کی وہ دیوانی تھی۔ سو بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

”آہ۔۔۔ آج میں نا آپ بھی! پانی کی لہروں کے چھچھے بھاگتی وہ حذیفہ کا پاؤں چھتے ہوئے بولی۔ حذیفہ بھی چھپچھا چلا گیا۔

آج وہ منیرہ کو منگیتوں والے انداز میں دیکھ رہا تھا مگر بجائے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا منیرہ اس کے اور اپنے درمیان قائم ہونے والے اس نئے رشتے کو فراموش کیے ہوئے ہے یا پھر اس کی عمری ایسی تھی جس میں بے نیازی بے ساختگی اور معصومیت تھی۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ کوئی شوخ دھڑکتا ہوا جملہ اس کے لیے بولے مگر زبان پر آتے آتے رہ گیا۔

آج ایک دم اسے احساس ہوا تھا کہ عمر کا تفاوت اور جو ناتواپیلے تھا ان کے درمیان اس کا اثر اتنی جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اسے بھی اس وقت وہی منیرہ یاد آ رہی تھی جو اسے شادی اور نازی کی طرح لگتی تھی۔ جسے وہ ٹانیاں اور چاکلیٹ دیا کرتا تھا۔ جو بھائی بھائی کہتے اس کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ آج وہ گریزنا تھی کبھی جھجکتی تھی، کبھی ابھکتی تھی۔ بات کرتے ہوئے سوچتی تھی۔ حذیفہ کی آنکھوں میں نہیں دیکھا رہی تھی۔ مگر خوش اور مطمئن ضرور لگ رہی تھی۔

حذیفہ کو یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے ہنسی خوشی اس نئے بندھن کو قبول کیا تھا۔

چند گھنٹے سی ویو پر گزارنے کے بعد وہ اسے ساحل پر بنے ہوٹل میں لے آیا۔ اس نے کھڑکی کے پاس والی نیبل منتخب کی تھی۔ ویٹر کو مینیو کارڈ سے کھانا سرو کرنے کا کہہ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ خاصی کنفیوزی ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد گہری نظروں سے اسے تنکرا رہا۔ منیرہ کی جھکی پلکیں لرزنے لگی تھیں۔ ہونٹ بھی کپکپانے لگے۔ گالوں پہ حیا کی لالی جھلکنے لگی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو!“ حذیفہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ بس دیکھ کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد ویٹر کھانا سرو کرنے لگا۔ حذیفہ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا مگر منیرہ کا وہ بیان کھانے میں تھا۔ وہ ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔ اندر سے کافی گھبراہٹ رہی تھی۔ اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ بچ کر نا خوشگوار تو تھا ہی مگر وہ اتنی بولڈ نہیں تھی کہ برا اعتماد ہو کر اس موقع کو انجوائے کرتی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”کیا اتنی جلدی؟ تم نے تو کھانا بھی برائے نام کھایا ہے۔“ حذیفہ نے اس کی بات پر حیران سا ہو کر کہا۔

اس کا بیانی لال لال گھر جانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے کی کمپنی میں کچھ کنفیوز تھے تاہم وہ اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔

”میں نے پیپر کی تیاری بھی کرنی ہے۔ وہ معین تو نجانے کتنا پڑھ چکا ہو گا۔ پلیر مجھے گھر چھوڑ دیں۔“ اس نے اصرار کرنے کے انداز سے حذیفہ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں ہے بس مجبوراً ہی ساتھ ہے۔

”ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ یہ کھانا تو ختم کرو، چلتے ہیں۔“ حذیفہ نے تجویز کی تھی۔

”میں نے بس کھالیا آپ کھالیں پھر چلتے ہیں۔“ منیرہ کو ایک دم احساس ہوا کہ اس نے تو اس کے کھانا

کھانے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ واپسی پہ حذیفہ بھی چپ چاپ ہی رہا۔



آج وہ نئی فیکٹری کی کنسٹرکشن کا کام دیکھنے گیا تھا۔ واپسی میں وہ شمشاد ضوی کے آفس رگ گیا۔ جس میں ایک گھنٹے کی میٹنگ تھی۔ اس کی سیکرٹری ماہم بھی اس کے آنے تک وہاں پہنچ چکی تھی۔ جب میٹنگ ختم ہوئی تو وہ دونوں ایک ساتھ وہاں سے نکلے۔ ماہم کو آفس کی گاڑی چھوڑ کر گئی تھی۔ لہذا اس وقت حذیفہ نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی آفر کی جسے اس نے بلا جھجک قبول کیا۔

”سر! یہ تو بچ نام شروع ہو چکا ہے۔ آج میں گھر سے لے بھی نہیں لائی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم یہاں کسی ہوٹل میں بچ کر کے آفس چلتے ہیں۔“ کلائی یہ بندھی گاؤلڈن رسٹ وایج کو دیکھتے ہوئے اس نے ایسے انداز میں کہا کہ حذیفہ کو انکار کرنا مشکل ہی لگا۔

تھوڑا آگے جا کر ایک اچھے ہوٹل کے سامنے اس نے گاڑی روکی۔ ماہم چپکٹی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ گاڑی سے اتر کر آگے کو بڑھی اور بڑے برا اعتماد انداز میں حذیفہ کے سامنے والی چیئر پر بیٹھی تھی۔ ویٹر مینیو کارڈ لے کر آیا۔

”برن مصالحہ، تنکے، ٹان اور سر آپ کیا لیں گے؟“ اپنے لیے بتا کر اس نے کارڈ حذیفہ کی جانب بڑھایا۔ حذیفہ نے اپنی پسندیدہ ڈشز بتائیں۔

”سر! کوئی بات کریں نا۔“ چند ٹانے بعد وہ بولی۔ حذیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

رائل بلو لاناگ شرٹ سفید دوپٹے کو گلے میں ڈالے، ہلکی پھلکی میچنگ جیولری اور میک اپ میں وہ ہمیشہ کی طرح بولڈ اور برا اعتماد لگ رہی تھی۔ مگر آج اس کی سبز آنکھوں میں سرور سا تھا۔ حذیفہ اس کی آنکھوں سے نظر چرا گیا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں جو پیغام دیتی تھیں حذیفہ وہ کافی دن پہلے پڑھ چکا تھا مگر توجہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

”مس ماہم! ابھی لٹچ نا تم ہے۔ ابھی آفیشلی کوئی بھی ضروری بات نہیں ہو کی جائے۔“ اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔ ماہم بے ساختہ ہنس پڑی۔ کھنکھتی مترنم سی ہنسی۔

”سر! کیا ضروری ہے ہم ہر وقت آفیشلی گفتگو ہی کریں۔ کیا کوئی اور باتیں نہیں کی جاسکتیں؟“ اس کا سوال ناز بھر اور لہجہ کھنکھاتا ہوا تھا۔

”ایک پاس اور سیکرٹری کے درمیان جو آفیشلی رشتہ ہوتا ہے اسی کی حدود میں رہ کر بات کی جاتی ہے۔“ حذیفہ نے سابقہ انداز میں کہا۔

”سر! حدود بڑھائی بھی جاسکتی ہیں اور کم بھی کی جاسکتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس کی بات پر وہ چونک کر بولا۔

”کچھ نہیں سر۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

کھانا سرو ہو چکا تھا۔ دونوں کھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

حذیفہ کے ذہن میں کل لٹچ آ گیا۔ جو منیرہ کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کس قدر کنفیوز اور گھبراہٹی ہوئی تھی۔ نظر تنک نہیں ملا رہی تھی۔ کھانا بھی حذیفہ نے ہی انتخاب کیا تھا۔ اس نے کچھ بھی خود سے نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے پر بھول پن تھا۔ گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ ہونٹ سی لگ رہی تھی۔ حذیفہ نے اراداً کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ وہ اور نزوس ہوتی۔ کھانا بھی اس نے برائے نام ہی کھایا تھا۔ آج کا دن اس کے بالکل برعکس تھا۔

آج بھی اس کے سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ جو کل کی لڑکی سے بالکل مختلف تھی پر اعتماد بولڈ، کچھ شوخ، کچھ بے باک اس نے بلا جھجک ویٹر سے مینیو کارڈ لیا تھا اور اپنے پاس کے سامنے بیٹھی وہ ذرا بھی نزوس نہیں تھی بلکہ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ ان لمحات سے خوشی محسوس کر رہی ہے۔ وہ حذیفہ کی خاموشی کے باوجود خود ہی بولتی جا رہی تھی۔ کل والی لڑکی حذیفہ سے شرمنا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا پاری تھی مگر آج والی لڑکی سے

وہ خود آنکھیں چرا رہا تھا۔ وہ اپنی سبز چمکتی آنکھیں بڑے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں ڈالے باتیں کر رہی تھی۔ وہ خود ہی ہنس رہی تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ کھارہی تھی۔ یہ بات حذیفہ نے محسوس کی۔ حذیفہ اس سے پہلے کھانے سے فارغ ہو گیا۔ مگر اس کی باتیں اور کھانا جاری تھا۔

چاقو ختم کرنے کے بعد جب حذیفہ اٹھا تو اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج کا چاقو کل کے چاقو سے زیادہ اچھا گزرا۔ اگرچہ کل کا چاقو ارادو تھا جبکہ آج کا چاقو غیر ارادی اور غیر متوقع تھا۔ اگرچہ آج وہ خاموش اور بے نیاز رہا پھر بھی اسے محسوس ہوا، آج کے پارٹنر نے بور نہیں ہونے دیا۔

اگلے دن جب وہ اپنے آفس آیا تو ہمیشہ کی طرح ہر چیز صاف تھری اپنی جگہ پر ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ آج بھی چھوٹی سائیز ٹیبل پر گلدان میں پھول رکھے ہوئے تھے۔ مگر آج پھول مختلف رنگوں کے بجائے صرف ایک ہی رنگ میں تھے۔ سرخ گلاب۔ ترو تازہ مہلتے گلابوں کا کچھ بہت دلچسپ لگ رہا تھا۔ حذیفہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔ وہ اپنی کرسی پر آن کر بیٹھا اور لپ ٹاپ کھول لیا۔

یونی اوہر اوہر نظر گھماتے اس کی نظر سائیز ٹیبل پر پڑی جہاں گلدان کے سامنے ایک اسٹائن سکارڈ رکھا تھا۔ اس نے کچھ تجسس ہو کر کارڈ اٹھایا۔ کارڈ کی بیک سائیز پر پڑے اسٹائن انداز میں اس کا نام لکھا گیا تھا۔ درمیان میں بڑا سا۔

”آئی لو یو۔“ لکھا ہوا تھا اور نیچے ماہم کے سائن تھے۔ چند ٹائپس کو وہ ہکا بکارہ گیا۔ اور پھر انٹر کام پر اس نے ماہم کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اپنے مخصوص پراعتماد انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے لبوں پر طبعی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخی۔

”مس ماہم! یہ سب کیا ہے؟“ بولتے ہوئے اس کے لہجے میں کوئی غصہ، کڑی یا درشتی نہیں تھی۔

”سر! وہی جو آپ کو نظر آ رہا ہے! اس کا اطمینان قابل دیدہ تھا۔“

”آپ لو ان فرسٹ سائٹ پر یقین رکھتے ہیں؟“ اس کا لہجہ دل میں اتر جانے کی حد تک شیریں اور معصوم تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں میں ایسی خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولا۔

”سر! میں تو رکتی ہوں جب میں نے پہلے دن آپ کو دیکھا تو میرے دل نے مجھے مشکل دے دیا کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کا مجھے انتظار تھا اور۔۔۔“

”اوشٹ اپ مس ماہم! آپ ہوش میں ہیں۔ آپ جانتی ہیں یہ ساری باتیں آپ کس سے کہہ رہی ہیں۔“ وہ اس کی بات کانٹے ہوئے چیز پر سے گھڑا ہو گیا۔

”لیس سر۔۔۔ میں پورے ہوش و حواس میں ہوں سر میں جذبات کو چھپانے کی قابل نہیں ہوں۔ سانا آپ میرے پاس ہیں۔ لیکن پہلے انسان ہیں۔ سر شاید میں یہ بات آپ سے چھپائے رکھتی مگر پھر خیال آیا کہ اگر نارسانی ہی مقدر ہے تو یہ پچھتاوا تو نہیں رہے گا کہ میں اظہار بھی نہ کر سکی۔“ حذیفہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بہت رمان سے بول رہی تھی۔

”مس ماہم! بات کتنی نہیں یہ ہی میں انسانوں میں بخوارے کا قائل ہوں۔ مگر میں انکے جعد ہوں۔ کچھ عرصے بعد میڈ ہو جاؤں گا۔ لہذا آپ اپنے جذبات کو سنبھالیے اور آفس میں صرف کام سے لگاؤ رکھا کریں۔“ اس کا لہجہ نرم تھا اگرچہ الفاظ میں تناؤ تھا۔

”مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ آپ کسی اور کو لائیک کرتے ہیں یا انکے جعد ہیں۔ میں نے تو صرف اپنے دل کی بات کی ہے۔ میرے لیے اتنی سی کافی ہے کہ آپ مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں۔“ نظریں جھکا کر اس نے جیسے اعتراف جرم کیا۔

”اوکے جائیے اب۔“ حذیفہ کوئی الحال یہ ہی

مناسب لگا۔ اس کے جانے کے بعد کتنے لمحے وہ اسے ہی سوچتا رہا۔ حذیفہ کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی سبز آنکھوں کا جاوہ اس کا حصار کر رہا تھا۔ وہ اس کے بے باک اظہار محبت کو نظر انداز نہیں کر رہا تھا۔ وہ کواجو کیشن اداروں میں پڑھا تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی ملی تھی۔ مگر آج تک کسی کے ساتھ ایفیس نہیں چلا تھا۔ اب تک اس کا مقصد اس کی تعلیم اور یہی پڑ رہا تھا۔ وہ اس قدر شریف محتاط اور ریزرو رہا تھا کہ کبھی کسی لڑکی نے خود سے اسے دوستی کی آفر کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی ٹی میل دوست بنائی بھی نہیں تھی۔ منہرہ سے اس کی منگنی رواجی خاندانی رضامندی سے ہوئی تھی اس نے بنا کسی اعتراض کے قبول کیا۔ مگر یہ جو کچھ آج اس نے سنا تھا۔ اس کے خیالات منتشر ہونے لگے تھے۔

”محبت۔۔۔“ اس کے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اس سے اظہار محبت کرے گی۔ وہ اس کے انداز اور آنکھوں کی تحریر کئی دنوں سے نظر انداز کر رہا تھا یہ سوچ کر کہ یہ مغربی اطوار والی لڑکی شاید اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ مگر آج اس نے سچائی اور کمال معصومیت سے اپنے دل کی حالت بتا کر اسے اپ سیٹ کر دیا تھا۔

شام کو آفس سے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر نکلا پارکنگ ایریا سے گاڑی نکال کر سڑک پر کیا تو سڑک کے کنارے وہی کھڑی تھی۔

”مس ماہم! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔“ اس نے گاڑی اس کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔

”سر! وہ ڈرائیور جو مجھے گھر چھوڑنے جاتا ہے اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ آج وہ جلدی چلا گیا۔ اس نے وجہ بتائی۔“

”آئیے۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ کہاں جانا ہے آپ کو؟“ فوراً ”فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔“

اور پھر اکثر یہ ایسا ہونے لگا۔ کبھی دونوں بچ ایک

ساتھ کر رہے ہوتے۔ کبھی حذیفہ اسے گھر ڈراپ کرنے جاتا۔ آفس میں اس کے چکر مزید بڑھ گئے تھے۔ اس کے بانی کو لیکچر میں ان دونوں کے بارے میں چہ گوئیاں شروع ہو گئیں۔ مگر ماہم کو اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی اور حذیفہ تو آج کل اس کی ہر بات سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس دوران میمونہ بیگم کے احساس دلانے پر ہی وہ دو تین بار منیہ کے ساتھ بھی آؤٹنگ پر گیا چند گھنٹوں کے لیے۔



انصر بے حد خوش تھا۔ اس نے آج تک جو چاہا پایا تھا۔ اب یہاں بھی کامیابی ملی تو وہ ہواؤں میں ہی اڑنے لگا تھا۔ جس دن سے رشتے ہوئے تھا اس نے اپنی تمام گرل فرینڈز سے رابطہ منقطع کر لیا تھا۔ سنا سے اس نے منہرہ کا فون نمبر لے رکھا تھا مگر ابھی تک اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا رشتہ بالکل سادگی سے طے ہوا تھا۔ منگنی وغیرہ کو کوئی باقاعدہ رسم نہیں ہوئی تھی۔ سادگی سے لڑکی کو انگوٹھی پر سنا دی گئی تھی۔ لہذا اس کے دوست لا علم تھے۔ رشتے دار بھی بے خبر تھے سوائے چند ایک کے۔ مگر وہ اس قدر خوش تھا کہ خود فون کر کے اپنے تمام دوستوں کو بتا رہا تھا۔ یونی باری باری سب کو بتاتے ہوئے اس نے حذیفہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہائے بڑی مین! ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ اس نے سابقہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ یہ بتاؤ انگلیٹنڈ واپس کب جا رہے ہو؟“ حذیفہ نے برائے بات پوچھا۔

”یار! بتایا تو تھا کہ اب ارادہ کینسل کر دیا۔ بھول گئے کیا۔ اب میں۔۔۔ برنس میں انٹر سٹ لیتا شروع کر رہا ہوں۔ اس وقت اپنے آفس میں ہوں اور انگلیٹنڈ اب نہیں جاؤں گا کیونکہ میری ہونے والی وائف خاصی محب وطن ہے، وہ انگلیٹنڈ جانا نہیں چاہتی اور میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔“ انصر نے تفصیل بتائی۔

ہو گئی ہے۔ حذیفہ نے حیران ہو کر پوچھا۔
 ”جی جناب! اب میں بھی میڑ ہو جاؤں گا کیونکہ منیہ مان گئی۔“ انصر کے بتانے پر دوسری طرف چند ٹانگیں خاموشی چھائی رہی۔
 ”منیہ سے تمہاری ملاقات ہوئی؟“ کچھ لمحوں بعد ماؤ تھ پیس پر حذیفہ کی شکستہ سی آواز ابھری۔
 ”نہیں یار! ابھی تک ہماری کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی۔ بس گھر والوں نے ہی سب طے کیا ہے۔ یار! میں سوچتا ہوں میں بہت لکی ہوں، ہمیشہ بن مانگے سب کچھ ملاحتی کہ وہ لڑکی بھی مل گئی جس کی میں نے آرزو کی بغیر کسی ظالم سماج کے اور بغیر کسی رقیب روسیاء کے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔“
 ”بھئی۔ ظالم سماج اور رقیب تو وہاں ہوتا ہے جہاں دو پیار کرنے والے ہوں۔ یک طرفہ معاملہ ہو۔ جیسے تم تو اسے محبت کرنے لگے ہو مگر اس کے ساتھ ممکن ہے کوئی مجبوری ہی ہو، میرا مطلب ہے اس نے صرف اپنے گھر والوں کی خوشی کے لیے ہی ہاں کی ہو۔ تو ایسے مرحلوں پہ ظالم سماج کم ہی ہوتے ہیں۔“ حذیفہ کی بات پر انصر چند لمحے چپ رہا۔
 ”اچھا یار گڈ لک۔ ابھی تھوڑی دیر بعد مجھے میٹنگ میں جانا ہے اسی سلسلے میں کچھ فائلز دیکھنی ہیں پھر بات کرتے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ انصر کچھ بولتا حذیفہ نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ انصر کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حذیفہ کا رویہ کچھ بدلا ہوا ہے۔ اس نے اپنے جتنے بھی دوستوں کو بتایا تھا تب ہی نے پر خوش اور بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔ جبکہ حذیفہ کے لہجے میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے سوالات کرنے کا تفتیشی انداز بھی انصر نے محسوس کیا تھا۔ حذیفہ کے پوچھنے پر ہی اسے بھی خیال آیا تھا کہ منیہ نے کیونکر یہ رشتہ قبول کیا۔ ابھی تک وہ صرف اتنا ہی اسے جانتی تھی جتنا اسے بتایا گیا تو کیا اس نے صرف مشرقی باجی لڑکی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ماں باپ کی بات مانی تھی۔ یہ ہی سوچتے ہوئے اس نے منیہ کا نمبر

بلا ارادہ ڈائل کیا۔
 ”السلام علیکم۔۔۔ کون؟“ بڑے مصروف سے انداز میں پوچھا گیا۔ گویا اس کے پاس انصر کا فون نمبر بھی نہیں تھا۔ اس کی عدم دلچسپی کا نمایاں اظہار۔
 ”میں انصر پوچھنا یا مزید تعارف کروانا دے گا۔“
 ”اوہ۔۔۔ انصر صاحب۔۔۔ نہیں تجہی کوئی بات نہیں۔ آپ نے کوئی ضروری بات کہی ہے؟“ اس نے سابقہ انداز میں کہا۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”مطلب یہ کہ میں اس وقت کانٹن میں ہوں اور میرا پیریڈ شروع کر چکا ہے۔ مجھے ایک ضروری لیکچر دینا ہے اگر آپ براہ مابین تو بعد میں فون کر دیجئے گا۔“ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔
 ”نفس اوکے۔۔۔ آپ کلاس اینڈ کر لیں میں پھر رات کو فون کروں گا۔“
 ”اوکے اللہ حافظ۔“ فون بند ہو چکا تھا۔ رات تک وہ شدید انتظار کی کیفیت میں رہا وہ اس سے بات کرنے کو بے چین تھا۔
 رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں آکر کپڑے تبدیل کیے۔ ٹائٹ سوٹ میں ملبوس ہو کر وہ آرام کر رہی پریم دراز ہو گیا اور پھر منیہ کا نمبر ڈائل کیا۔ مین بائیل جانے کے بعد فون ریسپونڈ کر لیا گیا تھا۔ اس نے اس وقت بھی پہلے سلام ہی کیا تھا۔
 ”کیا کر رہی تھیں؟“ انصر نے بے تکلفی سے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں۔۔۔ ابھی نماز پڑھ کے فارغ ہوئی ہوں۔“ منیہ نے اتنے تک دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا۔ بیڈ کی پائنٹی پر پیچی اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بات کر رہی تھی۔ بے تاثر لہجے میں۔
 ”میرے فون کا انتظار کر رہی تھیں! بڑی آس سے پوچھا گیا۔
 ”نہیں۔۔۔ کیونکہ میرا خیال تھا ہمارے پاس کرنے کو کوئی خاص بات نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ انصر غلط فہم کو خاموش رہ گیا۔

دھرم میرے پاس تو تم سے کرنے کے لیے اپنی باتیں اس کے وقت کم پڑ جائے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔
 منیہ نے جیسے اس کی بات ان سنی کر دی۔ ”ایک بات چاہو اس رشتے پر خوش ہو!“
 ”ہاں خوش ہوں۔ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا گیا تھا! اس کی بات کا منیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔
 ”جب تم نے رشتے کے لیے ہاں کی تھی تو کیا سوچ کر آئی مین میرے بارے میں تو تم کچھ نہیں جانتی ہو۔“
 ”آپ بھی تو میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے پھر کیا سوچ کر رشتہ بھیجا!“ برجستہ جواب میں سوال نے انصر کو بھلا دیا۔
 ”کچھ فیصلہ دل کے ہوتے ہیں ان کی وجہ نہیں بتائی جاتی۔“ چند ٹانگیں بعد وہ گنہگار لہجے میں بولا۔ منیہ کی طرف خاموشی تھی۔
 ”کیا خیال ہے کل کہیں گھومنے نہ جائیں۔“ انصر نے ہی پھر بات کا آغاز کیا۔
 ”سوری میں ٹھیک نہیں سمجھتی منیہ کے ساتھ گھومنا۔“ اس کے بے حس لہجے نے انصر کو اچھا خاصا دھچکا لگایا۔ اس کی زندگی میں آنے والی شاید وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اس کی آفر کو ٹھکرایا تھا۔ اس کی منگیتر ہونے کے باوجود۔ ابھی نیا نیا رشتہ طے ہوا تھا۔ انصر کے اندر جذبے چل رہے تھے مگر دوسری طرف کوئی ایسی بے قراری نہ تھی۔
 ”منیہ! ہم دونوں کے مابین اب تعلق ہے اگرچہ یہ تعلق قانونی اور شرعی نہیں ہے مگر ہونے والا تو ہے۔ کیا حرج ہے اگر ہم کبھی کبھار ساتھ گھوم پھر لیا کریں آؤنگ کیا کریں۔ اس طرح ساتھ وقت گزارنے سے ہم ایک دوسرے کو انڈر اسٹینڈ کر سکیں گے۔“ اس نے قائل کرنا چاہا۔
 ”یہ شادی سے پہلے انڈر اسٹینڈنگ والی لاجب میری سمجھ سے باہر ہے۔ فرض کریں اگر ہماری انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو تو کیا آپ انکی جمنٹ توڑ دیں گے؟“ منیہ کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ میں نہیں ہوتی۔“
 تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے تو چاہ رہا ہوں کہ ہم دونوں میں ہم آہنگی ہو جائے!“ اس نے فوراً کہا۔
 ”یہ ہم آہنگی شادی کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔
 ”مگر میرا دل چاہتا ہے تمہارے ساتھ وقت گزارنے کو۔۔۔ تم نہیں چاہتیں کہ مجھے میرے مزاج میری عادات کو جان پاؤ۔ میرے ساتھ کچھ وقت گزارو!“
 ”شادی کے بعد چاہ لوں گی جب ضرورت ہوگی۔“ دو ٹوک جواب ملا۔ انصر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی منگیتر ہی سے باتیں کر رہا ہے اس کی باتوں پر اسے غصہ نہیں آیا اور نہ ہی کوئی بات ناگوار لگی مگر حیران اور کچھ پریشان ضرور تھا۔
 ”منیہ! ایک بات سچ جانتا تھا۔“
 ”تم سے زبردستی تو ہاں نہیں کروائی گئی۔“
 ”میرا مطلب ہے تم کسی اور کو تو پسند نہیں کرتی ہو!“ اس کا لہجہ پہلی بار سنجیدہ اور حساس تھا۔
 ”نہیں میرے گھر والے زبردستی کے قائل نہیں ہیں۔“
 آپ پلینر سائنڈ مت کیجئے گا۔ آپ مین امیجر نہیں ہیں اور نہ ہی میں کوئی سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہوں۔ بعض اوقات ہم کسی انسان کے ساتھ عرصے سے رہ رہے ہوتے ہیں ہمارا دعو ہوتا ہے ہم اس انسان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مگر کبھی نہ کبھی ایسی شخص کا کوئی ایسا پہلو نظر میں آ جاتا ہے کہ جو ہماری نظر سے ہمارے وہم و گمان سے بھی اوچل ہوتا ہے اور ہمارا دعو ا دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی ساتھ وقت گزارنے سے انڈر اسٹینڈنگ ہوتی ہے۔ دل بدل جائیں سوچ بدل جائے تو ذہنی ہم آہنگی پیچھے رہ جاتی ہے۔ میرے نزدیک انڈر اسٹینڈنگ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا خالصانہ ساتھ نبھانے کا عہد کریں اور اس عہد پر قائم رہیں۔“ اس کی ایک ایک بات انصر کے دل میں اتر رہی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تم سے ایگری کرتا ہوں مگر کیا تمہیں یہ حدشہ نہیں کہ اگر تمہارے انکار سے خفا ہو جاؤں یا غصے میں آجاؤں تو؟“ وہ نجالہ کیا جاننا چاہ رہا تھا۔

”نہیں مجھے ایسا کوئی حدشہ نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ایک فضول بات کو رد کر رہی ہوں جس کی کوئی ٹھوس لاجب نہیں اور میں یہ بھی جانتی ہوں اگر آپ واقعی اس تعلق میں سنجیدہ ہیں کم از کم اس بات سے انکار پر خفا نہیں ہوں گے۔“ وہ یقین سے کہہ رہی تھی۔

”کیا تمہیں میرے خفا ہونے کی پرواہ ہے؟“ لہجہ گہرے تھا۔

”بھی تو نہیں۔“ صاف گوئی سے جواب ملا۔

”اوکے شب بخیر۔ مجھے لیکچر بھی تیار کرنا ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ آٹھویں موندتے ہوئے انصر مسکرایا۔

”منیہو! اتم واقعی منفرد اور نایاب ہو اور میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ تم میری ہونے والی ہو۔“ وہ خیال میں اس سے مخاطب تھا۔

کمرے میں اوھر اوھر چکراتے ہوئے وہ مختلف تراکیب پر غور کر رہا تھا کہ وہ کس طرح منیہو سے اپنی انگلی جھٹ ختم کروائے۔ ساز یہ کار شہہ بھی طے ہو چکا تھا اور میمونہ بیگم آج کل اسی تیزی میں تھیں کہ جب دونوں کی شادی کی ڈیٹ فکس کی جائے اور جوں جوں باقی سب گھروالوں کا جوش و خروش عروں کو پہنچ رہا تھا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اگر اس سلسلے میں وہ میمونہ بیگم سے مدد مانگنے جاتا تو اسے منہ کی کھانی پڑتی۔

منیہو کو وہ بے حد پسند کرتی تھیں حتیٰ کہ اپنی بیٹیوں کو اس کی مثالیں دیتیں۔ انہوں نے اپنی سگی بھانجیوں پر منیہو کو ترجیح دی تھی۔ منہ کی بیٹی کو بہو

بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور ان کے ساتھ منہ کا پرانا ناتانہ اچھا رہا تھا کہ وہ بلاوجہ اسے دکھ نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ باپ سے کہنا بھی بے کار۔ اب منیہو ہی باقی تھی کہ وہ اس سے براہ راست کہہ دیتا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا لہذا وہ انکار کر دے مگر وہ ابھی اچھوڑ اور ناواں سی لڑکی تھی۔ کیا نہیں کس قسم کے رد عمل کا اظہار کرتی۔ وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔

ماہم جو اس کی سیکرٹری تھی اور ابتدا میں وہ اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے حواسوں پہ چھا گئی تھی اور اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے اسے یوں لگنے لگا تھا کہ اس کی ماں نے اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک نو عمر ناسمجھ شریلی سی لڑکی جسے وہ بہنوں کی طرح سمجھتا تھا اس کے ساتھ اس کی مغلّی کر دی۔ جو صرف شریاتی تھی یا نروس رہتی تھی اور اسے بھی نروس کر دیتی تھی۔ بولڈ نہیں نام کی چیز تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی معنی خیز نگاہیں کیا کرتی ہیں۔ وہ باتوں اور آوازوں کی دلربائی کو نہیں جانتی تھی۔ جبکہ ماہم یہ سب جانتی تھی۔

اسے بولڈ اور آزاد خیال لڑکیاں کبھی پسند نہیں رہی تھیں۔ مگر بیک وقت ماہم اور منیہو کے ساتھ وقت گزار کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنا بھی کنزرویٹو نہیں ہے۔ ماہم کی شہنشاہی، ادا میں عزت و اعتماد اظہار محبت پر اعتماد انداز گفتگو دل کو چھوٹی مسکراہٹیں ان سب چیزوں نے چند ہی دنوں میں اس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ سوچنے لگا تھا کہ زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے اسے ایک پر اعتماد بولڈ زمانے کے ساتھ چلنے والی لڑکی کی ضرورت ہے۔ وہ نو عمر اور حسین تھی۔ شروع میں شاید اسی وجہ سے اسے اعتراض نہیں تھا۔ مگر ماہم سے ملنے کے بعد اسے منیہو میں کئی نقص نظر آنے لگے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر فیصلے کو عملی جامہ پہنانا مشکل لگ رہا تھا۔ ”جو بھی ہے مجھے منیہو سے بات کرنی چاہیے۔ میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گا کہ ہماری جوڑی مناسب نہیں۔ لہذا وہ آگے بڑھنے کا

بہانہ بنا کر شادی سے انکار کر دے۔ اس طرح میں بھی بچ جاؤں گا اور فیصلہ میں بھی تاؤ نہیں آئے گا۔ لیکن اس بات کی گاڑی بھی تو نہیں کہ وہ مان جائے۔ خیر بات کر کے دیکھتا ہوں۔“

شش و پنج میں اس نے سوچا اور پھوپھو کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگا۔ آج اتوار تھا اور آج وہ سارا دن گھر ہی رہا تھا۔ اس وقت تین بج رہے تھے جب وہ تیار ہو کر نچے آیا۔

”کہاں جا رہے ہو بیٹا؟“ اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ کر میمونہ بیگم نے پوچھا۔ وہ اس وقت لائٹ براؤن ٹرکی شلوار قمیص میں لبوس تھا۔

”ای! میں ذرا پھوپھو کی طرف جا رہا ہوں۔ شام تک آجاؤں گا۔“

”اچھا جاؤ۔ پھوپھو کو سلام کہنا! میمونہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کاش ای ہی پھوپھو سے تھوڑی بدول ہوتیں، کوئی ان کا رواجی قسم کا تعلق ہوتا تو آج مجھے کچھ آسانی رہتی۔ یہ بھی عجیب ہی منہ بھائی ہیں۔“ سوچتے ہوئے وہ تیراج کی طرف آیا۔

جب وہ پھوپھو کے گھر میں داخل ہوا تو سب اسے سامنے برآمدے میں بیٹھے نظر آئے۔ عظمی پھوپھو بھی ادھر ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ان کے درمیان چلا گیا۔ سب ہی نے پر جوش انداز میں اسے خوش آمدید کہا۔

”منیہو کہاں ہے پھوپھو؟“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

”بٹا! وہ چھت پر ہے۔ جاؤ صغیرہ! منیہو کو بلا لاؤ؟“ اسے بتا کر انہوں نے صغیرہ سے کہا۔

”نہیں رکو۔ میں خود چلا جاتا ہوں!“ حذیفہ نے صغیرہ کو منع کیا اور خود اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔ آخری سیڑھی طے کر کے اس نے چھت پر پہلا قدم رکھا تھا اور ٹھٹھک کر گر گیا۔

سامنے منڈیر کے ساتھ منیہو کے ساتھ معجز بھی

ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ دونوں کی بات پر بے ساختہ اور بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ معجز کے ہاتھ میں نمکو کا پیکٹ تھا جس میں سے منیہو بھی لے رہی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ دونوں اسے سینٹروں پار نظر آتے تھے یونی ہنٹے کھیتے، باتیں کرتے، لڑتے جھگڑتے اور اس کی وجہ ان دونوں کی دوہری رشتہ داری ہم عمری اور ایک کلاس میں ہونا تھا۔ اس لیے وہ اکثر ہی ساتھ نظر آتے تھے۔ حذیفہ کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ منیہو کبھی یوں اس کے ساتھ بھی کھلکھلائی ہو۔ اس کے ساتھ بے تکلف ہو کر اس طرح باتیں کی ہوں یا کبھی اس کے سامنے اسی طرح پر اعتماد اور بے فکر ہو کر کھڑی ہو۔ مغلّی سے پہلے اگرچہ وہ اسے خود سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ باتیں کرتی تھی تب بھی لحاظ اور مروت احترام آڑے رہتا تھا۔ مگر مغلّی کے بعد تو اس کے سامنے بالکل چھوٹی موٹی بن جاتی تھی۔ معجز اور منیہو کو وہ اکثر ساتھ بیٹھے بڑھتے پس لگاتے دیکھتا آیا تھا مگر آج جس نگاہ سے دیکھا تھا اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ جہاں کھڑا تھا وہاں آگے ستون تھا۔ ستون کی آڑ میں وہ دونوں اسے نہیں دیکھ پائے تھے۔ وہ ان ہی قدموں واپس لوٹ آیا۔

”اوکے پھوپھو! میں چلا ہوں۔“ اس نے انتہائی سنجیدہ اور روکے لہجے میں کہا۔ برآمدے میں بیٹھے سب ہی افراد کچھ حیران ہوئے اس کے اتنی جلدی جانے پر۔

”بٹا! بیٹھو تو۔ اتنی بھی کیا جلدی۔ دیکھو منیہو نے خود اپنے ہاتھوں سے رس گلے بنائے ہیں۔ کھا کر۔“ کلثوم بیگم کی بات درمیان میں ہی لنگی رہ گئی تھی اور وہ برآمدہ کراس کر کے جا چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے باہر سے گاڑی اشارت کرنے کی آواز آئی۔ معاملہ کچھ گڑبڑ تھا۔ سب ہی نے محسوس کیا۔ گھر آکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا بغیر کسی سے بات کیے موڈ آف کیے۔ میمونہ بیگم اس کے اتنی جلدی اور آف موڈ کے ساتھ واپس آنے پر حیران ہوئی اس کے پیچھے اس کے



”بیٹا کیا کہہ رہے ہو تم؟“ حذیفہ کی بات سن کر میمونہ بیگم کے یکدم حواس ہی محفل ہو گئے۔ ششدر آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولیں۔

”جو آپ نے سنا، وہی کہہ رہا ہوں۔“ چاہا جا کے بولتے ہوئے اس کا لہجہ بھی غضب ناک تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخ تیر رہی تھی۔ گل تمنا رہے تھے۔ جھٹنے پھولے ہوئے تھے اور ہونٹ بجھنے ہوئے۔ میمونہ بیگم نے کبھی اپنے بیٹے کو اتنے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا مگر اس کی بات پر یقین کرنا ہی محال ہو رہا تھا۔

”میں نہیں مانتی کہ معیض اور منیرہ۔۔۔ وہ دونوں تو۔“

”ہاں یہی کہنا چاہ رہی ہیں نا آپ کہ وہ دونوں بچپن سے ساتھ رہے ہیں۔ ہم عمر ہیں۔ نکلاں فیروز ہیں اس لیے ان کی آپس میں زیادہ ہمتی ہے۔ مگر میں بھی یہ فرینک نیس اسی لیے انور کرتا آیا ہوں کہ میں یہی سمجھتا رہا۔ وہ جس طرح معیض کے ساتھ فرینک کی باتیں کرتی ہے، ہمتی ہے کھلکھلاتی ہے۔ اس طرح میرے ساتھ تو کبھی بھی فرینک نہیں ہوتی۔ جبکہ میں اس کا ہونے والا شوہر ہوں مگر میرے ساتھ جب ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں برس رہی ہوتی ہیں۔ میرے سامنے آنے سے کتراتے ہیں۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں اور میں بے وقوف سمجھتا رہا۔ مجھ سے شرماتی ہے۔ آج میں نے ان دونوں کو جو ناز بیا حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ سب دیکھنے کے بعد میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ منیرہ کو اپنی بیوی بنالوں۔ آنکھوں دیکھی مگر میں نکل سکتا میں۔“

بولتے ہوئے حذیفہ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ میمونہ بیگم کو اپنی ناگہان لرزتی ہوئی محسوس ہو میں اور وہ گرنے کے سے انداز میں قریب

رکے منگل صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”مم۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ منیرہ ایسی ہو سکتی ہے۔ بڑی باحیا لڑکی ہے۔ آج تک ہر ایک نے اس کی عادت کی تحریف ہی کی ہے۔ معیض سے اس کی ہنسی بھی مگر۔۔۔ کبھی کسی نے ان دونوں کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں اور اگر وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارے ساتھ منسوب ہونے کے باوجود وہ معیض سے۔۔۔ نہیں۔ میں نہیں مانتی کہ وہ ایسی کسی غلط حرکت کا ارتکاب کر سکتی ہے۔“

میسونہ بیگم روہانسی آوازیں تردید کر رہی تھیں۔ معیض نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔“

”ای جان۔۔۔ آپ کہہ رہی ہیں میری نظروں نے دھوکا کھایا ہے۔ میں ان دونوں پر ہمتان لگا رہا ہوں۔ آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہیں۔ ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھے ہی بے غیرت بنانا چاہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں بھول جاتا ہوں کہ جب میں چھت پر گیا تھا تو وہ دونوں اکیلے شہر ہاں اور اور۔“

”بس بیٹا! چپ کر جاؤ۔ میں اپنے بیٹے کو کیوں مجبور کروں گی کہ وہ ایسی لڑکی کو بیاہ کر لائے جو حیا، شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے مگر۔۔۔ چوری جیسے جانے کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ میں ابھی جانی ہوں کلثوم کو اور بھائی جان کو بتاتی ہوں۔“

میسونہ بیگم ایک دم غصے اور طیش کے عالم میں کھڑی ہو گئیں۔ وہ جانتی تھیں حذیفہ نے اوروں کے ساتھ تو شاید کبھی غلط بیانی کی ہو مگر اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ غیظ و غضب والے تاثرات لے کر وہ دروازے کی جانب بڑھیں ان کے خوف ناک تیور دیکھ کر حذیفہ یکدم گھبرا گیا۔

”ای جان۔۔۔ بات سنیں۔“ اس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں روکا۔ ”دیکھیں، ابھی جلد بازی سے کام نہ لیں۔ میں نے وہ سب دیکھا اور کسی سے بھی ذکر کیے بنا خاموشی سے پلٹ آیا۔ آپ کے اور کلثوم پھوپھو کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے ہیں

اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ مگر وہ دونوں بالکل نوجوان ہیں اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکے اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان دونوں کو خاندان بھر میں رسوا کر دیا جائے ٹھیک ہے آپ بات کیجئے کلثوم پھوپھو سے مگر صرف ان ہی سے اور انہیں سمجھائیے کہ وہ بھی بات اپنے تک رہیں۔ اگر پھوپھو انکل عباس کو بتائیں گی تو کچھ بعید نہیں وہ غیرت میں اگر دونوں کو گولی ہی مار دیں۔ لہذا پھوپھو کو سمجھائیے کہ وہ خود ہی کسی طرح اس رشتے کو ختم کر دیں۔ اور منیرہ کی شادی معیض سے کرنے کا سوچیں۔ ہم دونوں کی عمریں تفاوت کا بہانہ بنالیں یا کچھ بھی۔۔۔ انہیں رسوا کریں گے تو بہت کچھ خراب بلکہ برباد ہو سکتا ہے۔ آپ اب بابا جان سے بھی یہ بات چھپائیں گی میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے مزید لوگوں کی زندگیاں خراب ہوں۔“

”بیٹا! تم کتنے اچھے ہو۔ کتنی اچھی سوچ ہے تمہاری۔ میں کتنی کم عقل تھی ایک بد کردار لڑکی کو تمہاری زندگی میں شامل کرنے چلی تھی۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔۔۔ ہمارا پیچھا چھوٹ جائے تو مزید کوئی ضرورت نہیں بات پھیلانے کی۔ اپنے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔ دوسروں کے عیب چھپانے میں ہی بھلائی ہے۔ البتہ اب کلثوم کی آنکھیں اچھی طرح کھولوں گی بڑانا ز کرتی ہے بیٹی پر۔“

میسونہ بیگم نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔ مگر لہجے میں نفرت اور بے زاری بھی منیرہ کے لیے۔۔۔ خود جانے کا ارادہ ملتی کرتے ہوئے انہوں نے اگلے ہی دن کلثوم بیگم کو فون کر کے بلوایا۔ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے وغیرہ پلانے کے بعد میمونہ بیگم کلثوم بیگم کو اپنے بیڈ روم میں لے آئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات اور انداز میں تناؤ کلثوم بیگم محسوس کر رہی تھیں۔ کمرے میں آنے کے بعد میمونہ بیگم نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے ساری بات کلثوم بیگم کو بتادی۔ وہ جیسے ہزارواٹ کا کرنت کھا کر کھڑی ہو میں۔

”میسونہ کیا کہہ رہی ہو!“ میری منیرہ اور معیض ایسے نہیں ہو سکتے۔ حذیفہ سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ ان کی آواز لرز رہی تھی مگر جیسے ہی یقین تھا۔ ”جب حذیفہ نے مجھے یہ سب بتایا تھا تو میں نے بھی یوں ہی انکار کیا تھا۔ میرا دل کانپ گیا تھا۔ مگر کلثوم آپ آج کل کی اولاد ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کافی ماہر ہے۔ حذیفہ نے آج تک کسی بھی معاملے میں مجھ سے جھوٹ نہیں بولا اور اسے تم اچھی طرح جانتی ہو بچپن ہی سے بڑی برواشت والا ہے۔ آج تک کسی لڑکی سے دوستی تک نہیں کی۔ اس کا کردار مزاج عادات تمہارے سامنے ہی ہیں۔ یورپ میں رہ کر بھی اس کا کردار خراب نہیں ہوا۔۔۔ تو کیا اب میں ایسی لڑکی کو اس کی بیوی بنادوں جسے وہ خود دیکھ چکا ہے کہ وہ کتنی پاکر دار ہے۔“

یہ سب جان کر میں بہت طیش میں آ گئی تھی اور چاہ رہی تھی ”ان دونوں کے کروت سب کو بتاؤں مگر یہاں بھی میرے بیٹے کی اعلا ظنی دیکھو۔ اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے صرف تم سے بات کرنی چاہیے۔ مردوں تک بات بچنی تو کوئی بھی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے۔ آپ منیرہ کی پڑھائی یا عمر کے فرق کو یا کسی بھی بات کا بہانہ کر خود ہی سب کے سامنے یہ رشتہ ختم کر دیں۔ اگر ہم انکار کریں گے تو لوگ کہیں گے۔ ضرور لڑکی کی کوئی کمزوری سامنے آگئی۔ خیر عیب تو ہم نے بہت بڑا دیکھ لیا بلکہ گناہ کتنا چاہیے مگر کیا کریں اپنوں کی عزت کا بھی سوال ہے۔“

آخر میں میمونہ بیگم کا لہجہ خاصا احسان جتلانے والا تھا۔

”عمر اور تعلیم تو پہلے بھی سب جانتے ہی ہیں۔ لیکن آپ فکر نہیں کریں۔ رشتہ ختم مجھیں اور واقعی یہ آپ کا احسان ہے کہ میری بیٹی کا گناہ دیکھ کر بھی پردہ پوشی کر لی۔“ کلثوم بیگم کی کمزوری آواز جیسے کسی گرمی کھالی سے نکلی تھی۔ میمونہ بیگم کے دل کو کچھ ہوا۔



جب پہلی بار انہوں نے اس سے منیرہ کے متعلق

درمیان ایسا کچھ ہوا تو وہ انکار کیوں کرتا۔ یہ سارا قصہ آج تک میری سمجھ نہیں آیا۔“ میمونہ بیگم سر ہلکا کر بولیں۔

”امی جان! ہو سکتا ہے اس وقت میری نظروں نے واقعی ہی دھوکا کھایا ہو!“ معجز کرے لہجے میں بولا۔
”کیا مطلب؟ اس وقت تو تم کہتے تھے میں نے اپنی آنکھوں سے سب دیکھا اور آج تمہیں یاد آ رہا ہے کہ تم نے۔“

”امی جان! آج اتنے سالوں بعد مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں نے شاید دھوکا کھایا تھا۔ اب میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کلثوم پھوپھو سے بات کریں گی تو وہ ہمارا احسان مانیں گی۔“
”ماہم اور حمزہ کا کیا کرو گے؟“ میمونہ بیگم کے لہجے میں کچھ سختی تھی۔

”میں ماہم سے بہت تنگ آ گیا ہوں اگر منیرہ سے رشتہ پھر سے جڑ جائے تو میں فوراً اسے طلاق دے دوں گا۔ حمزہ کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔“ اس کی بات پر میمونہ بیگم حیران سی اسے دیکھنے لگیں۔ کئی کڑیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ کئی پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹنے لگے مگر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا بیٹا بھی کسی پر جھوٹا بہتان لگا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک دم فیصلہ کر لیا۔

”شادی بیاہ رشتہ توڑنا۔ جوڑنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ تم نے ماہم سے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ میں اس کھیل میں تمہارا مزید ساتھ نہیں دے سکتی۔ اپنے لیے جو بھی کرنا ہے خود کرو کیونکہ اگر تمہیں ہمارے فیصلوں پر اعتماد ہو تا۔ تو آج اس حالت میں نہ ہوتے۔ بے چلک اور قطعی لہجے میں کہتے ہوئے میمونہ بیگم وہاں سے چلی گئیں۔

زندگی میں پہلی بار حذیفہ حسن نے اپنی ماں کو خود سے یوں برگشتہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ وہ خود منیرہ سے ہی بات کرے گا مگر حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ منگنی ٹوٹنے سے لے کر آج تک نہ وہ ان کی طرف آئی تھی اور نہ ہی حذیفہ کبھی ادھر ان کے گھر گیا

پڑا۔ اس کی تحریکوں سے بعد اس کا نام بتایا تھا تب ہی حذیفہ کو شبہ ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے منیرہ نام کی کئی اور بھی لڑکیاں ہوں مگر اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس نقشہ ہر منیرہ کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو کسی دیتا رہا اور اس وہم کو جھٹلاتا رہا کہ کاش وہ وہی ”منیرہ نہ ہو جس کے لیے اب وہیا گل ہو رہا تھا اور اسے پانے کی ترکیبیں سوچنا رہتا تھا۔ مگر اس کا یہ وہم حقیقت میں تب سامنے آیا جب ایک دن میمونہ بیگم فون پر شازیہ سے باتیں کرتے ہوئے اسے منیرہ کی منگنی اور اس کے منگیتر کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ حذیفہ کو لگا، کسی نے اس کے منجے سے زمین چھین لی اور ریت سینٹ۔ بجزی کا لمبہ اس پر گر آیا ہے اور وہ کیس اندھے کنویں میں گر پڑا ہے۔ وہ دن وہ عجیب کم بہتی اور خشک سی کیفیت میں رہا۔

کتنے دن وہ انصر سے رابطہ نہ کر سکا۔ وہ انصر کو بے حد پسند کرتا تھا۔ وہ کئی بار اس کے کام آیا تھا۔ وہ اس کا بہترین دوست رہ چکا تھا۔ مگر آج کل انصر اسے اس دنیا کا بدترین شخص لگنے لگا تھا۔ نجلے کیوں آج بھی اسے لگتا تھا۔ منیرہ پر صرف اسی کا حق ہے اگر تالانی میں وہ اسے کھو چکا ہے تو کیا ہوا تالانی بھی کی جا سکتی ہے یہ ہی سب سوچتے ہوئے اس نے میمونہ بیگم سے چند ماہ قبل بات بھی کی تھی۔

”بیٹا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس لڑکی کو چند سال قبل ہم ٹھکرا چکے ہیں اسی کا رشتہ مانگنے چلے جائیں۔ خاندان والے کیا کہیں گے اب جبکہ تم شادی شدہ بھی ہو۔“ وہ خاصی الجھ کر بولی تھیں۔

”امی جان! خاندان والوں کو اصل بات کا تو علم نہیں انہیں تو یہ ہی پتا ہے انکار پھوپھو کی طرف سے ہوا تھا اور منیرہ بھی تو ابھی تک کنواری ہے۔ آپ خود کہتی ہیں کہ کئی اچھے رشتے آئے مگر اس نے ٹھکرا دیے۔ اسی لیے ماکہ وہ ابھی تک میرے انتظار میں ہے۔“

”حذیفہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس وقت جو تم نے کہا تھا۔ وہ سب کیا تھا۔ عظمیٰ نے معجز پر کئی بار دباؤ ڈالا کہ وہ منیرہ سے شادی کر لے مگر وہ نہیں مانا۔ اگر ان کے

تھا۔ باقی ہر دالے ملتے جلتے تھے۔ مگر ان کی تو کبھی بات بھی نہ ہوئی تھی۔ اب اس کے سامنے جاتے ہوئے ایک جھجک سی مانع تھی۔ اور اسی جھجک کے دوران اسے اس کی منگنی کی خبر مل گئی تھی اور جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ آج کل وہ پھر ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کس طرح منیہ کو حاصل کرے اور اس نے پھر سوچ لیا تھا کہ اسے منیہ سے کیا کہنا ہے۔ اب صرف مشکل مرحلہ اس سے ملاقات کا تھا۔ کیا وہ اس کا سامنا کر پائے گا۔ کیا اس کی آنکھوں میں دیکھ پائے گا۔ اسے اپنا نشین دلا پائے گا۔ اس کے ذہن میں دو آنکھیں ابھری تھیں بششدر عمران پریشان صاف شفاف پانی سے بھری آنکھیں!

اپنے سامنے رکھی فائل پر جھکا وہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اس کے آفس کا دروازہ دھڑام سے کھلا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر یکدم اس کے اوسان خطا ہوئے تھے۔ بے ساختہ وہ اپنی کرسی پر سے کھڑا ہوا تھا۔ ”منیہ تم؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ اس کی نہ صرف آمد اس کے لیے حیران کن تھی بلکہ اس کا حال یہ بھی۔ گلابی اور سفید پرنٹڈ شیفون کی قمیص کے نیچے سفید کلر کی شلوار۔ سر پر دوپٹہ اچھی طرح لپیٹے ہوئے وہ بالکل گھریلو سی لگ رہی تھی۔ کپڑوں کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک دون دن قبل کے بنے ہوئے ہیں۔ ”آپ یقیناً“ اپنے آفس میں مجھے دیکھ کر خالص حیران ہوئے ہوں گے۔ لیکن اپنی ماں سے اپنے متعلق جو بات سنی ہے اس نے میرے پاؤں تلے سے زمین ہی چھین لی ہے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ آپ نے کیوں۔۔۔ کیوں میری ذات پر اتنا گند ا اور گھناؤنا الزام لگایا؟ کیوں آخر کیوں؟“

نفرت غصہ تحارت دکھ اذیت بے چینی اس کے ان تین جملوں کے اندر نہ جانے کیا کیا کچھ تھا جس نے حذیفہ کو بھی بل بھر کے لیے ہلا دیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی

سباہ آنکھوں میں خون رنگ سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد پھیلی نمی اور پھیکے پھیکے گال بتا رہے تھے کہ وہ روتی ہوئی آئی ہے۔ جب سے ان دونوں کی منگنی ہوئی تھی آج وہ پہلی بار حذیفہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔ جتنی سوال کرتی کچھ کھوجتی آنکھیں۔ حذیفہ کو قطعاً ”تو نے نہ تھی کہ اگلے ہی دن وہ یوں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جائے گی اور اس سے سامنا ہونے کا تو اس نے سوچا تک نہ تھا۔ وہ تو اپنی طرف سے قصہ ختم کر چکا تھا۔ تاہم اب اسے اپنی پوزیشن کا تسر کرنی ہی تھی۔

”دیکھو کل میں نے تمہیں اور معین کو چھت پر اکیلے دیکھا۔ تم لوگ مجھے نہیں دیکھ پائے تھے اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا بولے۔ کل جس اعتماد سے اس نے اپنی امی سے بات کی تھی وہ کہیں رونوچکر ہو گیا تھا۔

”اور۔۔۔ کیا اور۔۔۔“ وہ تیزی سے بولی۔ حذیفہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”ہم دونوں کی بار آپ کو ایک ساتھ نظر آئے ہوں گے۔ اسکول کالج ہم دونوں ساتھ جاتے ہیں۔ رہتے ساتھ ہیں کھاتے پیتے بھی ساتھ ہیں۔ مگر کل آپ کو ایسا کیا نظر آیا کہ میں اپنی ہی نظروں سے گر گئی ہوں؟“ وہ درشتی سے پوچھ رہی تھی۔

منیہ لیو ہونا تھا ہو چکا۔ ابھی بات صرف پھوپھو تک ہے ایسا نہ ہو تمہارے بھڑکنے سے جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے۔ کنٹرول پور سیلف۔ میں نے کوئی بہتان نہیں لگایا تم پر۔ کوئی منگیتہ برداشت نہیں کرنا کہ اس کی فیائی اس سے تو بات تک کرتے ہوئے گھبرائے اور کسی اور کے ساتھ کھلکھلائی پھرے۔ بس میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تم جاؤ اب۔ یہ میرا آفس ہے، خواہ مخواہ کا تمنا نہیں بنناؤ۔“ وہ خاصی سنگدلی سے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ منیہ کی آنکھوں میں سوال اور چہن کی جگہ حیرانی سراپا ہوئی اور پانی نے لے لی تھی۔

”آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے تو براہ

راست مجھ سے میری ماں سے بات کر لیتے۔ یسین کریں ہم بالکل برا نہ مانتے نہ میں کوئی ہنگامی نہ کرتی۔ مگر یوں میری کردار کشی تو نہ کرتے۔ مجھے یہ اتنا گھناؤنا الزام تو نہ لگاتے۔۔۔ منگنی ٹوٹی تو میرے کچھ ارمان ٹوٹ جاتے کچھ خواب بکھر جاتے۔ مگر آپ نے تو بڑی سخت سزا دی ہے اس منگنی کی۔ میری ہستی کو ہی برباد کر دیا۔ میری ذات کو شکوک و شبہات میں ڈال دیا۔ مجھ پر ایسی سیاہی ڈال دی کہ دھونے بیٹھوں تو عمر تمام ہو جائے۔ آپ کی پچہن سے لے کر آج تک بہت عزت کی۔ اس سب کا بدلہ آپ نے یوں دیا مجھے کہ کسی اور لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے۔ میری پاکیزگی حیا، کردار سب کو نشانہ بنایا۔ اگر میں آپ کی نظروں سے گر گئی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ مجھے سب کی نظروں سے گرا دیں۔ بہر حال مجھے دکھ ہے تو اس بات کا کہ یہ گھناؤنا الزام آپ نے مجھ پر لگایا جس پر میں اندھا اعتماد کرتی تھی۔ ورنہ مجھے اس بات کا کوئی خوف نہیں کہ کوئی مجھے کس نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ مجھے اپنے کردار پر اعتماد سے میری دعا ہے جس لڑکی کی خاطر آپ نے میرے کردار کو نشانہ بنایا ہے اسی سے آپ کی شادی ہو یقیناً“ وہ لڑکی آپ جیسے شخص کو ڈیزر کر رہی ہے۔

میں جاری ہوں اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں خود سے مطمئن ہوں مگر آپ کی ہستی میری نظروں میں بہت گندی جگہ پر آگئی ہے۔

نفرت سے بولنے ہوئے اس نے آخری جملہ کہا اور آفس سے باہر نکل گئی۔ اس کے کئے الفاظ حذیفہ کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

عظمیٰ خالہ کے گھر سے وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے ہی برآمدے میں کلثوم بیگم کڑے تیوروں سے کھڑی تھیں۔ داوی اماں عظمیٰ کی طرف تھیں۔ وہ تیزی سے کلثوم بیگم کے قریب سے گزری اور اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔ اپنے پیچھے اسے کلثوم

بیگم کی شعلہ یار نظروں کا احساس ہوتا چند ہی منٹوں میں اس کے پیچھے تھیں۔

”گھر میں کسی کو بھی بتائے بغیر کہاں گئی ہوئی تھیں تم اور وہ بھی معین کے ساتھ۔“

”بس کریں امی جان! خدا کے لیے بس کر دیں۔ کل سے آپ نے مجھے رگید کر رکھ دیا ہے۔ میری سچائی اور پاکیزگی تو نظر نہیں آرہی مگر مجھے کس سچائی کا کیا ثبوت ہے آپ کے پاس۔ ابھی اسی کے پاس گئی تھی میں۔ یہ پوچھنے کہ یہ گھناؤنا الزام مجھ پر لگاتے ہوئے اس کا ضمیر کہاں سو رہا تھا۔“ کلثوم بیگم کی بات کانٹے ہوئے وہ خاصی پرہم ہو کر بولی۔

اس کی آنکھیں چہرہ آواز لہجہ چیخ چیغ کر اس کے حق میں گواہی دے رہے تھے۔ کلثوم بیگم بے بس سی اسے دیکھنے لگیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ معین اور عظمیٰ بیگم ساتھ ہی داخل ہوئے۔

”کیا بات ہے کلثوم آیا۔۔۔ معین بتا رہا تھا کہ یہ دونوں ابھی حذیفہ کے آفس گئے تھے منیہ جاتے ہوئے اور واپسی میں بھی بری طرح روتی آئی ہے۔ معین پوچھتا رہا کہ کیا بات ہے مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اب اس نے مجھ سے بات کی تو میں پریشان ہو کر بھاگتی آئی ہوں۔ آپ دونوں بھی خاصی پریشان لگ رہی ہیں۔ کیا بات ہے“ کلثوم بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا بولیں۔ اچانک منیہ کی سسلتی آواز ابھری۔

”معین! میں حذیفہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ اس کے منہ سے نکلے جملے نے ان تینوں کو یکنگت ساکت کر دیا۔

”کیا کہہ رہی ہو منیہ۔۔۔ مہم میں تمہیں بہنوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ تم حذیفہ بھائی سے انکساجد ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی یہ سب کہتے ہوئے“ چند لمحوں بعد معین جیسے ہوش میں آ کر بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے منیہ کی یہ بات خاصی ناگوار گزری ہے۔

”حذیفہ کا خیال ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے عشق میں پاگل ہو چکے ہیں اور یہ کہ انہوں نے ہم

دونوں کو انتہائی نازیبا حرکت کرتے دیکھا ہے۔ میں سب کے سامنے ان کے اس الزام کی تصدیق کروانا چاہ رہی تھی۔ ”منیرہ نے اطمینان سے کہا معینہ اور عظمیٰ بیگم کے قدموں تلے سے جیسے زمین نکل گئی تھی۔

”یہ سب حذیفہ نے کہا ہے۔ میں نہیں حذیفہ کی جان لے لوں گا تنے گندے ذہن کے مالک ہیں وہ۔“

معینہ بات سمجھ چکا تھا۔ وہ غراتے ہوئے بولا اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ کلثوم بیگم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا۔ ”عظمیٰ ذرا دروازے کی چٹنی لگا دو۔ میں بات چھپانے کے لیے ہلکا ہورہی ہوں اور یہ دونوں تو پاگل ہو گئے ہیں۔ اپنا تماشا خود بنا رہے ہیں۔“ کلثوم بیگم کے سامنے اب جو کچھ واضح ہوا تھا اس سے ان کے اندر اور کئی نئی سوچیں وارد ہوئیں۔

”بیٹا! بیٹیوں کی جذباتی نہ ہو۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب ایک ہی خاندان سے جڑے ہوئے ہیں۔ میں خود سارا معاملہ دیکھ لوں گی۔ ان لوگوں کا اصل مقصد منگنی ختم کرنا تھا جو وہ ہم سے کروانا چاہتے تھے اور اس کے لیے جو ان کے ذہن میں آیا انہوں نے کیا۔ ہمیں تم دونوں پر یقین ہے۔ کوئی شک نہیں ہے۔ بس تم لوگ برداشت سے کام لو! کلثوم بیگم نے پانپتے ہوئے کہا۔ وہ ان لوگوں کا غصہ ختم کرنا چاہ رہی تھیں یا پھر واقعی ان کی بدگمانی دور ہو گئی تھی۔ اپنی کیفیت وہ خود نہ سمجھ پا رہی تھیں۔

”منیرہ! اب میں تمہارے منہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ سنوں۔ عظمیٰ! تم معینہ کو لے کر جاؤ۔ اسے سمجھاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں تمہاری طرف۔ اماں جی ادھر آجائیں تو آتی ہوں۔“

انہوں نے جب چاب کھڑی بے یقینی سے سب دیکھتی اور سنی عظمیٰ سے کہا۔ کچھ دیر بعد کمرہ مکمل خاموشی میں تھا۔ صرف منیرہ تھی کمرے میں اور اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں۔

سترہ سال کی عمر میں جب اس کے سامنے حذیفہ کا پروپوزل رکھا گیا تو حیران ہونے کے ساتھ وہ پریشان بھی

ہوئی۔ وہ ہمیشہ اسے بھائیوں کی طرح سمجھتی آئی تھی۔ تاہم منگنی کے بعد مشرقی باجیا لڑکی کی طرح اس نے اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں خواب بننا شروع کر دیے۔ اس کے دل میں ارمان اور تمنائیں سر اٹھانے لگیں۔ حذیفہ کے بارے میں اس کی سوچ بدلتے لگی تھی۔

اس کے نام پر وہ اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کرتی تھی۔ اور جب وہ خود کو اس دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کر رہی تھی اسی وقت وہ اس کی پرفصیحہ بن گیا تھا۔ وہ کئی دن روتی رہی بلکتی رہی۔ تقریباً ”مینہ“ بھر بخار میں مبتلا رہی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس نے بھٹلنا شروع کر دیا تھا۔

خاندان میں کسی کی فوٹنگی ہو گئی تھی۔ سارے گھر والے وہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ آج اتوار تھا۔ اس نے فارغ وقت کو مصرف میں لاتے ہوئے پہلے تو سارے گھر کی صفائی کی پھر ہفتے بھر کے سب کے میلے پکڑے اکٹھے کر کے دھوئے وہ اس وقت سوکھے ہوئے پکڑے تہہ کر رہی تھی جب ڈور بیل بجی۔ وہ بیرونی گیٹ کی طرف آئی۔ سر پر دوپٹہ سیٹ کرنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑے شخص کی اس کی طرف پشت تھی۔

”کون؟“ اس نے بے تاثر لہجے میں دریافت کیا۔ اس کی آواز پر وہ پٹلا چھ سال بعد حذیفہ کو اپنے سامنے دیکھ کر چند ثانیے کو وہ ساکت ہوئی۔

”گھر میں کوئی نہیں ہے۔“ اس نے بے حس لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں گھر میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن تم سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”لیکن میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی نہ بات کرنا چاہتی ہوں۔“ درشتی سے کہتے ہوئے اس نے نفرت سے اسے دیکھا۔

”ڈومٹ پلیز میری ایک بات سن لو۔“

”آپ کو بیٹھنے کی آفر نہیں کروں گی۔ جو بھی کتاب ہے ذرا جلدی کہیں۔“ وہ اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولی۔

”تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میں کوئی لمبی چوڑی تنہید نہیں پاندھوں گا۔ منیرہ۔۔۔ مم میں صرف اتنا چاہتا ہوں تم مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر جو ہمت لگائی۔ اس کی کڑی سزا پائی ہے۔ مجھے ایسی بیوی ملی جسے شرم و حیا چھو کر نہیں گزری۔ جو کردار اور اس کی عظمت سے قطعاً ناواقف ہے۔ جو شوہر کو فقط روپیہ بنانے والی مشین سمجھتی ہے۔ جو اولاد کو بوجھ اور گھر کو قید خانہ کہتی ہے۔ میں اس عورت سے نجات چاہتا ہوں۔ یقین کرو اگر تم مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو جاؤ تو میں اسے ابھی اسی وقت طلاق دے دوں۔ پلیز تم مجھے معاف کر دو۔“

وہ اچانک منیرہ کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا اور بری طرح روتے ہوئے بول رہا تھا۔ منیرہ پہلی بار کسی مرد کو کسی عورت کے قدموں میں بیٹھ کر پلک پلک کر روتے دیکھ رہی تھی اور ذرا بھی حیران نہیں تھی۔

”حذیفہ حسن! غور سے دیکھو میں وہی لڑکی ہوں جس سے چھ سال قبل آپ کی منگنی ہوئی تھی اور جس لڑکی سے جان چھڑانے کے لیے آپ نے ایک کامیاب ڈرامہ کیا تھا۔ اور شاید آپ کو علم نہیں کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔ اور تقریباً ”ڈیڑھ ماہ بعد شادی بھی ہو جائے گی۔ آپ چاہے اس وقت پوری دنیا میری خاطر چھوڑ آئیں۔ میں پھر بھی آپ کی طرف دیکھوں تک نہیں۔“ اس نے بڑے سکون سے اپنا فیصلہ سنایا۔

”دیکھو منیرہ! جس شخص سے تمہاری منگنی ہوئی ہے۔ وہ بہت بڑا فلرٹ شخص ہے۔ انگلینڈ میں میرے ساتھ پڑھا ہے۔ یقین کرو، لڑکیوں سے اس کے تعلقات تھے۔ وہ ایک لڑکی پر رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ یقیناً تمہارے ساتھ بھی کھیلے گا۔ تم برباد ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں اس سے بچانا چاہتا ہوں۔ میرا اعتبار کرو۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

”مان لیتی ہوں وہ فلرٹ شخص ہے۔ آپ تو فلرٹ نہیں تھے۔ کبھی حذیفہ صاحب کا کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔ پھر بھی آپ نے وہ کیا جو بڑے سے بڑا منافق بھی کرتے ہوئے کچھ جھجکتا ہے۔ وہ جو بھی ہے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ سابقہ انداز میں بولی۔

”منیرہ میں تمہیں کسی اندھے کنویں میں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، تمہارے قابل نہیں ہے۔“ وہ بے بس سا ہوا۔

”مجھے آپ کے دیکھنے نہ دیکھنے کی کوئی پروا نہیں۔ جاسکتے ہیں آپ۔“ ناگوار سی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ حذیفہ بے بس سارے دیکھ گیا۔

ماہم کا جادو جیسے بے اختیار ہو کر سرچڑھا تھا۔ صرف کچھ عرصے بعد ہی اتر گیا۔ اسے پا کر محسوس ہوا تھا کہ وہ محبت وہ اوائیں سب ان بچے رنگوں کی مانند تھیں جنہیں برتنے پر ہی پتا چلتا ہے کہ یہ رنگ تو صرف دیکھنے کے لیے ہی تھے۔

گھر میں شادی کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کے سرال والے ڈیٹ مانگ رہے تھے۔ میونہ بیگم کا ارادہ تھا کہ حذیفہ کی بھی شادی کر دی جائے۔ اس واقعہ کے بعد ان کا ایسا دل ٹوٹا تھا کہ وہ کسی بھی اور لڑکی کو بہو کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکیں انہوں نے اس سلسلے میں حذیفہ سے بات کی۔

”حذیفہ بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ شادی کے ساتھ ہی تمہاری شادی بھی کروں تیاریاں تو ساری مکمل ہیں۔ اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہو تو بتا دو ورنہ پھر رستے کروانے والی سے رابطہ کرتی ہوں۔“ انہوں نے کچھ مرجھائے سے لہجے میں کہا تھا۔

”امی جان! میں اس سلسلے میں آپ سے بات کرنے ہی والا تھا۔ ماہم میری سیکرٹری ہے۔ میرے آفس میں کام کرتی ہے۔ آپ اس کے والدین سے بات کر لیں۔“ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ میونہ بیگم نے اس کی طرف چند ثانیے کو دیکھا اور پھر ثابت میں سر ہلا دیا۔

”حذیفہ! میں نے تمہارے بابا جان سے بات کی تھی۔ وہ راضی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے وہ لڑکی ہمارے گھرانے کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ کافی ماؤرن قسم کی ہے اور پھر آس میں کام کرنے والی لڑکی۔۔۔ گھر کیسے سنبھال سکتی ہے۔“ میمونہ بیگم سمجھا نہیں بلکہ تار رہی تھیں۔

”ای جان منیرہ جیسی گھریلو سادہ سی تو وہ واقعی نہیں ہے۔ مگر منیرہ کا اصل روپ دیکھ لینے کے بعد آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ شادی کے بعد وہ آس نہیں جائے گی اور اپنے انداز و اطوار بھی بدل لے گی۔ وہ مجیدہ!“ جب کر رہی ہے اور اس کا ماؤرن ہونا جب کی ضرورت ہے۔ میں صرف اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لیے بھی قطعی بن تھا۔

میمونہ بیگم نے مزید کچھ نہ کہا۔ ان کا بھی ناز اور مان ٹوٹا تھا۔ پھر اس کی خواہش کے مطابق ماہم سے اس کی شادی ہو گئی ابتدائی دن تو دونوں نے جیسے ہواؤں میں گزرا رہے۔

وہ ماہم کو پا کر خوش تھا بے تحاشا خوش اور اس کی خوشی کو پہلا دھچکا جب لگا تھا۔ جب وہ بٹی مومن سے واپسی پہ پہلے دن آفس گیا۔ وہ کافی لیٹ آس گیا تھا۔ لفٹ سے نکلنے کے بعد وہ کمپنزی کی طرف آیا تو پہلے والے کیبن میں سے آتی آوازیں سن کر ٹھٹک کر رہ گیا۔

”یار! مجھے تو لگ رہا ہے باس آج بھی چھٹی پر رہیں گے۔“ یہ شاید طارق تھا۔

”ماہم کے چنگل میں پھنسے ہیں“ معمولی بات تھوڑی ہے۔“

”ویسے حذیفہ صاحب کی عقل پہ بہت افسوس ہوتا ہے کہ کم صاحب تو اتنے سمجھ دار اور مدبر قسم کے انسان ہیں۔ آخر ان کا بیٹا اتنا احمق کیوں نکلا۔“ طارق کی آواز تھی۔

”مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا باس کو ماہم میں آخر نظر کیا آیا۔ یا اس کی تو ذرہ رنگ ہی اتنی بے ہودہ ہوتی

ہے کہ اچھا خاصا بے شرم انسان بھی بوکھلا جائے دولت نہ خاندانی وقار نہ دین نہ دنیا اور نہ ہی کوئی اچھا کردار۔ پتا نہیں باس نے کیا دیکھا اس میں۔“ بیکل نے حیرت سے کہا تھا۔

”ویسے حذیفہ صاحب کو عورت کی پہچان نہیں ہے یا پھر انہیں ایسی ہی عورت چاہیے تھی۔ حذیفہ صاحب کے آنے سے پہلے تو وہ اپنے رائے فیجر مرتضیٰ صاحب کو پھنسانے کے چکروں میں تھی جہاں وہ پہلے جا کر تھی وہاں کے پاس سے بھی تعلقات تھے۔ اس کی بیوی نے نکلوا دیا۔ اور تو اور تمہارے پیچھے بھی تو پڑی رہی تھی مگر تم ایک نمبر کے کجوس انسان ہو جسکی کو اپنی چھٹی ہوئی شرت دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اسے تحائف کیسے دیتے خود ہی پیچھے ہٹ گئی۔“

طارق نے کہا تو دونوں نے تھقہ مارا۔ حذیفہ کو ایسے لگا کی نے اسے اٹھا کر عرش سے فرش پر کرادیا ہو۔ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے میں اسے خاص کمال نہیں تھا۔ لہذا وہ انہی قدموں واپس پلٹ گیا کتنی دیر بلا مقصد سرکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد وہ واپس آس آیا تھا۔

ماہم کو اپنے والدین کی ناپسندیدگی کے باوجود اس نے اپنا یا تھا اور اسے پانے کے لیے کسی اور کی ذات کو رگید ا تھا۔ وہ اپنی بربادی کا خود ذمہ دار تھا کسی کو کیا الزام دیتا۔

ماہم گھر کے کاموں حتیٰ کہ کھانا پکانے تک میں بالکل اتار بی تھی۔ وہ اچھی خاصی خود سر تھی اور حذیفہ سے شادی نے تو اس کا مزاج آسمانوں پر پہنچا دیا۔۔۔ حذیفہ نے اس کی جاب چھڑوا دی تھی۔ مگر گھر سے باہر جانے اور دلچسپیاں پالنے میں وہ شاید خاصی ماہر تھی۔ چند ہی دنوں میں اس کی سیلیوں کی ایک ٹھپ سی سامنے آگئی۔ فلاں کی مٹکائی ہے تو فلاں کی بڑھ ڈے۔ کسی کے بیٹے کا بڑھ ڈے ہے تو کبھی کچھ اسے شاپنگ کا جنون تھا۔ ایک ہی بار شاپنگ میں وہ ہزاروں روپے لٹا آتی آئے روز بیوی پارلر جاتی اس کے اخراجات دن بدن مزید شاہانہ ہوتے جا رہے تھے۔

میمونہ بیگم پریشن کا شکار ہو گئیں۔ ان کے شوہر نے آج تک جو بیانا تھا اس میں ان کی دن رات کی محنت اور لگن شامل تھی اور بہت بڑا ہاتھ میمونہ بیگم کا تھا۔ ایک امیر گھرانے سے تعلق ہونے کے باوجود شوہر کے گھر میں کفایت شعاری سے کام لیتی رہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش مشرقی اقدار کے مطابق کی تھی۔

ماہم کے لباس دیکھ دیکھ کر وہ ہلکی رتھیں۔ حذیفہ اکثر اس کے لباس پر اعتراض کر تا مگر وہ اس کے سر پر سے گزر جاتا تھی کہ ایک دن کریم صاحب نے بھی دھکے چھپے الفاظ میں میمونہ بیگم سے کہا کہ ہو کا لباس ٹھیک کروا میں۔

ماہم کی عادات نے انہیں اس قدر برگشتہ کیا کہ وہ بیٹے سے بات کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

”یہ سب کیا ہے؟ حذیفہ یہ ہو بیٹیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔ اس سے کھانا پکوانی کی رسم کروائی جا چکی ہے مگر وہ کچن میں جھانکتی تک نہیں۔ کوئی حرج نہیں اگر اسے کچھ نہیں پکانا آتا۔ مگر کیک تو سکتی ہے۔ میری ہیپ ٹو کروا سکتی ہے تا مگر وہ تو بچن میں جاتا اور گلاس بھی اوھر سے اوھر رکھتا اپنی تو بچن سمجھتی ہے۔ وہ گیارہ بارہ بجے سو کر اٹھتی ہے۔ پھر ڈرائیور کو ساتھ لے کر کبھی کسی سہیلی کے ہاں تو کبھی کسی کے ہاں۔۔۔ شاپنگ کو نکلتی ہے تو شام کو لوٹتی ہے۔ گھر میں ہو تو سارا دن بیوی لگا کر بند روم میں بند رہتی ہے۔ کپڑے وہ ایسے پہنتی ہے کہ کچھ اور ناز بہ تک کو لینے آ جاتے ہیں۔ تمہارے پاپا تک اعتراض کر رہے تھے اس کے کپڑوں پر۔“

ابھی تم نے اتنا کمایا نہیں جتنا وہ اپنی شاپنگز اور فضول کی تقریحات میں لٹا رہی ہے۔ تمہارے بابا نے کئی سال لگائے ہیں اس بزنس میں اور تمہیں ابھی چند مہینے ہوئے ہیں شامل ہوئے۔ مانا کہ سب کچھ تم لوگوں کا ہی ہے مگر یہ مطلب نہیں آنکھیں بند کر کے لٹاتے رہو اس پر۔۔۔

تمہارے بابا کہہ رہے تھے کہ اس کا الگ سے

اکاؤنٹ کھلوانے کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کسی حساب سے پیسے دیا کرو۔ ویسے تو حق مہر لکھواتے ہوئے ہی ان لوگوں کا لالچ سامنے آ گیا تھا۔ مزید بدھونہ بنو۔“

میمونہ بیگم کافی تندہ لہجے میں بولی تھیں۔ اس نے سر جھٹکاتے ہوئے ہر بات سنی تھی اور کسی بھی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ماہم کی حرکتوں نے اسے بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی دولت اور آسائش کی بھوک تھی۔ ملنے ہی بے دھڑک ہو گئی تھی۔

”ای جان! آپ اسے کہنے کا حق رکھتی ہیں۔ آپ کو اس کی جس بات پر بھی اعتراض ہو برلا نہیں۔ میں بھی کوشش کرنا ہوں اسے سمجھانے کی۔“

حذیفہ کی اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ روزانہ گھر میں جنگ کا سا سماں رہتا۔ وہ گھر میں قدم رکھتا اور ماہم کی شکایتوں سناں کی برائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ عاجز آ گیا۔ زندگی میں اسے کبھی اس طرح کی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے بھی ماہم پر پابندیاں لگانی شروع کر دیں۔ وقت بے وقت پیسے دینے کم کر دیے جس کا یہ رزلٹ نکلا کہ وہ دکھاوے کو ہی سہی ماہم گھریلو امور میں دلچسپی دکھانے لگی۔ حذیفہ سمجھا اب کچھ مشکل نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا مگر کچھ ہی عرصے بعد اس خبر نے گھر میں بھونچال مچا کر دیا کہ ماہم نے پہلے تو اپنی پریگنسنسی چھپائی اور پھر بغیر کسی کو بتائے اسے ختم بھی کروا دیا۔ اس بار تو کریم حسن بھی بہت چراغ ہوئے۔

”ٹھیک کیا اس نے ہمیں اس سے اپنی آئندہ نسل چاہیے جی نہیں۔ ہم حذیفہ کی دوسری شادی کریں گے اس سے بچے ہوں گے۔“ کریم حسن کی اس بات نے ماہم کے قدموں سے زمین ہی کھینچ لی۔

”حذیفہ! ابھی تو ہم نے میرا دل آف کو ٹھیک طرح انجوائے بھی نہیں کیا۔ میں اتنی جلدی اپنا فکرو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے ایسا کیا۔ اس نے صفائی میں کہا۔

”اوندہ میوڈ لائف۔ مطلب جانتی ہو میوڈ لائف کا۔ تمہارے نزدیک گھومنا پھرنا۔ ہولنگ کرنا۔ ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کرنا۔ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر رہنا، میوڈ لائف کو انجوائے کرنا ہے۔ تھ ہے تمہاری سوچ پر جن عورتوں نے گھر بسائے ہوتے ہیں وہ یوں بے مہار نہیں ہوتیں۔ تمہیں میری کسی بات کی کوئی پرواہ تک نہیں۔ یہی سچی تمہاری محبت کہ میرے ذریعے تمہیں دولت چاہیے تھی۔ بڑا گھر اور گاڑی چاہیے تھی تو بھول جاؤ میں تمہیں عیاشیاں کرواؤں گا۔ اس گھر یہ میری ماں کا کنوئل ہے اور تمہیں ان کے تابع رہنا ہے اگر سال رہنا ہے ورنہ تمہاری اس حرکت کے بعد تم میرے دل سے اتر گئی ہو۔“

حذیفہ کے نفرت سے کہ گئے الفاظ نے اس کے اندر بھی لاؤ بھر کا دیا۔ وہ فوراً ”میکے سیدھا رگنی۔ پندرہ دن بعد ماں کے ساتھ لوٹی تو کافی ٹرینڈ تھی۔ پتا نہیں ماں بہنوں نے کیا کیا سبھایا کہ اسے اپنے وجود پر پھر بڑے ڈالنے پڑے۔ اس نے باہر جانا، وقت بے وقت شاپنگ کرنا خاصا کم کر دیا تھا۔ لیکن میں ساس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ نازیہ سے بھی اب اچھی خاصی گفتگو کرتی۔ اس کی اس تبدیلی پر سب ہی نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ ماہم کی کوشش تھی وہ جلد از جلد دوبارہ ریگنٹ ہو مگر پچھلے ایارشن سے کچھ ایسی پیچیدگی ہو گئی تھی کہ اس کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی۔ ان ہی دنوں حذیفہ کو بزنس ٹور کے لیے فرانس جانا پڑا تو وہ ماہم کو بھی ساتھ لے گیا۔ تاکہ ان کے تعلقات میں کشیدگی ختم ہو جو بھی تھا اسے ماہم ہنسی مسکراتی ادا میں دکھاتی ہی اچھی لگتی تھی۔ آج کل تو وہ ویسے بھی گھیر لیو یوں کی طرح تھی بلکہ تھوڑی چڑچی رہتی تھی اس کے سامنے۔

نقریا ”ڈیڑھ سال بعد وہ پھر سے ریگنٹ ہوئی۔ اور اس خبر کے پھیلنے ہی گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ ان سب کو اپنے گھر میں بچوں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔“

اس کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ گھر میں خوشی اور اطمینان کا عالم تھا۔ بیٹے ہونے کی خوشی میں حذیفہ نے ماہم کو سونے کا جڑاؤ لنگن بنا کر دیا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد سب کا خیال تھا، ماہم اب مکمل طور پر گھریلو ہو جائے گی یاں بنے کے بعد اس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ مگر یہ سب کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ بیٹے کو ماہم نے اپنے لیے ڈھال بنا لیا تھا۔ پھر وہ اپنے اصلی رنگ پر آگئی۔ اب تو پہلے سے بھی زیادہ نڈر تھی۔ سب بوکھلا کر رہ گئے۔

حمزہ کو سارا دن میمونہ بیگم سنبھالتیں یا نازیہ اسے کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ پھر سے اس کے اور حذیفہ کے درمیان جھج جھج ہونے لگی۔ اکثر حذیفہ شام کو اس سے پکے گھر آ جانا اور پھر اس کی آمد کا انتظار کرنا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ ماہم کی دوستیاں صرف لڑکیوں سے نہیں، مردوں سے بھی تھیں۔ ان کے درمیان تحائف کا لین دین بھی رہتا تھا۔ ماہم کی بارنٹ کلب بھی جا چکی تھی۔ ماہم کی یہ ساری حرکتیں ابھی تک جاری تھیں۔

میمونہ بیگم اور کیم حسن تو جیسے اس سے بے زار ہو چکے تھے۔ انہوں نے کچھ بھی کتنا ترک کر دیا تھا اور اب تو حذیفہ بھی اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ اسے کچھ کہنے کے بجائے اب اسے طلاق دینے کا سوچنا پڑتا۔ ان گزرتے سالوں میں اسے کئی بار منیر یاد آتی تھی۔ اس کی معصومیت سادگی، حیا کو یاد کر کے اس کا دل چاہتا وہ اپنی آنکھیں پھوڑا لے جو ماہم کی اداؤں کی اسیر ہو کر ایک انمول ہیرے کو پہچان سکیں۔ وہ پھر سے اسے اپنانا چاہتا تھا۔ اور اسی لیے وہ اپنے عزیز دوست انصر سے متفرق ہو گیا تھا جو انجمنے میں اس کی راہ میں آگیا تھا۔ مگر وہ براشت نہیں کر پا رہا تھا کہ منیر اس کے علاوہ کسی اور کی زندگی میں شامل ہو۔

”منیر تو میری ہو۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا چاہے اس کے لیے ایک بار پھر تمہیں بدنام کرنا پڑے۔ مگر معاف کرو۔ شادی کے بعد اپنے ہر جرم کی تلافی کروں گا۔“ سچ سے کھڑے ہوتے ہوئے

وہ خود سے مخاطب ہوا۔ پچھلی چھ سالہ زندگی کو ذہن میں دوڑاتے ہوئے وہ پھر اسی مقام پر چلا گیا تھا جہاں سے ان چھ سالوں کا آغاز ہوا تھا۔

”سرا کوئی حذیفہ صاحب آئے ہیں“ وہ لیپ ٹاپ پر بڑی تھا جب انٹر کالم پر سیکرٹری نے اطلاع دی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

”بھج دو۔“ اس نے کہا۔ کچھ ہی لمحوں بعد حذیفہ اس کے سامنے تھا۔

”کیسے ہو یا راجا آج کیسے راہ دکھ لی ادھر کی۔ آؤ بیٹھو۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”بس کئی دنوں سے خیال آ رہا تھا۔ ملاقات کروں۔۔۔ مگر ٹائم ہی نہیں ملتا۔“

”کیا لوگے چائے یا کولڈ ڈرنک؟“

”نہنگ میں ابھی چائے پی کر آیا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنا تھی۔ گو کہ یہ وقت اور یہ جگہ ان باتوں کے لیے مناسب نہیں مگر بعض اوقات جگہ اور وقت کے بجائے بات اہم ہوتی ہے۔ میں تمہارا زیادہ ناگرم نہیں لینا چاہتا اس لیے کوئی فضول تمہید میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسی سنجیدگی تھی جس نے انصر کو چونکا دیا۔

”کو، کیا کتنا چاہتے ہو۔“ اس نے بشاش لہجے میں کہا۔

”انصر تمہیں ذرا حوصلہ سے بات سننا ہوگی۔۔۔ کیونکہ میں تمہاری زندگی کے ایک حساس معاملے کو چھیڑ رہا ہوں۔“ کرسی پر سے کھڑے ہو کر کھڑکی کی طرف رخ موڑتے ہوئے حذیفہ نے کہا۔

”میں ہر معاملے کے بارے میں کچھ بھی سننے کو تیار ہوں۔“ انصر نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے چیر پریم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”انصر میں شاید تم سے اس معاملے میں پردہ ہی رکھتا۔ مگر تم میرے دوست ہو اور اپنی لائف پارٹنر کے لیے جو تمہارے خیالات یا خواہشات ہیں ان کے

بارے میں بھی جانتا ہوں۔ جب تم نے پہلی بار مجھ سے منیر کے متعلق بات کی تھی تو میں نے کوئی خاص قسم کاری ایکٹ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد بھی تمہیں اس معاملے میں میری عدم دلچسپی کا احساس ہوا ہو گا۔ پہلے مجھے شبہ تھا بعد میں یقین ہوا کہ یہ وہی منیر ہے۔“ حذیفہ۔ ”اتم کیا کتنا چاہتے ہو؟“ انصر ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

”انصر! منیر میری سگی پھوپھو کی بیٹی ہے۔ میں انگلینڈ سے لوٹا تو کھر والوں نے بہت چاہت سے اس سے میری منگنی کر دی۔ میں خوش تھا منیر سے منگنی پر۔ مگر جن دنوں ہم شادی کی تیاریاں کر رہے تھے ان ہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ منیر میرے دوسرے کزن معین کو پسند کرتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش رہتے ہیں۔ تم چاہتے تھے تاکہ تمہیں ایک ایسی لڑکی ملے جس کا دل کورے کاغذ جیسا ہو۔۔۔ صاف ستھرے کردار والی۔ ایسی ہی خواہش میری بھی تھی۔ مگر منیر اور معین کو میں نے خود نازیبا حالت میں دیکھا۔ جس کی وجہ سے میری منگنی ٹوٹ گئی بلکہ میں نے خود ہی ختم کر دی۔ میں یہ سب تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ تم میرے دوست ہو۔۔۔ چاہو تو تحقیق کروا سکتے ہو کہ منیر میری کزن ہے اور مجھ سے ہی انگلیہ جلتی تھی۔

معین! نجیننگ کی اعلا تعلیم کے لیے ملایشیا چلا گیا۔ ابھی چند ماہ قبل اس کی تعلیم مکمل ہوئی ہے۔ اور وہ آنے والا ہے۔ ان دونوں کا اب بھی رابطہ رہتا ہے۔ مجھے نہیں پتا تمہارے لیے منیر نے کیونکر ہاں کی جبکہ آج تک وہ ہر رشتے کو ٹھکرائی آئی ہے۔ شاید پھوپھو اور انکل نے تمہاری امارت دیکھ کر اسے مجبور کیا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے آگاہ کیا کیونکہ اگر بعد میں یہ سب تمہیں پتا چلا تو مجھ سے ہی شکوہ ہو گا۔ اب تم بھی دوستی کا خیال رکھنا کیونکہ ہماری فیملیز کے تعلقات آپس میں کافی اتھھے ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ مجھ پر ہی برسیں تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ منیر تمہیں کتنی اہمیت دیتی ہے۔ شاید آج تک اس نے تم سے

ٹھیک سے بات بھی نہیں کی ہوگی۔ بس یہ ہی کہنا تھا مجھے۔“

خاموش ہونے کے بعد اس نے انصر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

محبت تو بارش ہے

جسے چھونے کی خواہش میں

ہتھیالیاں گیلی ہو جاتی ہیں

مگر اتھ بھٹ خالی ہی رہتے ہیں

وہ کھڑکی کا پٹ کھولے باہر برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ بجلی بھی ایک دو بار گرجی مگر وہ نہ ڈری نہ سہمی۔ بارش کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔ اس کا چہرہ بانو لقریبا "بھگ" جھکے تھے مگر وہ بے حس انداز میں ٹھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی ایک جھڑی سی چھڑی ہوئی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پارہی تھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے یا بارش کے پانی سے۔۔۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بے تحاشا رو رہی تھی۔

حذیفہ کے حوالے سے اس نے خواب دیکھے تھے ارمان اور آرزوئیں سجائی تھیں۔ وہ اس سے ملتی بھی رہی تھی۔ کچھ عموں دیکھا بھی ہوئے تھے اور پھر سب ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ حذیفہ نے کمال ہوشیاری سے اس کے وجود کو رازاں کر دیا تھا۔ انصر کے حوالے سے اس نے ابھی کوئی خواب نہیں دیکھے تھے۔ اس کے ارمانوں اور آرزوئیں برف سی جھی تھی۔ مگر اسے نجانے کیوں یہ توقع تھی کہ انصر اس برف کو پگھلا دے گا۔ اس کی پکلیوں پہ خواب سجائے گا۔ اس کی زندگی میں چھائی اداسی اور ویرانی کو ختم کر کے ہمارا پیغام بن جائے گا۔ وہ جانتی تھی انصر سے اس کی منگنی انصر کی خواہش کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ شاہانہ زندگی گزارنے والا رئیس۔ امیر خاندان کا چیم و چراغ جو کسی بھی امیر ترین حسین ترین لڑکی سے با آسانی شادی کر سکتا

تھا۔ وہ اس کا طلب گار بن کر آیا تھا۔ اپنی لائسنس انصر کے لیے اس نے منیہ کو چننا تھا۔ کیوں کہ کسی طرح بھی خاندانی امارت کے لحاظ سے اس کے برابر کسی نہ تھی۔ بلکہ کافی کم درجے پر تھی۔ کیا وہ اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوا ہو گا۔ نہیں وہ حسین ترین لڑکیوں سے بھی ملا تھا۔ پھر کیا تھا۔۔۔ کہ اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

شاید یہ کوئی جذبہ تھا۔۔۔ جذبہ محبت، منیہ عباس احمد سمجھنے لگی تھی کہ انصر ہی وہ شخص ہے جو اس کی زندگی میں محبت بن کر آئے گا۔ مگر وہ بھی اسے بچہ راہ میں چھوڑ گیا تھا۔ ایک نئے اور انجانے راستے پر لاکے خود ہی غائب ہو گیا تھا۔

آج صبح جس بچے مناز بیگم کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھیں۔

”انصر یہ منگنی ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ واپس یورپ جا رہا ہے۔“ سب حیران تھے اور وہ دنگ رہ گئی تھی ایک بار پھر وہ خود کو کھلونے کی طرح استعمال کیے جانے پر سناکت رہ گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر فرق بڑھ رہا تھا۔

اس کے دل میں درد اٹھ رہا تھا۔ آنکھیں بے اختیار ہو کر برس رہی تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا اور وہ دل کی پکار پر خود بھی سراسیمہ تھی۔ اس کا دل محبت محبت طلب کر رہا تھا۔ دل محبت کرنا ہے تو تب ہی محبت مانگتا ہے نا۔ کیا اسے انصر سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔

اسے مہینہ بھر ہو چکا تھا انگلیڈ آئے ہوئے۔ مگر سکون کا ایک مل نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت بھی رات کے دو بجے وہ سگریٹ پی سگریٹ پھونک رہا تھا مگر نیند تھی کہ جیسے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ ایک مہینہ قبل اسے اپنے بارے میں ایسا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی کی یاد اور محبت میں رات رات بھر جاگ سکتا ہے۔ منیہ کیا تھی۔ اس کی آئیڈل۔۔۔ وہ ان خوش

نصیبوں میں تھا جنہیں مل جاتا ہے وہ بھی اسے مل گئی بغیر کسی وقت اور پریشانی کے۔۔۔ پھر کیا ہوا کہ اس نے خود ہی اسے ٹھکرا دیا۔

وہ اس کے دوست کی سابقہ منگنی تھی۔۔۔ اس کا دوست بھی اسے ٹھکرا چکا تھا۔ کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اور جس کو پسند کرتی تھی اس سے اس کو کوئی اعتبار نہیں تھا۔ مگر انصر سے اس نے اعتبار برتا تھا اسے فون تک یہ اس سے باتیں کرنا گوارا نہیں تھا۔

منگنی ختم کرتے وقت وہ بے چینی، اضطراب اور یاسیت کا شکار تھا مگر اس کا خیال تھا انگلیڈ جا کر وہ سب بھول جائے گا۔ لہذا فوراً ہی وہ انگلیڈ چلا گیا۔ مگر وہاں جا کر اسے احساس ہوا۔ بے سکونی، بے چینی، بے قراری کتنے کس کو ہیں۔ گرل فرینڈ پارٹنر، میو، تقریر، ہلا گلا۔ اسے کہیں کوئی چارم نظر نہیں آتا تھا۔

دل کا درد اتنا بھڑک چکا تھا۔ منیہ کا چہرہ اس کی باتیں، اس کی آنکھیں جیسے اس کے حواس سل کرنے لگی تھیں اور بلا آخر وہ جان گیا تھا، محبت اسی کو سنتے ہیں۔ مگر اسے منیہ سے محبت کیوں ہوئی تھی اس میں ایسی کون سی بات تھی جس نے انصر جیسے دل پھینک اور ہر جانے شخص کے دل کی دنیا کو تہہ وبالا کر دیا تھا۔ ان آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی جو اسے تیار رہی تھیں۔۔۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

معین کو پاکستان آتے ہی ان سب حالات کا علم ہو گیا تھا اور وہ منیہ سے خوب لڑا تھا۔

”آخر کب تک تم حذیفہ کے ہاتھوں خود کو برباد کرتی رہو گی۔۔۔ انصر کو ساری صورت حال کیوں نہیں بتائی۔ گھر والوں کو کیوں نہیں بتایا کہ حذیفہ تمہارے پاس آیا تھا اپنے جرم کی معافی مانگنے نہیں بلکہ تمہیں مانگنے جسے اس نے بے دردی سے ٹھکرایا تھا۔ جب اس نے تمہیں بتایا کہ انصر اس کا دوست رہ چکا ہے اور اس کے کردار کے بارے میں تمہیں ورغلا نا چاہا تو کیا یہ

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

جولائی 2012ء کے شمارے کی جھلک

تین سلسلے وار تحریروں

اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ معروف مصنف اسلم راہی کے قلم سے

وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک تھی۔۔۔ اس کو نانا جانے کون کون سی ہتھکڑیاں حاصل تھیں۔۔۔ غزالہ جلیل راؤ کی تہلکہ خیز سلسلہ وار تحریروں

سرزمین پنجاب کی حسین وادی جہلم کا ایک سادہ لوح جوان جو دشمن کے لیے ناقابل تسخیر نولاد بن گیا۔ ایم اے راحت کے قلم سے

اس کے علاوہ احمد صغیر صدیقی کی ”برائے انصاف“ ایم ایس کی ”زنجی شیرنی“ صفدر شاہین کی ”ہولناک ایڈوچر“ محمد مقصود خان کی ”حسب الحکم“ حسن علی خان کی ”ہم ذوق“ وقار بن سعید کی ”آمد و شد“ دانش کمال کی ”تشنہ جاں“ محمد صدیق طاہر کی ”مریض کا قل“ صابر علی ہاشمی کی ”پیکار مباحث“ اردو ادب سے انتخاب میں شوکت صدیقی کی ”خان بہادر“ ابراہیم جلیس کی ”کالے چور کے نام“ رام لعل کی ”پہلا آدمی“ سچی داستانوں میں ہما صفدر کی ”باگھل نہ ہو جاؤں“ نواز شاہین کی ”داغ دار“ محمد سلیم اختر کی ”شاہو“ اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کے قلم سے معاشرتی ناول ”زرگزشت“

آج ہی قریبی بکسٹال سے تازہ شمارہ حاصل کر لیں

ممکن نہیں کہ وہ انصر کو جا کے تمہارے خلاف بھڑکا دے اور ایسا ہوا بھی تب جب وہ دونوں قبل تم سے مل کر گیا تھا جب تمہاری طرف سے اسے رسائیں نہیں ملا تو اس نے انصر کو آلہ کار بنالیا اور وہ مکاری کر کے ایک بار پھر حیات گیا۔

معین کی بات پر منیرہ کا کاسی اسے دیکھنے لگی۔ ”منیرہ! بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے تمہاری عقل پر۔ پتا ہے تم سمجھ داری اور نہایت میں مجھ سے کئی قدم آگے تھیں بلکہ اوروں سے بھی۔ مگر اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملے میں تم نے بہت بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے۔ تم انتہائی کم ہمت نکلی ہو۔ مگر میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا خود بات کروں گا انصر بھائی سے۔ بہت ہو گیا۔“ وہ اٹھ اٹھانڈا میں کتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ منیرہ اسے روک نہ پالی۔ حذیفہ حسن کی اس نئی چال پر وہ سکتے میں آگئی تھی۔

معین نے نجانے کیسے انصر کا نمبر حاصل کیا اور پھر اسے کال کی تھی۔ ابتدائی باتوں کے بعد انصر نے اس سے اس کا نام پوچھا تھا۔

”سوری۔ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا“ آپ کو جب تک آپ پر اپنے دوست حذیفہ کی اصلیت نہ ظاہر ہو جائے۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

”حذیفہ میرا دوست ہے مگر مجھے اس کی اصلیت میں کوئی انٹرنٹ نہیں ہے۔“ اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔

”منیرہ میں تو ہے۔“ انصر جواب میں چپ رہ گیا تھا۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ اس نے بے ساختہ پوچھا اور پھر معین نے اسے منیرہ کی حذیفہ سے متعلق سے لے کر آج تک کی ساری حقیقت بتادی۔

”مسٹر انصر آپ کا دوست ایک نمبر کا مکار انسان ہے۔ وہ منیرہ کو پھر سے حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اپنی بیوی سے تنگ آچکا ہے۔ اس کے لیے اس نے وہی پرانا ٹھکانہ کھلیا جو اس نے ماہم کو حاصل کرنے کے لیے کھلیا تھا۔“

انصر سکتے کے عالم میں اس کی باتیں سنتا رہا۔

”اور اب میں آپ کو اپنے بارے میں بھی بتا دیتا ہوں۔ میں معین، ل۔ جو منیرہ کا ہم عمر کلاس فیلو اور کزن ہونے کے ناتے شروع سے اس کے قریب رہا مگر قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں میں سبھی بن سے بھی زیادہ اس کی عزت کرتا ہوں۔ اور اس کا ثبوت اس بات سے دیتا ہوں کہ میٹرک میں اپنی کلاس فیلو آصفہ سے میری دوستی ہو گئی تھی جو منیرہ کی بیسٹ فرینڈ بھی ہے اور منیرہ شروع سے آگاہ ہے۔ یہ دوستی جو بعد میں محبت میں بدل گئی آج تک قائم ہے اور اس میں بڑا ہاتھ منیرہ کا ہے۔ جب میں تعلیم کے لیے ملائیشیا میں تھا تو منیرہ نے ہی اسے میرے لیے روکے رکھا ورنہ اس کے والدین اس کی جلد شادی کرنا چاہتے تھے۔ منیرہ نے ہی میرے گھر والوں کو آصفہ کے لیے راضی کیا اور اب میں بہت جلد اس سے شادی کرنے والا ہوں لہذا آپ۔“

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ فون بند ہو چکا تھا۔

وہ بڑے منہمک انداز میں فائل میں گم تھا جب اسے اپنے آئین کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے سنا تھا انصر واپس انگلینڈ جا چکا ہے مگر وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”انصر تم! وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں میں۔۔۔ بے وقت اور بے مروت آنے کی معافی چاہتا ہوں مگر میں بھی آج بس کھڑے کھڑے ہی چند باتیں کرنا چاہوں گا کیونکہ تمہارا وقت اور کام اہم ہیں۔“ اس کے لہجے میں جھنجھٹا طنز اور نفرت تھی۔ حذیفہ چونک گیا۔

”حذیفہ! جب میں انگلینڈ میں تھا تو تم پر بہت رشک کرتا تھا اور تم سے بہت متاثر تھا۔ کیونکہ تم میں ایسی بہت سی خوبیاں تھیں جو ایک اچھے مسلمان میں ہونی چاہئیں۔ جبکہ میں ہر قسم کی برائی میں ملوث تھا۔ اس میں بڑا ہاتھ روپے پیسے کی فراوانی کے علاوہ میرے

باحول اور اسٹیٹس کا تھا۔ میرے والدین ماڈرن سوسائٹی کی نمائندگی کرنے والے مجھے بھلا کر سمجھاتے۔۔۔ انہوں نے مجھے پوری آزادی دی اور اس آزادی کو میں نے خوب استعمال کیا مگر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا تھا۔ اک احساس زیاں ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ میں جب موت قبر اور حشر کے بارے میں سوچتا تو خود سے نفرت محسوس ہونے لگتی۔ اور پھر ایسی ہی صورت حال میں میں نے ارادہ کر لیا کہ ماڈرن سوسائٹی کی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ بلکہ ایسی عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہے جو مجھے برائی سے بچنے کے علاوہ میری آئندہ نسل کو سنوار دے۔ میں جانتا ہوں ایک اچھی بیوی شوہر پر کتنا اثر انداز ہوتی ہے خاص کر مال کے روپ میں اس کا رول کتنا اہم ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں پاکیزہ زندگی گزاروں اور مرنے کے بعد میری نیک اولاد میرے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔ منیرہ مجھے اپنے اسی آئینہ کیل کے روپ میں ملی اور تم حذیفہ! جس پر میں رشک کرتا تھا کہ اس شخص کو کبھی کوئی احساس زیاں نہیں ستائے گا۔ کیونکہ اس کا کردار بہت صاف ہے۔ اس کی زندگی میں اس کے اعمال میں کوئی گناہ شامل نہیں مگر آج مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے تم نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے احساس زیاں پالا۔

خود غرضی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم نے ہر شے کو دھوکا دیا۔ مال باپ، منگیتر اور پھر دوست کو بھی دھوکا دیا۔۔۔ تم نے میرا بہت بڑا نقصان کر دیا تھا مگر معین نے بچا لیا میں ساری عمر اس کا ممنون رہوں گا۔ آج مجھے اس بات پر مکمل یقین آ گیا کہ اللہ نیتوں کو دیکھ کر دیتا ہے میری اور تمہاری دوستی مزید قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے میں کم از کم تمہیں کسی قریب میں نہیں رکھنا چاہ رہا۔ اوکے بائے۔“ وہ کہہ کر رگائیں نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا حذیفہ کو جیسے منجمد کر گیا تھا۔

چلیہ عروسی میں وہ تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کا حسن شمع کی طرح دہک رہا تھا۔ اس

کا ہم سفر اسے چاہنے والا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے رونمائی میں بنایا پھر اور پھر بے جزا انگن دیا تھا۔ جسے وہ بڑے ناز سے چھو رہی تھی۔

”بیوی ہونے کی حیثیت سے مجھے آپ سے صرف ایک وعدہ چاہیے۔“ اس نے خوب صورت لہجے میں پوچھا۔

”میں ہزار وعدے کرنے کو تیار ہوں۔ کو کیا کہتی ہو۔“ وہ وہاں انداز میں بولا۔

میں صرف یہ چاہتی ہوں آپ کبھی کسی معاملے میں مجھ سے جھوٹ نہیں بولیں بلکہ مجھ پر اعتبار کر کے صاف صاف بات کریں۔“

”تمہیں ان معاملات میں کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔ اور ہاں مجھے تم پر اتنا اعتبار ہے کہ اگر تم دن کو رات کو کوئی تو میں مان لوں گا!“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پریقین لہجے میں کہا۔

”یہ حکم تو بیوی کے لیے ہے۔“ وہ ہر جہت بولی۔

”اگر بیوی کروار اور تقویٰ کے لحاظ سے شوہر سے بلند مقام پر کھڑی ہو تو شوہر کے لیے ایسا کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔“

منیرہ کے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ منیرہ کو قدرت نے آزمائش کے بعد انصر کی شکل میں انعام سے نوازا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

آسیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ خطی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو و کھرا آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

میرے خوابوں کا گھر

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا رہتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔ یاسمین اور شہباز درانی کی نامناسب گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچا لیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اسپتال میں اریبہ کے پاس ساجدہ بیگم ٹھہری ہوئی ہیں۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد نے اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہا۔ بعد میں انہیں پتا چلا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔ وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اریبہ ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے۔ وہ اسے شہباز درانی کے ساتھ دیکھ چکی ہے۔

رازی اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔ تاجور کو اسپتال سے باہر روٹے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔ توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ دل گرفتہ ساہیپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔



وہاں سے وہ گاؤں جاتا ہے مگر ابا کو نہیں بتاتا۔ تاہاں کی شادی ہو جاتی ہے۔ سارہ، سمیر سے ابھی ہوئی ہنسنگو کرتی ہے۔
یا سمین، ارمیہ کی چلد شادی کی فکر میں پڑ گئی مگر ارمیہ سختی سے منع کر دیتی ہے۔ یا سمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے
داروں کو زبردستی مدعو کرتی ہے۔ اجلاں مضطرب سادہ دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر ارمیہ بھی ابھن کا شکار ہوتی
ہے۔
بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ جا رہا ہے۔ ارمیہ اور اجلاں اسے سی آف کر کے واپسی میں سی ویو جاتے ہیں۔ وہاں اسے
سارہ کا خیال آ جاتا ہے۔ وہ گھبرا کر واپس آ جاتا ہے۔

گیان سونے قندیل

زندگی اس کے لیے ایسا امتحان بن جائے گی کہ دو گام چلنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسا شیر علی نے کبھی سوچا بھی
نہیں تھا۔ وہ اپنی محنت سے زینہ بہ زینہ ترقی کی منازل طے کر رہا تھا اور بہت مطمئن تھا۔ کبھی کبھی سیدھی شفاف
سرک پر جیسے اچانک دھڑلوان آ جاتی ہے کہ چلنے والے کو پتا ہی نہیں چلتا اور وہ منہ کے بل جا کر تباہ ہے۔ اس کے
ساتھ بھی یہ ہوا تھا۔ تیز روشنی کے بعد اچانک گھب اندھیرا تھا۔ اسے کچھ سمجھا ہی نہیں دے رہا تھا۔ تاہاں کے
ساتھ شام بھی کب کی رخصت ہو چکی تھی اور وہ ابھی بھی وہیں بیٹھا تھا۔ نہوائے بنگ کے اسی مخصوص گوشے میں
جودن کے اجالے میں جتنا خوب صورت دکھائی دیتا تھا، اب اسی قدر خوفناک لگ رہا تھا۔ لیکن وہ یہ سب کہاں
سوچ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو بس ایک ہی منظر ٹھہر گیا تھا۔

تاہاں جا رہی تھی۔ اس کی زندگی جا رہی تھی۔ اب اس کے پاس کیا تھا۔ جینے کو بھی ہمارے چاہیے اور یہاں
سارے ہمارے ختم ہو گئے تھے۔ لیکن نہیں۔ ابھی کچھ باقی تھا۔ نہر کے اس طرف خانہ بدوشوں کے خیموں میں
شمعیں روشن ہو رہی تھیں۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا پھر بھاگنے لگا تھا۔ اور جب گھر پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔
”کہاں چلا گیا تھا؟“ ابا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا وہ ان کے سامنے بھی چارپائی پر ڈھے گیا۔
”دیکھ شیر علی! ابا اس کی کیفیت سے بے خبر اپنا بولنا شروع ہو گئے۔

”تو یہاں اس گاؤں کا جمل ہے۔ تجھے شہر اس نہیں آئے گا۔ بندہ اڑان اتنی بھرے جتنی پروں میں طاقت ہو۔
نہیں تو پھر پھڑکنے کی بھی مسلت نہیں ملتی۔

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں شاید کان بند کرنا چاہتا تھا۔
”تو نے اپنا بڑھنے کا شوق پورا کر لیا۔ نوکری کر کے بھی دیکھ لی اب ادھر ہی آجا۔ میرے ساتھ کھیتی باڑی کر، کم از
کم اپنی زمین دعا تو نہیں دے گی نوکری کی طرح۔ سن رہا ہے نا۔“
”ہوں۔ اس نے پورا زور لگا کر ہوں کی آواز نکالی تھی۔ یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس وقت اختلاف کی
پوزیشن میں نہیں تھا۔

”ناجور کو بھی لے آ۔ اکیلی لڑکی کو ادھر چھوڑ آیا ہے۔ کچھ غیرت ہے تجھ میں کہ نہیں۔“ ابا نے جانے انجانے
میں اسے جھجھوڑ دیا تھا۔ وہ بلبلہ لڑکا تھا تھا۔

ابا بولنے سے پہلے کچھ سوچ بھی لیا کریں۔“
”کیا سوچ لوں۔ بول۔ سچ بات کرو گی لگتی ہے تجھے۔ حیا مر گئی ہے تیری۔ کان کھول کے سن لے شیر میری بیٹی
کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوئی تو میں تجھے نہیں بخشوں گا۔“ ابا ہتھ سے اٹھ کھڑے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی غصہ

ان کی ناک پہ دھرا رہا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہے تھے اسی خوف سے تو اس کی جان پہنسی ہوئی تھی۔ وہ بار بار مر
رہا تھا اور ہر بار ناجور کی بیکار سے جیسے قبر میں سے کھینچ لاتی تھی۔
”میسورے جا کر ناجور کو لے آ۔“ ابا حکم صادر کر کے لیٹ گئے۔ اس کا دل چاہا۔ ابا کے پیروں سے لیٹ کر بہت
روئے اور انہیں بتائے کہ وہ ناجور کو کھو چکا ہے لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی اور ہمت تو اس کی وہ قدم چلنے کی بھی
نہیں تھی پھر بھی اس نے اسی وقت جانے کی ٹھان لی تھی۔

”میسورے اور ہے ابا! میں ابھی جا رہا ہوں۔“ وہ بمشکل بول پایا پھر ابا کے پیر چھو کر گھر سے نکل آیا تھا۔
رات بھر کی مسافت کے بعد وہ کراچی پہنچا تو اس وقت جبری اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس اپنا ٹھکانا تو تھا
نہیں۔ بس سے اتار اور کشتہ پکڑ کر سیدھا فضل کریم کے گھر جا پونچا۔

”لے باؤ! تجھے آنا تھا تو فون کر دیتا۔ میں تیرے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیتا۔ ایویں اتنی دیر باہر کھڑا رہا۔ اس کے
مسل دروازہ پھینکنے کے باوجود فضل کریم کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ مزید اسے الزام دیتے ہوئے فضل کریم

واپس اپنی جگہ پر گر کر سو گیا۔ اور وہ بھی اب صرف سونا چاہتا تھا کیونکہ بس کے سفر نے بری طرح تھکا دیا تھا پھر بھی
وہ لیٹتے ہی سو نہیں گیا تھا۔ کتنی کوٹیں بدلیں۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ گیا یہاں تک کہ اجلاں پھیلنے لگا تھا تب کہیں جا کر نیند
مہمان ہوئی تو پھر وہ بہت لمبا سوچا تھا۔

دوپہر دھل رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلے اس نے اپنے طے شدہ پروگرام کو نئے سرے سے سوچا جس
میں سرفہرست روزگار حاصل کرنا تھا کہ اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود تھی کہ اس کے چھ اٹھ مہینے آرام
سے گزار سکتے تھے، لیکن وہ اتنی رقم پر تکیہ کر کے فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا اور فی الحال اسے فل ٹائم جاب بھی نہیں
کرنا تھی کیونکہ اس طرح بایا نہ ہو کر وہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا جبکہ اسے ناجور کو تلاش کرنا تھا۔ اس لیے اس
نے پارٹ ٹائم جاب کا سوچا تھا اور ابھی اسی سلسلے میں ایک دو جاننے والوں سے ملنے کا سوچ کر وہ اٹھ گیا تھا۔



ناجور نے قرآن پاک پڑھنے کے ساتھ لی بی سے نماز بھی سیکھ لی تھی اور اب وہ قاعدگی سے نماز پڑھنے لگی تھی
جس سے اس کے اندر مستقل جو ایک بے پستی اور بے صبری کی کیفیت تھی اس میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ یعنی وہ
جو بیٹھے بیٹھے تڑپ اٹھتی تھی۔ دل چاہتا بس فوراً اپنے بھائی کے پاس پہنچ جائے یا اس کا بھائی آجائے تو اب ایسا
نہیں تھا۔ رب سے رجوع کر کے اس کے اندر گھبرائو لگا تھا اور وہ ہر نماز میں اپنے بھائی کی سلامتی اور عافیت کی دعا
کرتی۔ اس وقت مغرب کی نماز کے بعد وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔

”میرے اللہ! میرا بھائی جہاں کہیں بھی ہے اسے اپنی امان میں رکھنا۔ میرے بھائی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ وہ ہر
امتحان میں پاس ہو۔ میرے اللہ میرے بھائی کو گھر دے دے پھر وہ آکر مجھے لے جائے۔ میرے اللہ میرے بھائی کی
مدد کر۔ آمین۔“

منہ پر ہاتھ پھر کر وہ اٹھی اور نماز لیٹ کر پٹی تو سارہ کو کھڑے دیکھ کر کچھ کنفیوز ہو گئی تھی۔
”بھئی واہ! میں ہو تو تمہارے جیسی“ سارہ اسے سراہ کر کہنے لگی۔ ”بہت خوش قسمت ہے تمہارا بھائی۔ مجھے
یقین ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، تمہاری دعاؤں کے حصار میں ہوگا۔“ ناجور نا کھجی کے عالم میں سارہ کو دیکھے جا
رہی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم بہت خالص لڑکی ہو۔ تم پر دنیا کا رنگ نہیں چڑھا۔ چڑھنے بھی

مت دینا۔ دنیا بہت بری ہے۔ ہر رنگ میں بری ہے۔
”مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہیں یا بی۔“ تاجور کے لہجے میں نہ سمجھنے کا لالال تھا۔
”اچھا ہے، کچھ مت سمجھو، ساری خرابی ہی سمجھنے میں ہوتی ہے۔“ سارہ نے کہہ کر یوں سر جھٹکا جیسے کسی تکلیف دہ کیفیت سے نکلنا چاہتی ہو۔

”یا بی! ایک بات پوچھوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی؟“ تاجور سے ساوگی سے کہا۔
”پوچھو۔۔۔“ سارہ نے پہلے بے دھیانی میں کہا پھر ایک دم اسے دیکھنے لگی تھی۔
”آپ کے ابا آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟“ تاجور پوچھتے ہوئے خائف ہو گئی تھی۔ سارہ کو ہنسی آ گئی۔
”میرے ابا ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ اس لیے کہ انہوں نے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ وہاں رہتے ہیں دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ۔“

”ہیں۔۔۔!“ تاجور کی حیرت میں ڈوبی ”ہیں“ پر سارہ خاصی محظوظ ہوئی پھر کہنے لگی۔
”ہاں۔ اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔ تمہارے ابا نے بھی تو دوسری شادی کی ہے۔“
”ہاں پر میری اماں تو۔“ تاجور نے خود ہی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن سارہ سمجھ گئی تھی جب ہی بے ساختہ بولی تھی۔

”میری اماں زندہ ہیں اور بہت پیاری بھی ہیں۔ یہی سوچ رہی ہوں تم۔“
”جی۔۔۔!“ تاجور نے فوراً اثبات میں گردن ہلاتی تھی۔ سارہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر نفی میں سر ہلا کر بولی تھی۔

”تم نہیں سمجھ سکو گی شاید میں تمہیں نہیں سمجھا سکوں گی۔“
”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں یا بی! مجھے آپ کی باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ تاجور نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا تھا۔
”لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو تاجور! ابھی کسی پر بھروسہ مت کرنا۔“ سارہ اچانک بہت سنجیدگی سے کہہ کر پھر ایک دم اس کے کمرے سے نکل گئی تھی اور یہ نہیں تھا کہ سیدھی ساوی بات تاجور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
سمجھ میں نہ آنے والا سارہ کا پل بدلتا تو یہ تھا۔ وہ اچانک ہنستی تھی اور اچانک یوں ہو جاتی جیسے وہ ہنستا جاتی ہی نہیں۔ اس طرح تاجور جتنا اس کے قریب ہوتا ہی اسی قدر دور ہو جاتی تھی۔

”کیا ہو جاتا ہے سارہ یا بی! کو۔“ وہ سوچنے لگی تھی کہ اچانک روٹی پکانے کا خیال آنے پر اس کا دھیان بٹ گیا۔
”نور!“ کمرے سے نکل کر کچن میں آئی تو بی بی جو لمبے پر تو اکھ رہی تھیں۔
”میں آگئی ہوں بی بی! آپ ہٹ جائیں۔“ وہ بی بی کو ہٹا کر جلدی جلدی بیڑے بنانے لگی۔
”تم نکلا کر دو گی مجھے۔ چلی جاؤ گی تو مجھے کتنی ریشالی ہو گی۔“

بی بی سنک پر ہاتھ دھوئے ہوئے بول رہی تھیں اور اسے یہ سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ دل چاہتا بی بی سے لاڈ کرتے ہوئے کہے ”میں نہیں جاؤں گی بی بی! لیکن اپنے دل کی اس معصوم خواہش کو وہ ہمیشہ دبا دیتی تھی کیونکہ اسے خود پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک یہاں رہے گی۔ ہر حال اس گھر کے کینوں سے وہ نہ صرف مانوس ہو گئی تھی بلکہ محبت بھی کرنے لگی تھی۔ بس ایک یا سیمین بھی جس سے وہ خائف رہتی تھی گو کہ یا سیمین اس سے بات کرنا تو دور کی بات، کبھی غلطی سے اسے مخاطب بھی نہیں کرتی تھی مزید دیکھ کر بھی انجان بن جاتی تھی۔ شاید اس کی طرف سے حد سے زیادہ نظر انداز ہونے پر یہ وہ خائف بھی اور کوشش کرتی تھی کہ یا سیمین سے سامنا نہ ہونے پائے۔ اس لیے وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں یا پھر بی بی کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

”کھانا ابھی لگا دوں بی بی!“ اس نے روٹی پکانے سے فارغ ہو کر پوچھا۔
”نہیں بی بی! اتنی جلدی تو کوئی نہیں کھانا۔ پھر ابھی حماؤ اور اسیبہ بھی نہیں آئے۔“ بی بی نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔
”اسیبہ یا بی کی کہاں گئی ہیں۔“
”اپنی مائی کے ہاں جانے کا کہہ رہی تھی اور ہاں، تمہیں بھوک لگی ہو تو تم کھاؤ۔“ بی بی نے جواب کے ساتھ کہا۔

”ابھی نہیں بی بی! نماز کے بعد وہ کہہ کر کچن سے نکلی تو پھر اپنے کمرے میں جا بیٹھی تھی۔“



اسیبہ شام سے ساجدہ بیگم کے ہاں آئی ہوئی تھی اور اس نے گھر سے نکلنے وقت ہی اجلال رازی کو فون کیا تھا کہ وہ اس کے گھر جا رہی ہے اس کے باوجود اجلال رازی نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی مزید معذرت کے بجائے انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔
”ارے! تم کب آئیں؟“

”بس آگئی۔“ اسیبہ کو ساجدہ بیگم کی موجودگی کے باعث ضبط کرنا پڑا تھا۔
”چلو بیٹا جلدی سے کپڑے بدل کر آ جاؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔“ ساجدہ بیگم نے اٹھتے ہوئے اجلال رازی سے کہا تو اسیبہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ انتظار کے بعد رازی کے رویے نے اسے بدل ہی نہیں انھیں بھی پہنچائی تھی۔

”تائی امی! میں اب چلوں گی۔“
”ہائیں! ایسے کسے جاؤ گی، کھانا کھا کر جانا۔“ ساجدہ بیگم نے ٹوک کر کہا۔
”نہیں تائی امی! مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ شام میں آپ نے اتنا کچھ کھلادیا تھا۔ اب کھانا تو میں کھاؤں گی ہی نہیں۔“ اس نے بھوک نہ ہونے کی وجہ بھی بتادی پھر بھی ساجدہ بیگم اصرار کرنے لگیں۔
”بیٹا! تھوڑا سا کھاؤ۔ اچھا نہیں لگتا عین کھانے کے وقت تم چلی جاؤ۔“

”کوئی ایسی بات نہیں ہے تائی امی! آپ محسوس نہ کریں میں پھر آ جاؤں گی۔“ وہ کہتے ہوئے ساجدہ بیگم کے گلے لگ گئی اور انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ خدا حافظ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل آئی اور ابھی گاڑی کا لاک کھول رہی تھی کہ عقب سے اجلال رازی نے اس کے کندھے تھام لیے۔
”ناراض ہو کر جا رہی ہو؟“

”کیوں میں کیوں ناراض ہوں گی۔ مجھے کیا حق ہے تم سے ناراض ہونے کا۔“ وہ اچانک بکھر گئی تھی۔ ”اب تو سارے حق تمہارے ہیں۔ چاہو پیار سے بلاؤ، چاہو دھتکار دو۔ میری پرمانے کی اوقات ہی نہیں رہی۔“
”یہ تم کیا کہہ رہی ہو اسیبہ! بالکل تو نہیں ہو گئیں۔“ اجلال رازی پریشان ہو گیا تھا۔
”نہیں۔ میں بالکل نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔ مجھے بتاؤ ہم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو۔ محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک نفرت سے منہ موڑ کر کیوں چل دیتے ہو۔ بتاؤ رازی بتاؤ۔“ وہ اس کے دونوں بازو تھام کر جھنجھوڑنے لگی تھی۔
”تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو صاف کہہ دو۔ خود پر جبرمت کرو رازی! اور نہ مجھے اذیت دو۔ میں ایک ہی بار تمہاری بے وفائی کا نام کر لوں گی۔ یوں مر مر کے جینا مجھے سچ مار ڈالے گا۔ میں مرجاؤں گی رازی۔“

”اربیہ! جلال رازی اس کا چہرہ تھو میں لینا چاہتا تھا لیکن وہ چل رہی تھی آنسو بے تحاشا بہہ رہے تھے۔“

”میری بات سنو! اربہ! مجھے غلط مت سمجھو میں نے صرف تم سے محبت کی ہے، صرف تم سے۔ میرے دل میں صرف تم بستی ہو صرف تم۔“

”مت بھلاؤ مجھے تمہارا بار بار اجنبی بن جانا میرے دل میں ترازو ہو گیا ہے۔“ وہ اسے دھکیل کر پھر گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”دیکھو! ایسے مت جاؤ۔ تم ابھی ڈرائیو نہیں کر سکو گی۔“ جلال رازی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”تم؟“ وہ انتہائی مغرور سے جانے لیا کہنے جارہی تھی کہ جلال رازی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

”بس۔ تم نے جو کتنا تھا کہہ دیا اور میں ابھی کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ تم اس وقت غصے میں ہو میری بات نہیں سمجھو گی۔ الٹا اور ناراض ہو گی۔ چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“

”نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔“ وہ روٹنے لہجے میں بولی تھی۔

”خدا نہیں کرتے اربہ۔“ وہ بہت پار سے اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔

”میں ضد نہیں کر رہی۔“ اربہ نے آنسو لگی سے اس کے ہاتھ ہٹائے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

اب اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی۔ اسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔ جلال رازی خود آ کر اپنے رویے پر نام ہو نا اور وضاحت بھی کرنا کہ وہ یو یو پر اچانک ناراض کیوں ہو گیا تھا۔

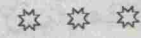
”اسے وضاحت تو کرنی پڑے گی۔ میں کیوں خود کو اتنا کر رہی ہوں؟ اسے سارہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔“

”مت خود کو اتنا گراؤ کہ دوسرا سو تو اس آسمان پر پہنچ جائے دھڑلے سے سر اٹھا کر چوسیدہ تمہارا حق ہے۔ کوئی تمہارے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا۔“

بے وقوف ہے سارہ اور انجان بھی اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ہم کس ماں کی بیٹیاں ہیں تو وہ بھی شرم سے سر نہیں اٹھا سکے گی۔“ وہ اپنی بے وقعتی پر کڑھتے ہوئے گھر آئی تو اپنے کمرے میں بند ہو جانا چاہتی تھی لیکن وہاں پہلے ہی سارہ موجود تھی۔

”اتنی دیر کر دی۔“ سارہ نے فوراً ٹوکا لیکن پھر اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھنک گئی۔ ”کیا بات ہے اربہ! سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”ہاں سب ٹھیک ہیں بس ایک میں ہی غلط ہوں۔“ وہ کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی۔



جلال رازی کے اندر مستقل ایک جنگ جاری تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اربہ اس کی زندگی تھی۔ اس کے دل میں ساری آرزو میں صرف اسی کے لیے چلتی تھیں۔ لیکن اس کا ذہن قدم قدم پر اسے احساس دلاتا تھا کہ وہ کچھ بھول رہا ہے۔ کوئی ہے جس کے خاموش آنسو اسے کبھی چین نہیں لینے دیں گے اور وہ اربہ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکے گا۔

اور یہ اس عورت کی گود اور تربیت کا اثر تھا جو وہ کسی طرح بھی خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے پا رہا تھا۔ حالانکہ دل مسلسل اس کا اتنا تھا کہ حاشہ ہی تو تھا۔ بھول جاؤ۔ اور واقعی کتنے دنوں تک اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا لیکن پھر

اچانک کوئی بات اسے آسمان سے زمین پر لا چلتی تھی۔ وہ بلبلاتا اٹھتا اور اب تو اربہ نے بھی نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ اس سے سوال بھی کر رہی تھی کہ وہ اچانک اس سے دور کیوں ہو جاتا ہے۔

”مجھے بتاؤ رازی! محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک نفرت سے منہ موڑ کر کیوں چل دیتے ہو۔“

”میں کیسے بتاؤں اربہ کو اور کیا بتاؤں۔“ کتنے دنوں سے وہ اپنے آپ میں ابھ رہا تھا۔ کبھی سوچتا اربہ کو اعتماد میں لے کر سب بتا دے لیکن فوراً ہی خیال آتا کہ اگر وہ نفرت سے منہ موڑ کر چل گئی تو پھر وہ کبھی اسے نہیں مٹا سکے گا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ وہ روزانہ خود سے سوال کر کے سوچتا تھا اور بالآخر اسے ایک راستہ بھائی دے گیا تو پھر اس نے دیر نہیں کی۔ اسی وقت تو صیف دلا کہ نمبر ڈال کے تھے۔

”ہیلو۔“ سارہ کی آواز سن کر وہ ایک لحظہ کو ڈگمگایا تھا پھر فوراً ”سنبھل کر بولا۔“

”سارہ۔ میں رازی بات کر رہا ہوں۔“

”جی رازی بھائی! میں اربہ کو بلاتی ہوں۔“ سارہ نے کہا تو اس نے فوراً ”ٹوک دیا۔“

”نہیں سارہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”کیا بات؟“ سارہ مختصر تھی۔

”بہت ساری باتیں ہیں۔ فون پر نہیں ہو سکتیں اور نہ گھر پر۔ میں تمہیں کالج سے پک کر لوں گا۔ دیکھو! انکار مت کرنا۔ میں جس اذیت میں مبتلا ہوں اس سے تم ہی مجھے نکال سکتی ہو۔ بتاؤ کب آؤں؟“ اس کے ہاتھی لہجے پر سارہ جزبہ ہو کر رہ گئی بولی کچھ نہیں تھی۔

”سارہ پلیز۔“ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ بہت ضروری ہے اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو کتنی زندگیاں داؤ پر لگ سکتی ہیں۔“

”خدا کے لیے رازی بھائی! اچپ ہو جائیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“ سارہ تڑپ کر بولی تھی۔

”کر سکتی ہو۔“ وہ زور دے کر بولا تھا۔ ”تم نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ہمیشہ مجھے سہارا دیا ہے۔ جب اربہ مجھ سے ناراض تھی تب بولو کون مجھے۔“

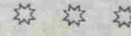
”کیا اربہ پھر آپ سے ناراض ہو گئی ہے؟“ سارہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بے اختیار بول پڑی تھی۔

”نہیں۔ لیکن ہو بھی سکتی ہے۔“ وہ جیسے ڈھمکے گیا تھا۔

”کیوں اب کیا ہو گیا ہے؟“ سارہ نے جیسے بادل غمازہ پوچھا تھا۔

”میں بتانے کے لیے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ملوکی ناں؟“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ سارہ نے سوچ کر ہائی بھرتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ ریمیور رکھ کر اسی منہ پر سوچنے لگا کہ وہ سارہ سے کیا بات کرے گا۔



شمیر علی کو پارت ٹائم جاب کے لیے بہت زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی تھی۔ تعلیم اور تجربے کی بنا پر جلد ہی اسے اپنے مطلب کی جاب مل گئی تھی۔ اس کے بعد وہ رہائش ڈھونڈنے میں لگ گیا کہ وہ کس کیم کے ہاں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ خود فضل کریم اس سے یہی کہتا تھا کہ جب تک وہ چھڑا چھانٹے، آرام سے اس کے ساتھ رہے اور وہ بھی مل سکتا تھا لیکن تو صیف احمد سے انتقام لینے کا جو پلان اس نے سوچ رکھا تھا۔ اس کے لیے اسے شہر سے دور رہائش اختیار کرنا بھی اور یہ کام بہت رازداری سے کرنا تھا۔ فضل کریم کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا

کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے فضل کریم کسی مشکل میں پھنسے جبکہ خود وہ ہر مشکل کا سامنا کرنے کو تیار تھا۔ شاید اس لیے کہ اب اس کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔

بہر حال چاہے ہی اس نے اپنی جمع پونجی سے سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی تھی جس سے اسے کافی سہولت ہو گئی تھی۔ صبح فضل کریم کے ساتھ ہی وہ صبح کے لٹا تو پہلے اسے ہاسپٹل چھوڑنا پھر رہائش کی تک دو کرنا اور دو بجے اپنی جاب پر پہنچ جاتا۔ جہاں سے رات آٹھ بجے اس کی واپسی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کوئی الحال اس نے خیر یاد کر دیا تھا۔ جس کا اسے ملال بھی تھا کیونکہ صرف دو مسٹر بانی رہ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ چار مڑا کاؤنٹنٹ کھانا جو کہ اس کا خواب تھا۔

اس وقت وہ فضل کریم کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں اسے بتانے لگا۔

”میں نے گھر دیکھ لیا ہے فضل کریم! آج سارے معاملات طے ہو جائیں۔ پھر میں ایک دو دن میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔“

”تو براضدی ہے باؤ۔ جو اپنے دل میں ٹھان لیتا ہے وہی کرتا ہے۔“ فضل کریم نے کہا تو وہ رمان سے بولا تھا۔

”ضد کی بات نہیں ہے یا راہ میری ضرورت ہے۔“

”اچھا۔ ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانے گا۔“ فضل کریم کہہ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”نہیں! کوئی تم کا لیاں بھی دو گے تو برا نہیں مانوں گا۔“ وہ ہنس کر بولا تھا۔

”گالیاں کہوں دوں گا۔ تیرے بھلے کی بات ہے۔“ فضل کریم نے قدرے توقف کیا پھر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔

”دیکھ تو شریف آدمی ہے۔ برہما لکھا بھی ہے۔ تیرے ساتھ جو کچھ ہوا۔ بھول جا۔ وہ سب۔ اسی میں بہتری ہے بدلے کی آگ بجھا دے۔“

”میرا جو نقصان ہونا تھا ہو گیا فضل کریم! مزید کیا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ جان چلی جائے گی تو جان تو ایسے ہی عذاب میں ہے۔ اچھا ہے جھکا ر امل جائے گا۔“ وہ بظاہر سرسری انداز میں بولا تھا۔

”لے تو نے تو بات ہی ختم کر دی۔“ فضل کریم ناراض ہو گیا۔

”بات ختم نہیں ہوئی یا را! ابھی تو شروع ہوئی ہے۔“ اس نے فضل کریم کو چھیڑا تھا۔

”بس رہنے دو۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ باقی باتیں ہم رات میں کریں گے۔“ اس نے اسپتال کے سامنے گاڑی روک دی اور فضل کریم کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”ناراض مت ہو یا را! میں ایسا کوئی کام نہیں کرنے جا رہا ہوں جس میں میری جان کو خطرہ ہو۔“

”سچ کہہ رہا ہے تو؟“ فضل کریم بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے شام میں ملتے ہیں۔“ فضل کریم اس سے ہاتھ ملا کر گاڑی سے اتر گیا تو اس نے پہلے سرکٹ سلگائی

پھر گاڑی ریورس کرنے لگا تھا کہ اسپتال کے گیٹ سے چند قدم اندر کھڑی لڑکی کو دیکھ کر اس کے اعصاب تن گئے تھے۔ ایک بانو پر سفید گاؤن ڈالے دو سرے ہاتھ میں ڈاکٹری آلہ پکڑے وہ اپنی ساھی لڑکی سے جانے کیا ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسے اٹھا کر اسی اسپتال لایا تھا پھر اس کے بارے میں اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کتنی خوش قسمت ہے یہ لڑکی جس کا باپ اس کی خاطر دنیا چھوڑے بیٹھا ہے۔ اور اسی باپ کی بدولت ہی وہ اس کے ذہن پر نقش ہو گئی تھی۔ وہ انتہائی شغف سے اسے دیکھ رہا تھا جواب اندر جا رہی تھی۔

وہ ہمیشہ سے اپنی پرہیزی کے معاملے میں بہت سنجیدہ رہی تھی اور کبھی کسی بات کو اس نے خود پر یوں طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ جس سے اس کی پرہیزی متاثر ہوئی۔

جب اس نے اجلال رازی سے نا آواز اٹھا تب بھی نہیں۔

اور جب اس پر یاسمین کی حقیقت واضح ہوئی تھی تب تو وہ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی پھر بھی پڑھنے سے اس کا وہیمان نہیں ہٹا تھا۔

لیکن اب اجلال رازی کے بدلتے رویے اور نہ سمجھ میں آنے والی باتوں نے اسے اس بری طرح الجھا دیا تھا کہ صرف پڑھنے سے ہی نہیں ہر شے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھتی تو سامنے کھلی کتاب کو بس دیکھتی رہتی یہاں تک کہ آنکھوں کے سامنے گول گول دائرے بننے لگتے پنڈیوں میں درد شروع ہو جاتا تو وہ ٹیبل لیپ آف کر کے وہیں ٹیبل پر سر رکھ لیتی۔ اپنی اس کیفیت سے وہ خود پریشان تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ اس روز کے بعد سے اس نے اجلال رازی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی اجلال رازی خود آئے اور جیسا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی تم میری بات نہیں سمجھو گی کیونکہ اس وقت تم غصے میں ہو۔ تو اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جس سے وہ اچانک اس سے دور ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

”کیا بات ہو سکتی ہے؟“ اس کا ذہن مسلسل اسی بات میں الجھا رہا تھا تب ہی اور کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔

دوستوں کی باتوں پر بس ہول ہاں کر کے رہ جاتی۔

اس وقت ڈاکٹر سبط حسن نے اسے ایک مریض کے لیے دوائیں تجویز کرنے کو کہا تھا۔ اس سے پہلے وہ مریض کی پوری کنڈیشن بتا چکے تھے۔ پھر بھی وہ پرچا تھا کہ اسے کوئی ایسا کام کہہ دیا ہو جس کی الفب سے بھی وہ واقف نہ ہو۔ خود اسے یہی مریض کو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی ایسا کام کہہ دیا ہو جس کی الفب سے بھی وہ واقف نہ ہو۔ خود اسے یہی لگ رہا تھا۔ آخر انتہائی بے بسی سے اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

”ارسیہ! آؤ آؤ آل رائٹ۔“ ڈاکٹر سبط حسن نے فوراً اس کی کلائی تھامی انہیں لگا تھا جیسے وہ ابھی گر پڑے گی۔

”میری ڈاکٹر! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ روہانی ہو گئی۔ اتنی کمزور تو وہ کبھی نہیں تھی۔

”آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ چلیں ادھر۔“

”زور میں گھر جاؤں گی۔“ وہ مزید تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر سبط حسن سے اجازت لے کر اسی وقت باہر نکل آئی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ سیدھی اجلال رازی کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ اس کی برواشت کی حد ختم ہو چکی ہے

وہ بھی اپنا کھیل ختم کرے۔ میں تو وہ کچھ کر بیٹھے گی۔

”نہیں۔ میں رازی کے پاس نہیں جاؤں گی! اس نے سختی سے اپنے دل کو یاد کر لیا پھر سنگٹل پر گاڑی کو بریک لگاتے ہی اس کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئی تھی۔ چند لمحے اسے ماحول سے مانوس ہونے میں لگ گئے۔ وہ حیران ہوئی جیسے اس سے پہلے وہ نہیں اور تھی۔

”مائی گاڈ! کیا نہیں میں صحیح سلامت گھر پہنچی ہوں گی کہ نہیں۔“ اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو دو تین جھٹکے دیے پھر گردن کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے اسے اچانک جھٹکا لگا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں اجلال رازی کے ساتھ سارہ تھی۔

”رازی! سارہ۔“ وہ کچھ سمجھ نہیں پاتی نہ ہی کچھ سوچنا چاہتی تھی لیکن کوئی بات تھی جو اسے کھٹک رہی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ الجھنے لگی اور گھر آکر تو اسے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ سارہ کے انتظار میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کتنی باتیں قیاس کر ڈالی تھیں۔ کبھی خود کو سرزنش بھی کی لیکن پھر ذہن بھٹک جاتا۔ اگر اس پر یاسمین کی

حقیقت نہ کھلتی تو شاید رازی اور سارہ کا ایک ساتھ ہونا اس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا۔ اب تو ہر ایک پرے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ جب ہاں اس کی آڑ لے کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی تو بہن کیوں نہیں اسے مسئلہ ایسے ہی خیال آ رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا سارہ نے بھی تو آنے میں ہمت دیر کر دی تھی۔ پورے دو گھنٹے بعد آئی تھی اور وہ جو سوچے بیٹھی تھی کہ سارہ کے آتے ہی اسے بھنجو ڈالے گی تو اس کے برعکس بے حد خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم آج جلدی آگئیں؟“ سارہ نے اس سے پوچھا تو وہ جو اس کی آنکھوں کی سرخی پر غور کر رہی تھی چونک کر بولی۔

”ہاں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”طبیعت تو تمہاری کافی دنوں سے خراب لگ رہی ہے ڈاکٹر کی پاس کیوں نہیں جاتیں۔“ سارہ نے ٹوکا۔ وہ خاموش رہی تو قدرے توقف سے سارہ خود ہی کہنے لگی۔

”میں رازی بھائی کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ بھی تمہاری طرف سے بہت پریشان تھے۔“

”کیوں؟“ وہ پوری جان سے متوجہ ہوئی تھی۔

”ظاہر ہے۔ تم اپنا خیال نہیں کرو گی تو وہ پریشان نہیں ہوں گے، پورے دو گھنٹے وہ بس یہی کہتے رہے۔ اریہ کا خیال رکھو۔ وہ بہت اب سیٹ ہے۔ کچھ کھاتی ہی نہیں۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے۔ بانی داوے تم اپ سیٹ کیوں ہو؟“ سارہ آخر میں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”تم سب کی وجہ سے عجیب معمہ بنے ہوئے ہو تم سب۔“ وہ ناراضی سے بولی۔

”ہم معمہ بنے ہوئے ہیں۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی، کیا کہنا چاہتی ہو تم۔“ سارہ نے حیرت کے اظہار کے ساتھ پوچھا تو وہ یکدم ڈھٹ گئی۔ سارہ کے ہاتھ تھام کر عاجزی سے گویا ہوئی۔

”تم تو میری بہن ہونا سارہ! تم جانتی ہو میں رازی سے کتنی محبت کرتی ہوں اور یہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں ہے۔ برسوں سے میرا دل صرف اسی کے نام پر دھڑک رہا ہے۔ درمیان میں میں لاکھ اس سے متفر ہوئی لیکن اس سے ہٹ کر نہیں سوچا تھا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں سارہ!“

”میں جانتی ہوں اریہ! بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہیں بھی اور رازی بھائی کو بھی۔ وہ بھی تم سے ہٹ کر نہیں سوچتے۔ پھر تمہیں کس بات کا خدشہ ہے؟“ سارہ کا دل اس کی عاجزی پر ڈوٹنے لگا تھا۔

”پتا نہیں۔ پتا نہیں سارہ! مجھے لگتا ہے جیسے رازی مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ کوئی اسے مجھ سے چھین رہا ہے یا وہ جان بوجھ کر مجھ سے دامن چھڑا رہا ہے؟“ اس کے ٹوٹے لہجے پر سارہ تڑپ کر بولی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے اریہ! وہ بھی ہو گئی ہو تم۔“

”وہ تم بھی یونہی تو نہیں ہو جانا۔ کوئی بات ہوتی ہے تب ناں۔“

”نہیں یہ خود کو زیادہ تھکا کے نتیجے ہے۔ اپنے دل کو آرام دو۔ بلکہ میں مماسے کہتی ہوں فوراً تمہاری شادی کر دیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے تمہارے وہم کا یہی علاج ہو سکتا ہے۔“

سارہ اب اسے چھیڑنے لگی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی کیونکہ اس کے اندر کوئی بالکل نہیں مچی تھی۔ ہولادینے والا ستانا دور تک پھیل گیا تھا اور وہ وحشت بھری نظروں سے سارہ کو دیکھے جا رہی تھی۔

کتے دنوں تک سارہ اجلال رازی کی باتوں سے پریشان رہی تھی اور پہلے پہل تو اس کے اندر غصہ بھی تھا لیکن

پہرہ پہرہ آہستہ آہستہ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ کیونکہ اجلال رازی نے جس حقیقت پر ہندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے وہ زیادہ دل انکار نہیں کر سکتی تھی۔ پھر یہ بڑی بات تھی کہ اجلال رازی صرف اپنا نہیں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اگر خود غرضی کا لبادہ اوڑھ لیتا تو بھی آرام سے اپنی زندگی جی سکتا تھا۔ لیکن وہ خود غرض نہیں تھا۔ اس نے اپنی باتوں سے ثابت کر دیا تھا اور کسی حتمی فیصلے سے پہلے سارہ پر بات واضح کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس کے بعد وہ تو شاید مطمئن ہو گیا تھا لیکن سارہ کی جان پرینی تھی۔ وہ خود کو بے انتہا مشکل میں محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں اسے سمیر کا خیال آیا تو اس روز وہ یا سمین کو بتا کر کالج سے امینہ پھوپھو کے گھر آگئی تھی۔

”رے! یہ آج تم کیسے راستہ بھول گئیں۔“ سمیر اسے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

”جیسے تم بھولتے ہو۔“ وہ کہہ کر فوراً ”امینہ پھوپھو سے مخاطب ہو گئی۔“ پھوپھو بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔

”آپ نے کھانا کھالیا۔“

”نہیں طبیب کھانا لگا رہی ہے، چلو اور یہی چلو۔ تم بھی آؤ سمیر!“ امینہ نے کہا تو سمیر اچھل پڑا۔

”میں بھی آؤں۔ یعنی بی بی کے صدفے میں مجھے بھی بلایا جا رہا ہے۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ امینہ نے سمیر کو ٹوکا۔

”یہ فضول باتیں ہی کرتا ہے پھوپھو! آئیے ہم چلیں۔“ وہ امینہ کا ہاتھ تھام کر رڑا تنگ روم میں آگئی۔

”سمیر کی طرح طبیب بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔“

”مجھے لگ رہا تھا آج تم آؤ گی۔“ طبیبہ نے اس کے گلے لگتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولی۔

”الہام ہوا تھا کیا؟“

”ہاں صبح سے تمہارا چہرہ میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ اس سے مجھے یہی لگا کہ تم آؤ گی اور دیکھو میں نے تمہاری فیورٹ ڈش بنائی ہے۔“

”چلن پلاؤ۔“ اس کی بھوک مزید چمک اٹھی۔ ”چلیں پھوپھو! شروع کریں مجھ میں اب برداشت نہیں ہے۔“

”ہاں لو۔“ امینہ نے پہلے اس کی پلیٹ میں چاول نکالے جس پر سمیر پھر احتجاج کرنے لگا تو وہ اسے چڑا کر فوراً کھانے میں لگ گئی۔

”جانے کب سے بھوکی ہے۔“ طبیبہ! کچھ اور کھانے کو ہو تو وہ بھی لے آؤ۔ خالی پلاؤ سے اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔“ امینہ کے ٹوکنے کے باوجود سمیر اسے چھیڑنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔

”ارے ہاں سارہ! پھر اریہ کی شادی کا کیا طے ہوا؟“ امینہ نے اچانک یاد آنے پر پوچھا تھا۔

”جی! وہ چونک کر امینہ کو دیکھنے لگی۔“

”اریہ کی شادی کا پوچھ رہی ہوں۔ اس دن یا سمین کہہ رہی تھی کہ وہ جلدی اریہ کی شادی کر دے گی۔“

”یہ امینہ پھوپھو کیا کہہ رہی تھیں۔ اس نے تو گھر میں ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی لیکن لاعلمی کا اظہار کرنے سے اس کی اپنی سبکی ہوئی اس لیے سنبھل کر بولی تھی۔“

”مجھے کچھ طے نہیں ہوا پھوپھو!“

”چھا۔“ امینہ کو تعجب ہوا تھا۔ وہ اس موضوع سے بچنے کی خاطر فوراً ”طبیبہ سے مخاطب ہو گئی۔“

”بھئی طبیبہ! تم نے پلاؤ بہت اچھا بنایا ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی کھا گئی ہوں۔ اب تمہیں چائے بھی پلانی پڑے گی۔“

”وہ تو میں پلاؤں گی تم اور لوٹاں۔“

”نہیں بھی اب گنجائش نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھی تو سمیر بھی فوراً اٹھ گیا۔

”چلو بھی! ہمیں گھر چھوڑ آؤں۔“

”ہائیں! داغ ٹھیک ہے تمہارا۔ ابھی تو آئی ہے، ابھی چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔“ امینہ کو بچ بچ غصہ آگیا تھا۔

”اس لیے کہ میں شام میں فارغ نہیں ہوں مجھے، کسی اور کام سے جانا ہے۔ اس وقت آپ مجھ سے مت کہیے گا اور تم بھی سن لو۔“ سمیر امینہ سے کہتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تو وہ ترخ کر پئی۔

”سن لیا ہے اور میں تمہارے ساتھ جاؤں گی بھی نہیں۔“

”بڑی مہربانی!“ وہ کمرے سے نکل گیا تو امینہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”تم اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔ چلو! تم میرے کمرے میں چل کر سو جاؤ، لمبی دوپہر ہے۔ شام میں میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔“

”ارے پھو پھو! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں خود بھی جاسکتی ہوں۔ آخر آئی بھی تو ہوں۔“ اس نے قصداً خوش دلی کا مظاہرہ کیا، پھر امینہ کو ان کے کمرے میں چھوڑ کر ”بس ابھی آئی“ کہتے ہوئے سمیر کے کمرے میں آگئی اور دانت پیس کر اس سے بولی۔

”تم کچھ زیادہ سامراٹ بننے کی کوشش نہیں کر رہے؟“

”مجھ پر کمشن بعد میں دینا۔ پہلے بتاؤ! کیسے آئی ہو۔“ سمیر بجائے اپنی بد اخلاقی پر ناام ہونے کے مزید رعب جمارا تھا۔

”کیسے آئی ہو مطلب؟“ وہ اندر ہی اندر تلمسلائی تھی۔

”مطلب اب کس کا دکھ، کس کی پریشانی میری جھولی میں ڈالنے آئی ہو؟“ سمیر نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”تم بچ بہت برے ہو۔ بس اب بھی تم سے بات نہیں کروں گی۔“ وہ دھڑکے ہوئے کمرے میں بیٹھ گئی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ قائم رہنا اپنی بات پر۔“ وہ کہہ کر آرام سے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ دل، دل میں خود کو کونے لگی۔

سمیر کچھ دیر اس کی کیفیت سے محفوظ ہوتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اچھا! اپنی اس سہیلی کا احوال سناؤ جس کے ساتھ کچھ برا ہو گیا تھا اب کیسی ہے وہ؟“

”بہت اچھی بہت خوش۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔

”ہائیں! سمیر اچھا! تہی جلدی اسے مٹگیتے اچھا لگیا؟“

”نہیں! اسے اس کے مٹگیتے ہی اپنا لیا ہے، جب ہی وہ خوش ہے۔“ وہ یوں خوش ہو کر بولی تھی۔ جیسے خود اسے اس کی منزل مل گئی ہو۔

”حیرت ہے۔“ سمیر نے برملا حیرت کا اظہار کیا تو وہ اندر سے خائف ہو گئی۔

”کیوں، حیرت کی کیا بات ہے؟ اگر محبت سچی ہو تو خامیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔“

”خامیاں! لغزشیں نظر انداز نہیں ہوتیں۔“ وہ نفی میں سر ہلائے لگا۔

”اچھا! اگر اس کی جگہ تم ہوتے تو؟“ وہ بے ساختہ پوچھ کر پٹائی تھی۔

”تو میں کبھی پلٹ کر اس لڑکی کی طرف نہ دیکھتا۔“ سمیر نے فوراً جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکا بڑے طرف کا مالک ہے۔“ وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں یہ وقتی ابال ہے۔ چند دن بعد تم خود دیکھنا وہ لڑکی پھر روتی ہوئی نظر آئے گی۔“ سمیر نے کہا تو وہ گہرا کر

کھڑی ہو گئی۔

”کیا فضول باتیں لے بیٹھے ہو تم۔“

”چلو تو تم کوئی کام کی بات کر لو۔ بلکہ وہ بات کہو جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔“ سمیر کو یقین تھا کہ وہ یونہی ملنے یا اس کی محبت میں نہیں آئی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے واقعی ایک بات پریشان کر رہی ہے، لیکن اب میں تمہارے ساتھ شیر نہیں کروں گی۔“ وہ کہہ کر تیزی سے اس کے کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن سمیر اس سے زیادہ تیز تھا۔ ایک ہی جست میں اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تم بہت جلدی ناراض ہو جاتی ہو۔“

”نہیں! میں ناراض نہیں ہوں۔“ وہ بہت ضبط سے بولی۔ ”مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں خواہ مخواہ تمہیں پریشان کرتی ہوں۔ آئی ایم سوری۔“

”تو؟“ نو سواری۔ میں تمہاری باتوں سے پریشان نہیں ہوتا۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ ہاں! کبھی کبھی دل چاہتا ہے، جیسے تم اوروں کے لیے پریشان ہوئی ہو، کبھی میرے لیے بھی تمہارے دل میں درد ہو۔“

”نہیں،“ سمیر نے اسی خواہش مت کرو۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتی۔“ وہ اسے دھکیل کر کمرے سے نکل گئی۔

یا سمین تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو لاؤنچ میں اریبہ کو بیٹھے دیکھ کر ایک لحظہ کو ٹھکی تھی، لیکن پھر سر جھٹک کر پوچھنے لگی۔

”سارہ آگئی؟“

”نہیں۔“ اریبہ نے مختصر جواب دیا۔

”امینہ نے روک لیا ہو گا۔ خیر! میں کلب جا رہی ہوں۔“ یا سمین کہہ کر آگے بڑھی، لیکن پھر کچھ یاد آنے پر پلٹ کر کہنے لگی۔

”ہاں اریبہ! میں یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔“ تاجور کب تک یہاں رہے گی؟“

”کیوں؟ آپ کو اس سے کوئی براہیم ہے؟“ اریبہ نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں۔“ یا سمین نے کچھ ناخوشی کے انداز میں سر بھی ہلایا تھا۔

”پھر اسے یہیں رہنے دیں۔“ اریبہ اس وقت جانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے یا سمین پر زبردستی اپنی بات مسلط نہیں کی تھی کہ وہ یہیں رہے گی۔

”لیکن بیٹا! اس کے گھر والے۔“

”اس کا کوئی گھر نہیں ہے۔“ اریبہ فوراً بولی تھی۔

”کیا مطلب؟ کیا تم اسے یتیم خانے سے لائی ہو؟“ یا سمین نے کوشش سے خود کو چلانے سے باز رکھا تھا۔

”نہیں! میں اسے اسپتال سے لائی تھی۔ یتیم خانے والے ہی اسے اسپتال میں ڈال گئے تھے۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ یہ لڑکی میری ذمہ داری ہے اور میں اسے لاوارثوں کی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔“ اریبہ بہت سکون سے بول رہی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔“ یا سمین نے اسے احساس دلانے کی

کوشش کی تھی۔
 ”ایسا کچھ نہیں ہوگا اور اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہوا بھی تو میں خود فیس کر لوں گی۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اب اربہ کا انداز بدلنے لگا تھا۔ جب سی یا سمین مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے باہر نکل آئی۔
 اس نے اربہ سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اس وقت واقعی کلب جانے کے لیے نکلی تھی، جہاں بیکم ایراہیم کی کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی اور بیکم ایراہیم نے یا سمین کو خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ یعنی یا سمین کو کتاب تبصرہ بھی کرنا تھا۔ ایسی تقریبات یا سمین خود بھی مرس نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس وقت اچانک اس کا موڈ بدل گیا تھا اور وہ شہباز درانی کے پاس چلی آئی۔
 ”بہت انتظار کروانے لگی ہو۔“ شہباز درانی نے چھوٹے ہی شکوہ کیا تو یا سمین تنگ ہو کر کہنے لگی۔
 ”جانتے تو ہوشی! میں کس مشکل میں ہوں، بلکہ اب تو تنگ آگئی ہوں۔“
 ”کس سے؟ مجھ سے تنگ آگئی ہو؟“ شہباز درانی نے فوراً پوچھا۔
 ”نہیں! اس گھر کی گھٹن سے دل چاہتا ہے، میں بھاگ جاؤں۔“ یا سمین کہہ کر اس امید پر شہباز درانی کو دیکھنے لگی جیسے وہ فوراً ”لیس گے“ ہاں! اچلو بھاگ چلتے ہیں۔“ لیکن اس کے برعکس انہوں نے ٹوک دیا تھا۔
 ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ یا سمین کو دھچکا لگا تھا، لیکن اسے چونکہ پینتالیس لے میں کمال حاصل تھا تو زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر شہباز درانی کو دیکھ کر اس انداز میں جیسے انہیں جڑا رہی ہو، کہنے لگی۔
 ”بھاگوں گی تو میں ضرور۔ یہ میں نے سوچ لیا ہے۔ پھر تم دیکھنا پسلی کھلی میچ جائے گی۔ میں سوچتی ہوں میری گمشدگی پر سب سے زیادہ کون پریشان ہوگا۔“
 ”توصیف احمد۔“ شہباز درانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔
 ”ہاہاہاہ۔“ یا سمین نے قہقہہ لگایا پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو ہوشی! سب سے زیادہ توصیف سی پریشان ہوگا اور میرا مقصد بھی یہی ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہے تم نے باقاعدہ بھاگنے کا پلان بنالیا ہے۔ اب یہ بھی بتاؤ بھاگو گی کس کے ساتھ؟“ شہباز درانی نے دیکھی سے پوچھا تو یا سمین ترخ کر پڑی تھی۔
 ”مجھے کسی کے ساتھ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ بالکل تنہا۔“ پھر گھڑی دیکھ کر خود کو بہت غلت میں ظاہر کرنے لگی۔
 ”ارے! مجھے تو ایک تقریب میں جانا تھا۔ اف بہت لیٹ ہو گئی ہوں۔“
 ”تو اب جانے دو ناں۔“ شہباز درانی نے اسے روکنا چاہا تھا۔
 ”نہیں شعی! میں اسپیشلی انوائٹ ہوں، اوکے۔“ وہ اسی غلت میں باہر نکلی تھی۔ درحقیقت وہ پریشان ہو گئی تھی اور بددراشت بھی اور ایسی حالت میں وہ کسی تقریب میں نہیں جاسکتی تھی اس لیے واپس گھر آگئی۔
 لاؤنچ میں اربہ اور سارہ کے ساتھ توصیف احمد بھی موجود تھے اور جانے ان تینوں باپ بیٹیوں کے درمیان کیا باتیں ہو رہی تھیں کہ ان کے چروں پر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ یا سمین نہ جانتے ہوئے بھی ان میں بیٹھ تو گئی، لیکن فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ گنتی غیر اہم ہے۔ کسی نے اس کے آنے اور بیٹھنے کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ تب وہ فوراً اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

رات کا جانے کون سا پھر تھا جب موبائل کی مسلسل بجتی ٹون سے اجلال رازی کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے

”میں جانتا ہوں۔“ وہ بہت ضبط سے بولا۔
 ”پھر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں اربہ اور آپ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے، پھر کیوں فوڈ اور اسے بھی مشکل میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ پلیز رازی بھائی! بھول جائیں سب۔“ سارہ منت سے بولی تھی۔
 ”فار گاڈ سیک سارہ! میں نے سب کچھ تو تم پر واضح کر دیا ہے پھر تم کیوں ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ اس نے ٹوکا تو اوہ سارہ خاموش ہو گئی تھی۔
 ”ہیلو سارہ!“ قدرے رک کر وہ اسے نکار کر پوچھنے لگا۔ ”تم سیر سے ملی تھیں؟“
 ”جی۔ میں آج ہی امینہ پھوپھو کے گھر گئی تھی۔ سیر سے بھی بات ہوئی لیکن۔“ سارہ خاموش ہو گئی تو اجلال نے ٹوکا نہیں بلکہ آزاد خود سمجھ کر کہنے لگا۔
 ”ٹھیک ہے اب تم خاموش رہو گی اور میں جو کرنے جا رہا ہوں وہی ٹھیک ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے سارہ! آہستہ آہستہ سب نارمل ہو جائے گا۔ تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔ سمجھ رہی ہوناں۔“ اجلال کو کیا خود سے لڑتے ہوئے بول رہا تھا۔
 اوہ شاید سارہ رونے لگی تھی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز آئی تھی۔
 ”جتنا رونا ہے ابھی رولو۔ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔“
 اجلال نے کہہ کر فون بند کر دیا اور چاہا کہ دوبارہ سو جائے لیکن ہزار کوشش کے باوجود نیند آ کے نہیں دی تب اس نے بستر چھوڑ دیا اور سگریٹ سلگا کر بالکونی میں نکل آیا۔
 خاموش رات بین کرتی ہوئی لگ رہی تھی۔

شمشیر علی اپنے گھر شفٹ ہو گیا۔ اب اس نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ اتنے بڑے شہر میں تاجور کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا اور اس کے پاس تاجور کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی جو وہ اخبار میں اشتہار لگواتا۔ اچھے دنوں میں اس کے پاس جو موبائل سیٹ تھا اس میں تاجور کی تصویریں تھیں لیکن وہ موبائل سیٹ جب وہ گرفتار ہوا تھا شاید حوالدار نے لے لیا تھا۔ اسے موبائل سیٹ سے غرض نہیں تھی بس ہلکی سی امید کہ شاید اس میں تاجور کی تصویر مل جائے، سو وہ اس وقت حوالدار کے پاس آیا تھا۔
 ”مجھے موبائل نہیں چاہیے۔ اس میں میرے دوستوں کے نمبر اور کچھ تصویریں تھیں، مجھے وہ لینی ہیں۔ آپ پلیز میری مدد کریں۔ مجھے بتائیں وہ موبائل کس کے پاس ہے۔“
 وہ حوالدار کو اپنی بات سمجھاتے سمجھاتے عاجز آ گیا تھا اور یہ نہیں تھا کہ حوالدار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب سمجھ کر بھی انکاری تھا۔ پورا ایک گھنٹہ اس کے ساتھ مغز ماری کے بعد آخر مایوس ہو کر وہ فضل کریم کے پاس

چلا گیا۔

اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔ وہ روزانہ اس وقت آفس جانے سے پہلے فضل کریم کے پاس ضرور آتا تھا۔ یہاں بھی وہ تاجور کی خاطر ہی آتا تھا۔ کیونکہ تاجور اسی اسپتال میں زیر علاج تھی تو اسے خیال آتا کہ ہو سکتا ہے دوبارہ چیک اب کے لیے اسے یہاں لایا جائے۔ اس لیے فضل کریم کے پاس بیٹھ کر وہ ہر آنے جانے والے کو دیکھتا تھا، خصوصاً "خواتین اور لڑکیاں جہاں نظر آئیں" اس کی نظریں دور تک ان کا تعاقب کرتی تھیں اور یہیں اسے وہ لڑکی بھی نظر آئی تھی جس کے بارے میں اس کا مستقبل تاریک کر دیا تھا۔ وہ بھولا نہیں تھا اپنے مستقبل کے قاتل کو اس نے ضرور سبق سکھانا تھا لیکن اس کے نزدیک زیادہ اہم تاجور تھی۔ کہیں سے اس کا سراغ مل جاتا۔ حوالدار کی طرف سے پاپس ہو کر اب اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ انتہائی دل گرفتہ بٹھا تھا۔

"کیا بات ہے باؤ! آج دفتر نہیں جانا؟" فضل کریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا تو اس نے چونک کر پہلے ناخوش دیکھا پھر سستی سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں جا رہا ہوں۔"

"طبیعت نہیں ٹھیک تو چھٹی کر لے چل تجھے چائے شائے پلاؤں۔"

"ارے نہیں فضل کریم میں ٹھیک ہوں اور چائے کا خیال تمہیں پہلے کیوں نہیں آیا؟ اتنی دیر سے میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔" اس نے کہا تو فضل کریم ہنس کر بولا تھا۔

"اچھا، تجھے تو نہیں لگا تو یہاں تھا۔" وہ حیران ہوا، بظاہر سیدھا سا وہ فضل کریم کی کسی گہری بات کر گیا تھا کہ وہ لا جواب ہو کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور ابھی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا کہ پندرہ سولہ سالہ ایک لڑکا اس کا بازو چھو کر پوچھنے لگا۔

"صاب! تصویر بنوائی ہے؟"

"تصویر...؟" اس نے دیکھا لڑکے کے ہاتھ میں پنسل سے بنی ہوئی تصویر تھی۔

"یہ تصویر...؟" وہ بے اختیار لڑکے کے ہاتھ سے تصویر چھپٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "یہ تم نے بنائی ہے؟"

"جی صاب! آپ کی تصویر بھی بنا سکتا ہوں۔ بنوائیں صاب! زیادہ پیسے نہیں لوں گا۔" غالباً "لڑکے کا یہی ذریعہ معاش تھا۔ خوشامدی انداز میں اسے اس کا رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ لڑکے کی آواز اس کی سماعتوں سے ضرور ٹکرائی تھی لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔ جب لڑکے نے اس کا بازو ہلایا۔ تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"ابھی نادوں صاب! لڑکے نے پوچھا۔

"نہیں ابھی میں کام سے جا رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہاں رہتے ہو؟ میں شام میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔" وہ کچھ سوچ کر ہی بولا تھا۔ لڑکا جلدی سے اپنا نام بتاتا کر پوچھنے لگا۔

"آئیں گے ناں صاب!"

"ہاں ضرور آؤں گا۔" وہ لڑکے کا گال تھپک کر بدقت مسکرایا تھا۔

معمول کے مطابق فجر کی نماز کے بعد ارمیہ لان میں آئی۔ کچھ دیر چل قدمی کی پھوپھیں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد بی بی جائے لے کر آئیں تو ان کے پیچھے یا سمین کو آتے دیکھ کر وہ ٹھکنے کے ساتھ یا سمین کے اتنی جلدی اٹھنے پر حیران

ہی ہو رہی تھی پھر بھی جیسے یا سمین قریب آئی۔ اس نے سلام کر ڈالا۔

"خوش رہو۔" یا سمین نے مسکرا کر دعا دی پھر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی ہو؟"

"جی۔" وہ بڑے اپنی طرف کھینچ کر چائے بنانے لگی۔

"سارہ نہیں اٹھی؟"

"نہیں البتہ تاج فخریہ ہی اٹھ جاتی ہے۔" اس نے تاجور کا نام لے کر گویا باور کرایا تھا کہ وہ بھی اسی گھر کی فرد

ہے۔

"ہاں اچھی لڑکی ہے۔" یا سمین جانے اس کا دل رکھ رہی تھی یا اس کی بات تسلیم کر رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکی اور چائے کا کپ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"تمہارے ایگزٹ ہونے والے ہیں۔" یا سمین نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ تب وہ ساری بات سمجھ گئی۔ یا سمین کا جلدی اٹھنا اور اس کے پاس آ بیٹھنا یونہی نہیں تھا۔

"جی ایگزٹام کے بعد بھی میں فارغ نہیں ہوں گی۔" اس نے اسے بالواسطہ سمجھا دیا کہ اس کی شادی کا نہ سوچا جائے یا سمین فوراً کچھ نہیں بولی۔ سکون سے چائے کے دو تین گھونٹ لیے پھر کہنے لگی۔

"دیکھو بیٹا! میں جو بھی ہوں جیسی ہوں تمہاری ماں ہوں۔ بے شک مجھ سے سوچنے سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے جو میں محسوس کر رہی ہوں وہ میں یقین سے کہوں گی کہ غلط نہیں ہے۔ تم بھی محض میری ضد میں جھگڑا نہ مت۔"

"آپ بلاوجہ تمہید باندھ رہی ہیں۔ اصل بات کہیں۔" اسے واقعی یا سمین کی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔

"اصل بات تم بتاؤ۔ کیوں پریشان ہو؟" یا سمین چائے کا کپ بڑے میں رکھ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میں...؟" وہ اپنی طرف اشارہ کر کے رہ گئی۔ اصل میں تو وہ حیران تھی کہ یا سمین نے کیسے اس کی پریشانی محسوس کر لی۔

"میں نے کہا ناں میں جیسی بھی ہوں تمہاری ماں ہوں اور ماؤں سے اولاد کی پریشانی چھپی نہیں رہتی۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"

یا سمین نے اتنی محبت سے پوچھا کہ وہ بکھرنے لگی۔ دل چاہا اس کے سینے میں منہ چھپا کر سارے آنسو بہا ڈالے۔ قریب تھا کہ وہ ایسا ہی کر لیتی کہ اچانک اسے جھٹکا لگا۔

"نہیں! اسی عورت کی بدولت میں رسوا ہو رہی ہوں۔ سارے زخم اسی کے لگائے ہوئے ہیں۔ اب یہ سچائی کی آڑ میں اور کتنے زخم لگائے گی۔"

"سوری ماما! میں آپ کے ساتھ اپنے دکھ شیئر نہیں کر سکتی۔" وہ کہہ کر اٹھی اور تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر وہ کالج جانے کے لیے ہی نکلی تھی۔

اس کا ذہن منتشر ہو گیا تھا۔ پہلے ہی اجال کی طرف سے بدگمان تھی۔ مزید یا سمین کی لگاؤ کے پیچھے چھپی اس کی غرض کو سوچتے ہوئے اس کا ذہن چننے لگا تھا۔ کالج کے بعد اسپتال جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ سیدھے گھر جانے کا سوچ کر ہی وہ گاڑی میں بیٹھی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے منہ پر رو مال رکھ دیا بس چند سیکنڈ ہی اس نے ہاتھ پاؤں مارے تھے پھر تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تمام سبز سایہ دار پیڑوں نے

ترے بغیر وحشتوں میں اپنے پیر بن کو تار تار
کر دیا ہے

اب کسی شجر کے جسم پر قبا نہیں

سوکھے زرد پتے

کو بہ کوتری تلاش میں بھٹک رہے ہیں

اُداسیاں - اُداسیاں

مرے دہچکوں میں گلابی دھوپ روز جھانکتی ہے

مگر اب اس کی آنکھوں میں

وہ جگمگاہٹیں نہیں

جو تیرے وقت میں زمین کے صبح مانتے پر

سود جوں کی کہکشاں سجالنے آتی تھیں

زمین بھی مری طرح ہے

ترے بغیر اس کی کوکھ سے بھی اب

کوئی گلاب آگ نہ پائے گا

زمین بانجھ ہو گئی ہے

اور میری روح کی بہاد آفریں کوکھ بھی

میری سوچ کے صدف میں

پروین شاکر

ہر طرف رونقیں ہیں، میلے ہیں

اور ہم شہر میں اکیلے ہیں

من کا مرہم کہیں نہیں بکتا

سو دکائیں، ہزار ٹھیلے ہیں

زہر کھانے کی بھی نہیں فرصت

وہ بکھیرے ہیں، وہ جھیلے ہیں!

بعد میں ہو گئے بڑے دونوں

صرف بچپن میں ساتھ کھیلے ہیں

یہ نہیں دیکھتا وہ نکتہ نواز

کس نے پا پڑ زیادہ سیلے ہیں

دُشمنوں کے علاوہ ہم نے شعور

دوستوں کے ستم بھی جھیلے ہیں

انور شعور

شگفتہ جاہ زرگاہ کعبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جب تم میں سے کوئی شخص روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ وہ کھجور سے روزہ کھولے۔ اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔ اگر کھجور نہیں ہو تو پانی سے (کھولے) کیونکہ یہ پاک اور پاک کرنے والا ہے“ اور فرمایا۔

”مسکین پر (کھا لیا) صدقہ (صرف) صدقہ ہے اور رشتے دار پر (کیے گئے) صدقہ کی دو حیثیتیں ہیں۔ وہ صدقہ بھی ہے اور صلہ بھی“

فوائد و مسائل :-

۱۔ روزہ کھجور یا پانی سے کھولنا زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ان کے علاوہ جس چیز سے بھی افطار کیا جائے، تمام چیزوں کا ثواب برابر ہے۔ بعض لوگوں کا نامک سے روزہ افطار کرنے کو باعثِ اجر قرار دینا بلا دلیل ہے۔

۲۔ عزیز رشتے دار پر صدقہ کرنے کا دھرا اجر ہے۔ عموماً لوگ اپنے عزیز و اقارب کو بھلا دیتے ہیں مگر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ دوسروں کی بہ نسبت ان کا زیادہ خیال کرنا چاہیے۔ (ریاض الصالحین)

قرآن کریم اور لفظ اللہ کے متعلق ایک غیر مسلم کا اعتراف حقیقت

ہالینڈ کے ایک ماہر نفسیات پروفیسر ڈاکٹر وینڈیلین

نے اپنی تین سالہ تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ لفظ ”اللہ“ کا مسلسل دہرانے سے انسان بہت سی بیماریوں بالخصوص امراضِ قلب، سانس، ذیابیطی اور دباؤ سے بچ سکتا ہے۔ ذبح پر و فیہ ذاکر و ذیہ لیون کا کتاب ہے کہ اس نے تین سال لفظ ”اللہ“ پر مسلسل تحقیق کی اور اسے بہت سے مسلم غیر مسلم لفظوں اور دیگر افراد پر آزمایا۔ اس نے اپنے غیر مسلم رفیقوں کو سب سے پہلے عربی پڑھنا سکھایا انہوں نے کہا کہ جو مسلمان باقاعدگی سے قرآن پاک پڑھتے ہیں وہ نفسیاتی بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔ ذاکر کا کہنا ہے کہ لفظ اللہ کے تمام حروف کو الگ الگ پڑھنے سے سانس کے نظام کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

مہوش ڈوگر گوہر الوالہ

سچی باتیں

عمر بھی عمیر اور جوتے کی مانند ہے ان کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دیتے ہیں۔

محبت اعتبار کے بغیر کچھ بھی نہیں جبکہ اعتبار بغیر محبت کے بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔

بات ہمیشہ الفاظ کی نہیں پچھ کی ہوتی ہے۔

انسان جس کیفیت میں اور عقیدے میں جان دے گا، اسی میں اٹھایا جائے گا۔ دعا کریں وقتِ نصرت کلمہ نصیب ہو۔

فوزیہ عمر بٹ، ہائیند عمران۔ بگڑات

ایمان داری

ایک کاروباری آدمی تجارت میں ایمان داری کی اہمیت کے موضوع پر اپنے دوست سے گفتگو کر رہا تھا۔

”کل بھی کی بات ہے، مجھے ایک گاہک نے ادائیگی کے لیے ایک ہزار روپے کا نوٹ دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا اور وہ چپکے ہوئے دو نوٹ تھے۔ بس وہیں ایمان داری کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔“

”تم نے کیا کیا پھر؟“ دوست نے امتیاز سے پوچھا۔

”میں سوچتا ہوں کہ اپنے پارٹر کو یہ بات بتاؤں یا سارے پیسے خود ہی رکھ لوں۔۔۔“ کاروباری آدمی نے جواب دیا۔

شگفتہ فیاض۔ امریکہ

سنتے جاؤ

خواہشیں پوری ہو جائیں تو انتظار ختم ہو جاتا ہے لیکن انتظار پھر بھی قائم رہتا ہے۔ پھر یہ انتظار اگلی خواہش کو تحقیق کرتا ہے اور اگلی خواہش، اگلے انتظار کو تخلیق کرتی ہے۔ سو منتشر ہونے سے بہتر ہے کہ خواہش ہی رتی جائے۔

تنزیل زہرہ۔ شہداد پور

کچھ لفظ چنے ہیں

سمندری جہازوں کے لیے سب سے محفوظ جگہ ساحل ہوتی ہے مگر سمندری جہاز ساحلوں کے لیے نہیں بنائے جاتے۔ وہ سمندر میں سفر کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

دو لوگ دیکھتے بہت سی الجھنوں سے بچاتے ہیں۔

آپ کی کبھی ہوئی کوئی بات کسی کو بدل دے کسی کے ساتھ ساری زندگی کسی اچھے سنگی ساتھی کی طرح لپٹی رہے تو وہ بھی صدقہ جاریہ ہوتا ہے وہ بات اگلے تک جانی ہے، بھجھکتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ ہماری راہ کے کانٹے ہٹائی جاتی ہے۔ صبا سلیم۔ منڈو جل محمد

امکان

ایک شخص گھر پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو دکھا جو ایک شاندار گھوڑے پر سوار تھا۔ گھر سوار کے سامنے اس آدمی نے جھک کر

درخواست کی۔

”جناب والا! کیا آپ میری سواری سے اپنی سواری تبدیل کرنا پسند کریں گے؟“

”نہیں، کیا تم احمق ہو؟“ گھر سوار نے غصے سے جواب دیا۔

”نہیں، گدھے کے مالک نے جواب دیا۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ ہوں۔“

نمرہ، اقرار۔ کراچی

اعتماد

شاخ پر بیٹھا پرندہ شاخ کی کھجوری یا اس کے جھولنے سے نہیں ڈرتا کیونکہ اس کو شاخ پر نہیں اپنے پروں پر اعتماد ہوتا ہے۔

مدیہ شہزاد۔ چک ۱۹۵-ایم ایل

بے چارگی

امریکہ میں ایک خوش پوش نوجوان بار میں گیا اور آدھ روپے کے بعد بے اختیار قبضے لگانے لگا۔ بار میں بیٹھے ہوئے تمام افراد کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ حضور کی دیر بعد وہ پھر قبضہ لگانے لگا۔ کافی دیر تک اس کی یہی حالت رہی۔ کبھی وہ قبضہ لگاتا اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس کیفیت سے نکلا تو سولہ چہرے لیے بادیں بیٹھے تمام افراد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”معاف کرنا دوستو! مجھے ایک چیز کے جانے کی بے حد قوسی ہے اور ایک چیز کے جانے کا بے حد رنج ہے۔ مجھ پر ایک وقت دوا حساسات طاری ہیں۔ نہ میں اپنی خوشی دبا سکتا ہوں اور نہ اپنے شدید غم کو ضبط کر سکتا ہوں۔“

لوگوں کے چہروں پر اب بھی سوالیہ نشان بنے رہے تو اس نے مزید وضاحت دی۔

”دراصل میری زیر تربیت ساس میری نئی کار ڈرائیو کرتے ہوئے غمزدی چٹان والے راستے پر چلی

گئی ہیں۔ ادب کسی بھی وقت دونوں کے خاتمے کی خبر آنے والی ہے۔۔۔

الماس تنویر - ہری پور ہزارہ

جو مٹی جنگ عظیم

البرٹ آئن اسٹائن سے کسی نے پوچھا "تیسری عالمی جنگ میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے؟" اس نے جواب دیا "زمانہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے۔ البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ جو مٹی جنگ عظیم میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے؟"

"کون سے ہوں گے؟" سائل نے اشتیاق سے پوچھا۔
"پتھر" آئن اسٹائن نے جواب دیا۔
میلو صدیقی - کراچی

خلیل جبران نے کہا،

- بد بختی یہ ہے کہ میں اپنا خالی ہاتھ لوگوں کی طرف بٹھاؤں اور کوئی اس میں کچھ نہ رکھے۔ اور مایوسی یہ ہے کہ میں اپنا پھرا ہوا ہاتھ لوگوں کی جانب بٹھاؤں اور کوئی اس میں سے کچھ نہ لے۔
- میں زمانے کا قیاس اپنے اس قول سے کر دوں گا "کل تھا اور کل ہو گا"
- جو آدمی زیادہ بولتا ہے، اتنا ہی کم سمجھتا ہے۔ اور ایک خطیب اور دلال کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔
- پھوٹے راستوں کو خرگوش سے زیادہ سمجھتے ہیں۔
- ایمان دل کے صحرائیں ایک سرسبز و شاداب قطعہ ہے جہاں فکر کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔

نوال افضل گھمن - گجرات

لفظ باتیں کریں،

وہ بارش کا قطرہ سانپ اور سیپ دونوں کے منہ میں جاتا ہے لیکن سانپ اسے ذہر اور

سیپ اسے موتی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر ایک کی اپنی تخلیق ہے۔

وہ اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو۔ کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکر دوں کی زد میں رہتا ہے۔

وہ انسان کے گرد ایک دو ہی مندریں ہیں
دل میں اتر جانا یا دل سے اتر جانا۔
وہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس کم ہوتا ہے
لیکن وہ سب دے دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ
ہیں جو زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی کی
سفاوت پر سوان کا صندوق خالی نہیں ہوتا۔
نوشین اقبال نوشی - گاؤں بدین

رشتے،

جب ناخن بڑھے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں، انگلیاں نہیں۔ بالکل اسی طرح جیب آپس میں رشتے داروں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو غلط فہمیاں ختم کرنی چاہئیں نہ کہ رشتے۔
ایم کلثوم نوناری - کٹو

عدل و احسان،

خلیفہ منصور عباسی کے سامنے دو مجرم پیش کیے گئے۔ دونوں کا ایک ہی جرم تھا۔
ایک کو موت کی سزا ملی تو دوسرا بول اٹھا۔
"اے امیر المؤمنین! اللہ نے عدل و احسان دونوں کا حکم دیا ہے۔ آپ نے میرے سامنے کیلئے عدل کیا، اب میرے ساتھ احسان فرما دیجئے۔"
خلیفہ اس بات پر ہجوم اٹھا اور دونوں کو معاف کر دیا۔

سعید سلیم - کراچی

امت الصبیحہ

حکایتیں طاعی

اقبال نوید

اجملہ اسلام آباد کی یہ نظم گزرتے وقت کا استعارہ ہے جو اپنے اثرات ہر شے پر ثبت کرتا ہے۔ اہل چین کے دل و نظر سے نگہ ہے جو بھرے خوابوں کو نہ سچا لے سکے۔

نگہ ہوا سے نہیں ہے ہوا تو اندھی تھی
مگر وہ برگ کو ٹوٹے تو پھر ہرے نہ ہوئے
مگر وہ سر کو جھکی اور پھر ٹوٹے نہ ہوئے
مگر وہ خواب کو بکھرے ٹوٹے نشان بکھرے
مگر وہ ہاتھ نہ پکھڑے تو اسخوٹا پکھڑے
نگہ ہوا سے نہیں، تنہا ہی ہوا سے نہیں
ہنسی کے تیر جلائی ہوئی فضا سے نہیں
عدو کے سنگ سے اعیانہ کی جفا سے نہیں
نگہ تو گرتے مکانوں کے باؤں دوسے ہے
نگہ تو پاتے بکھرتے ہوئے سفر سے ہے
ہوا کا کام تو چلنا ہے اس کو چلنا تھا
کوئی دیخت گئے یاد ہے، اسے کیا ہے
نگہ تو اہل چین کے دل و نظر سے ہے
خزاں کی دھول میں پلٹے ہوئے بھر سے ہے
نگہ سحر سے نہیں رونق سحر سے ہے

صبا سلیم

میری ڈائری میں تجھ پر ظہیر اقبال کی یہ غزل آپ سب بہنوں کی مندر۔

سب خواب ریزہ ریزہ ہوئے بے اہل ہوئے
ہم خود غرض نہیں تھے، مگر رائیگاں ہوئے

کس راستوں میں کھو گئی زندگی مری
کس دہیز کی گرد مرے کارواں ہوئے

لمحوں کی گرد و دھول میں رنج بس کے رہ گئی
سب چہرے بکھرے رہ گئے، یکسر ڈھواں ہوئے

زندہ حقیقتوں کی طرح تھے ہو کر تلک
وہ دیکھتے ہی دیکھتے اک داستاں ہوئے

دنیا تو کام کام پہ نفرت بدوش تھی
تم بھی قدم قدم پہ مرا امتحاں ہوئے

اُس شہر بے خزاں کی بہا میں تھیں سے یقین
کیوں اپنا شہر چھوڑ دیا، بے نشان ہوئے

جی راستوں پہ ساتھ چلے تھے کبھی ظہیر
اب وہ ہمارے واسطے اک آستیاں ہوئے



ہمارے لیے بائسنگ میں اولمپک گولڈ میڈل حاصل کیا۔ (غالباً "بائسنگ" کا ہمارا اگوتا اولمپک میڈل) یہی نہیں، حسین شاہ نے اپنے کیریئر میں انیشین گیمز میں پانچ گولڈ میڈل اور ساؤتھ انیشین گیمز میں بھی گولڈ میڈل حاصل کیے۔ 80 کی دہائی میں پورے ایشیا میں بائسنگ کی دنیا میں حکمرانی کی اور بہترین بائسکر کے اعزاز پر قابض رہے، ہم نے حسب عادت اس عظیم بائسکر کی قدر نہ کی اور آج حسین شاہ جاپان میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ 1988ء کی بات ہے، جب حسین شاہ نے اولمپک میں پاکستان کا پہلا بائسنگ گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اس وقت کی حکومت نے حسین شاہ کو کراچی میں صرف ایک سو بیس گز کا ایک پلاٹ دیے کا اعلان کیا۔ حسین شاہ کرکٹ تو تھے نہیں، جو خرے کرتے وہ لیاری جیسے پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک منکسر الزماں بائسکر تھے، سو پلاٹ کے کاغذات ان کے حوالے کر دیے گئے۔ تاہم جب حسین شاہ پلاٹ دیکھنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کوئی پلاٹ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ حسین شاہ نے کئی حکومتی عہدے داروں سے رابطے کیے، مگر شنوائی نہ ہوئی۔ موجودہ حکومت کے سابق وزیر اعظم کے پاس بھی گئے، مگر چونکہ ان کے پاس کرنے کے لیے اور بھی بہت سے بڑے بڑے کام تھے سو وہ حسین شاہ کے چھوٹے سے کام پر کیا توجہ

حکام کی جانب سے آئے دن بائندیلوں کی زد میں رہتی ہیں۔ حال ہی میں فیصل آباد کے ڈی سی او نے نرگس کے لاجا پین کرکام کرنے پر پابندی عاید کر دی ہے۔ اس پر نرگس کی طرف سے بیانات کی ایک سیریز شیلی جا رہی ہے۔

نرگس نے الزام عاید کیا ہے کہ ڈی سی او ان سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ نرگس نہ مانیں تو وہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے۔ ("ڈ" سے دوستی کے بجائے "ڈ" سے دشمنی۔) بلکہ نرگس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ لوگ تو انہیں چالیںس فٹ کے فاصلے سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ انہیں چالیںس رانچ کے فاصلے سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ (فاصلہ تو رکھا ہے ناں۔۔۔ دیے ان کی دور کی نظر کمزور ہوگی۔)

نرگس کا کہنا ہے کہ وہ لاجا نہیں پہنیں گی تو کیا۔۔۔ وہ شلوار قمیض میں بھی نرگس ہی رہیں گی۔ (انہیں آپ اسی لباس میں اچھی لگتی ہوں گی ناں!) نرگس نے عوا کا ہے کہ "لوگ مجھے ممبرون کہتے ہیں۔ آج تو ایسی ادا کارائیں، جن کو اداکاری کی الفب بھی نہیں آتی، خود کو ممبرون کہتی ہیں۔ میری ان کے لیے عقل کی دعا ہے۔" (وہ بھی آپ کے لیے یہی دعا کرتی ہیں۔)

نرگس نے مزید دعا کیا کہ وہ کام کے پیچھے نہیں، بلکہ کام ان کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ (تو آپ کام سے کیوں بھاگ رہی ہیں۔۔۔ دیے کہیں آپ غم آگے پیسہ، تو نہیں بھاگ رہا؟)

بھوک ہڑتال

مغربی اقوام عالم پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک قرار دیتی ہیں جبکہ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم لوگ (چند گندی پچھلیوں کو چھوڑ کر) دہشت گردی سے اتنی دور بھاگتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تو ایسے کھیل بھی مقبول عام نہیں کہ جن میں مارپیٹ کا عنصر نمایاں ہو۔ مثلاً "بائسنگ"۔ یہ ایسا کھیل ہے جو ہمارے ملک میں کوئی خاص مقام نہ پاسکا، حالانکہ اس شعبے میں ہمارے پاس کئی گھر نمایاں موجود ہیں۔

حسین شاہ ایک ایسے عظیم بائسکر ہیں، جنہوں نے

کے بعد 2004ء میں ختم ہو گئی۔ صبح نے عدنان پر شراب نوشی کے بعد مارپیٹ کرنے کا مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ کچھ وقت گزرا۔ دونوں کے دل میں دلی محبت نے جوش مارا۔ یوں 2007ء میں دونوں نے پھر شادی کر لی۔ تاہم اس مرتبہ بھی دونوں میں نہانہ ہو سکی۔ صبح نے علیحدگی کے لیے 2011ء میں عدالت سے رجوع کیا۔ گزشتہ دنوں عدالت نے اس مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ یوں دونوں پھر علیحدہ ہو گئے۔

اسی مرتبہ عدنان نے صبح پر زیادہ الزامات لگائے ہیں۔ بھی عدنان نے کہا کہ صبح نے ان کی زندگی کو جہنم بنا رکھا تھا۔ وہ عدنان سے اپنے خاندان کے ساتھ رقص کرنے اور گانا گانے کی اجازت چاہتی تھی۔



خبریں و کیں

تبصیر و نشاط

(لوگی! خود تو دنیا بھر کے سامنے یہی کچھ کرتے ہیں) کچھ چینلز پر عدنان کا ایک اور بیان چلا کہ صبح کا تعلق طالبان سے ہے۔ (طالبان اور رقص و سرور کی فرمائش۔۔۔؟ لگتا ہے عدنان کے بیانات بھی اسی شخص نے لکھے ہیں، جس نے 2 مئی 2011ء کا ایبٹ آباد والا اسکریپٹ لکھا تھا۔ ویسے عدنان جی! آپ ہمارے اچھے وزیر داخلہ بن سکتے ہیں۔)

کام

نرگس کو شوبر میں آئے ایک عرصہ بیت چلا ہے۔ مگر گزرتے وقت نے ان پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کیے ہیں۔ وہ فلموں سے اسٹیج کی دنیا میں آئیں اور ایسی چھائیں کہ پھر کوئی ان کا دم مقابل نہ رہا۔ (یہ اور بات ہے کہ اداکاری سے زیادہ ان کے "رقص" مقبول ہیں۔) تاہم نرگس اسٹیج کی وہ اداکارہ ہیں، جو متعلقہ

کھیل

بزرگوں سے سنا تھا کہ "شادی بیاہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔" لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ کچھ لوگ اسے کھیل ہی سمجھتے ہیں۔ جیسے اپنے عدنان سمجھتے ہیں۔ پھر عدنان جیلائی۔۔۔ (ان دونوں کا صرف نام ہی مماثل نہیں، شوق بھی ایک جیسا ہی ہے۔) دونوں شادیوں پر شادیاں کیے چلے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں عدنان کی اپنی اہلیہ صبح گلزاری سے علیحدگی ہوئی ہے۔ عدنان نے صبح سے دو مرتبہ شادی کی۔ یہ مغرب کا خاصا پسندیدہ چلن ہے، جو عدنان نے بھی اپنایا۔ (شکر ہے!) عدنان یہاں نہیں رہتے، ورنہ ان کی تقلید میں یہاں بھی اسے رواج دے دیا جاتا۔) پہلی مرتبہ ان کی شادی 2001ء میں ہوئی، تاہم یہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور دونوں طرف سے مختلف الزامات کی بوچھاڑ

سید علی حسن

میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس طرح 22 مئی 2012ء کو بھی سندھ محبت ریلی پر فائزنگ کر کے پریس کلب تک جانے سے روک دیا گیا۔

(خورشید علی عباسی)
سید زاہد ملتان یوسف رضا گیلانی نے اخباری انٹرویو میں یہ بھی کہا کہ میں نے عدالت کی کوئی توہین نہیں کی۔ یہ صرف آئین کی تشریح کا معاملہ ہے۔ اس نکتہ میں ہر سزا یافتہ مجرم کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتا ہے کہ فلاں آئین کی تشریح جو میں کر رہا ہوں وہ درست ہے۔ وہ نہیں جو عدلیہ کر رہی ہے۔

(عرفان صدیقی۔ نقش خیال)
لیاری کے سیاسی کارکنوں کا کہنا ہے کہ ایف سی کے اہلکاروں نے گھروں کی تلاشی کے دوران امتیازی رویہ اختیار کیا اور بلوچ گھرانوں کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔

(ڈاکٹر توصیف خان)
امریکا میں فوجیوں کی خود کشی ایک بڑا مسئلہ بن کر ابھر رہی ہے۔ روزانہ 18 سابق فوجی موت کو گلے لگا رہے ہیں۔ افغانستان اور عراق میں جنگ لڑنے والے ہزاروں فوجی موت کو گلے لگا چکے ہیں۔

(انٹونی سونفوڈ۔ نیوزیک)
یوسف رضا گیلانی میں پارٹی سے وفاداری کے سوا کوئی خوبی نہیں۔ یہ نام کے بڑھے لکھے ہیں۔ یہ کرپشن کے بادشاہ ہیں اور ان میں وہ گہرائی بھی نہیں تھی جو وزیر اعظم کے عہدے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

(جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)
راجہ پرویز اشرف کو وزارت سے سے شخص اس لیے ہٹایا گیا کہ ان کی پرفارمنس ٹھیک نہیں تھی انہیں چیف ایگزیکٹو کیوں بنادیا گیا؟ ملائقی کی اتنی بڑی سزا؟

(اباز خان۔ جستجو)



دینے۔ نتیجتاً چوبیس سال گزرنے کے بعد بھی حسین شاہ اپنے حق سے محروم ہیں۔
(حسین شاہ جی! بھوک ہڑتال کرنے سے بہتر ہے، حالات حاضرہ کے کسی پروگرام کے انہکو پر سن بن جائیں۔ ایک سو بیس گز کے ایک پلاٹ کے تو کیا بیٹھے بٹھائے ہزاروں مربعوں اور کنالوں پر مٹی پلاٹ کے مالک بن جائیں گے۔)

کچھ ادھر ادھر سے

دنیا کا ہر مثبت کام روح کی خوراک ہوتی ہے اور دنیا کی ہر منفی سرگرمی ہماری روح کے لیے بیماری۔ فلان عالمہ خدمت، برداشت، وسعت قلبی، سخاوت، انسانیت، رحم دلی گواہی انصاف یہ وہ تمام مثبت سرگرمیاں ہیں جو روح کی تواناں بن رہی ہیں اور ان سے روح کے اندر سکون پیدا ہوتا ہے اور یہ سکون خوشی بن کر ہمارے چہرے ہماری آنکھوں میں چمکتا ہے۔

(جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)
12 مئی 2007ء کو چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو سندھ ہائی کورٹ تک جانے سے روکنے کے لیے شاہراہ فیصل جیسی مصروف شاہراہ کو قفل گاہ

مسرت حسن _____ سعودی عرب
عجب انداز ہیں اس کے بھی سینے اور سنورنے کے گماں کرتا ہوں میں جیسا، وہ اکثر وہ نہیں لگتا نوشین اقبال _____ سندھیلانوالی
وہ دیا سو گیا اپنی روانی ختم کر کے مجھے بھی گھر بلاتا ہے کہانی ختم کر کے مجھے بھی دفینکاں کی سمت ہی تو لوٹنا ہے کسی دن ناگہاں یہ خوش بیانی ختم کر کے سارا نوید _____ کراچی
زمین و آسمان ہوتے ہوئے بھی میں بے گھر ہوں مکاں ہوتے ہوئے بھی ہزاروں غویاں ہیں آدمی میں ہزاروں خامیاں ہوتے ہوئے بھی کومل عدنان _____ گلستان جوہر
شریک سفر دوستارے ہوئے ہم ان کے ہوئے، وہ ہمارے ہوئے عجب آسمانوں کی سیر میں ہوئے عجب جنتوں کے نظارے ہوئے رابی جونی _____ فیروزہ
تبہ سورج سمجھ کر نہیں ہوا جاتا جو دل لگاتے ہیں، قرآن نے تھوڑی ہوئے ہیں کہاں زبان و بیان کا اگر محبت میں یہ معاملہ سمجھاتے تھوڑی ہوتے ہیں حنا کنول _____ حویلی کھانا
تمہارا ساتھ ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں دگر نہ بے مزا ہیں پھول خوشبو اور برساتی فوقیہ ریاب پیچہ _____ پیچہ وطنی
لے کر زنجیریں ہاتھوں میں کچھ لوگ تمہاری ٹانگیں ہیں اے عشق ہماری لگیوں میں نہ اور پھر تو اچھا ہے

اُم کلثوم لونادی _____ گدو کشمور
کتنے برسوں کا سفر خاک ہوا اُس نے جب پوچھا کیسے آنا ہوا؟
ناہیدہ لونادی _____ کراچی
ہر ایک دن اُداس دن ہر ایک شب اُداسیاں کسی سے کیا پچھڑ گئے کہ جیسے پچھڑا نہیں غم، افسر _____ کراچی
ہاگ میں دشمن بھی تھے اور پشت پر احباب بھی تیر پہلا کس نے مارا یہ کہانی پھر سہی اربیر خان _____ خان پور
اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ بھی تو ہے جس جگہ عشق نے بنیاد دفن رکھی تھی سیدہ نصرت ذہرا _____ کھروڑ پکا
لیو لہان چراغوں کے سرے ہیں مجھے تمہارے شہر میں ایسے بھی گھرے ہیں مجھے سدرالجم _____ کوٹہ
مجھے بتاؤ اگر گھونٹے سلامت تھے! ہوا میں اڑتے ہوئے کس کے سر پہلے تھے ندا، فضلہ _____ کراچی
کہاں کا سود و زیاں اور کہاں کا کار جہاں مزدوروں کی مسافت نے مار دکھا ہے صدف محبوب _____ سرگودھا
عجب بے کلی ہے، پس عشق بھی یہ لمحہ گزارا نہیں جا رہا! نہیں دور تک جیت کا شائبہ مگر ہم سے ہمارا نہیں جا رہا

نگاشتی کو زبان ملے

ادبی

شمینہ اکرم لیاری کراچی

شہزاد کلاسے پہلے شمینہ علی کمانا پسند تھا، مگر اب یہی نام میری پہچان ہے۔ شہزاد قلم میں لیاری کے علاقہ بہار کلاوی میں گزشتہ کئی سال سے مقیم ہوں۔ ماشاء اللہ چار بچوں کی والدہ ماجدہ کے عہدے پر فائز ہوں اور ایک عرصہ سے مستقبل کے معماروں کو علم کی روشنی سے روشناس کرا رہی ہوں (میں اپنے گھر پر بچوں کو کوچنگ دیتی ہوں) کراچی یونیورسٹی سے گریجویٹ ہوں، وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔ پسندیدہ مشغلہ میں سر فرسٹ ”مطالعہ کرنا اور ڈائری لکھنا ہے۔“ میں کئی بار کے پڑھے ہوئے ناولز بھی بار بار پڑھنے سے بور نہیں ہوتی۔ پڑھنے کا اتنا چمکا ہے کہ اگر دور ان صفائی کوئی اخبار کا صفحہ ہاتھ لگ جائے تو صفائی چھوڑ چھاڑ وہ پڑھنے پڑھ جاتی ہوں۔ اسی بدولت معلومات غضب کی ہیں۔ لی وی پر صبح ”عالم آن لائن“ دیکھتی ہوں۔ حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لیے نیوز چینل بھی دیکھتی ہوں۔ مارننگ شو دیکھ کر بی بی شوٹ کرتا ہے اس لیے نہیں دیکھتی لیکن اگر ہماری ڈائجسٹ رائٹرز کا لکھا کوئی ڈراما چل رہا ہو تو صرف وہ دیکھتی ہوں۔ بصورت دیگر ہمارے لی وی ڈراموں کا معیار بہت گر گیا ہے اور پھر لی وی کے آگے بڑھنے کی فرصت ملتی بھی نہیں ہے۔ شادی کے بعد میں نے تعلیم جاری رکھی۔ مختلف قسم کے کورسز ڈیپلوہ کے۔ کیونکہ مجھے فارغ رہنے سے زیادہ مصروف رہنا اچھا لگتا ہے۔

”خواتین ڈائجسٹ“ سے میرا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ میں خود پرانی ہوں۔ 7th کلاس سے رسالہ پڑھنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ — اس کے ابتدائی شمارے بھی پڑھ ڈالے ”جس کے لیے میں نے

کوئی لائبریری نہیں اور پرانا بک اسٹال نہیں چھوڑا۔ جگہ جگہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر رسالے خریدے اور ابتدا سے اب تک کے تقریباً ”سب ہی شمارے پڑھ ڈالے۔ پڑھنے کی رفتار ڈرون حملوں کو بھی پیچھے چھوڑتی ہے۔ شادی سے پہلے ایک ہی نشست میں پورا ڈائجسٹ ختم کیا کرتی تھی۔ جس پر اباجی مرحوم ناراض ہوتے تھے۔ پھر میں پیشہ اباجی کے معجب جانے کے بعد ہی رسالہ پڑھا کرتی تھی۔

پہلے پہل صرف ”خواتین ڈائجسٹ“ پڑھنا شروع کیا۔ بعد میں ”شعل“ اور ”کن“ کی بھی ریگولر قاری بن گئی۔ ہمیشہ اپنے جیب خرچ سے منڈکا کر پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کا عادی بنا دیا۔ جبکہ اسٹوڈنٹ لائف میں کبھی میری تعلیم پر اس کا برا اثر نہ پڑا۔ بلکہ ہر قسم کے حالات میں مجھے اس سے رہنمائی ملی۔ میں ہمیشہ اپنی کلاس کی پوزیشن ہولڈر رہی۔ دورانِ امتحانات بھی میں باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھی۔ شعور و آگہی کی دہلیز پر قدم رکھنا پھر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ایک استاد کی طرح ہر قدم پر مجھے سنبھالا۔ ہر دفعہ میں نے اسے پڑھ کر کچھ نہ کچھ سیکھا ضرور ہے اور آج تک سیکھ رہی ہوں۔ جب بھی میں کوئی نصیحت آموز کہانی پڑھوں تو اپنی میٹرک اسٹوڈنٹس سے ضرور شیئر کرتی ہوں اور انہیں بھی خواتین ڈائجسٹ پڑھنے کی تاکید کرتی ہوں کیونکہ خواتین کی کمائیاں شخصیت کو سوارا رہی ہیں، بگاڑتی نہیں۔ اس کے پڑھنے سے وقت کا ضیاع نہیں ہوتا، بلکہ ہم علم کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ زندگی کی وہ کٹھن حقیقتیں جن سے ہم نظریں چراتے ہیں اسی کی وجہ سے آسان ہو جاتی ہیں۔ ہر ماں کو اپنی بیٹی کے لیے ”خواتین“ ضرور اپنے گھر لگوا لینا چاہیے۔ ”خواتین“ ہی نہیں بلکہ ”شعل“ اور ”کن“ بھی ہر گھر میں ہر ماں ضرور آنا چاہیے۔ یہ بچیوں میں زندگی کو بہتر انداز میں سمجھنے اور گزارنے کا سلیقہ و تربیت سکھاتا ہے۔

آج تک مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آیا!

میرے اندر کوئی خوبی ہے بھی کہ نہیں۔ مجھے تو صرف اپنی خامیوں سے ہی انگلی ہے۔ بہت زیادہ حساس ہوں اور میری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت اکثر نقصان سے دوچار کرتی ہے۔ ملکی حالات اور سیاستدانوں کے کارناموں (کرپشن کے کارناموں) پر جلتی کڑھتی رہتی ہوں۔ کسی کی جوانی اور ناگمانی موت پر ہفتوں دکھی رہتی ہوں۔ لوگوں پر بہت جلد بھروسہ کر لیتی ہوں۔ بدلتے رویے مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ اپنے دھوکوں کی تشہیر کرنا مجھے پسند نہیں۔ اجنبی لوگوں سے جلدی مکمل نہیں سکتی۔ دوست بنانے میں کبھی پہل نہیں کرتی، تحفہ لینے سے زیادہ تحفہ دینا پسند ہے۔ گفتگو دینے کے مواقع ڈھونڈتی ہوں۔ اس بات سے مجھے دلی خوشی ملتی ہے۔ سنجیدہ مزاج اور کم گم ہوں، مگر اپنے فیورٹ لوگوں سے گفتگو بغیر فل اسٹاپ و کوئے کے بول سکتی ہوں۔ (جیسے اینیلہ یا پھر فریدہ) گھر میں رہنا پسند ہے تقریبات میں جانا بالکل پسند نہیں۔ ٹھنڈے مزاج کی ہوں مگر جب غصہ آتا ہے تو بہت شدید آتا ہے۔ غلط بات بالکل برداشت نہیں ہوتی۔ قناعت پسند ہوں اللہ کی رضا میں راضی رہتی ہوں۔ اللہ پر توکل کامل ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ ہندوں کو صبر کرنا چاہیے، پھر صبر و شکر کا انعام ملتا ہے۔

شادی سے پہلے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی، کیونکہ امی کے گھر پر خرافات منانے کا رواج نہیں، جبکہ سرال میں سالگرہ کو بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ تمام فیملی ممبران ایک دوسرے کا برتھ ڈے یاد رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دوش ضرور کرتے ہیں اور میٹ بھی لیتے ہیں۔ میری تاریخ پیدائش 4 مئی ہے۔ بچوں کی طرح باقاعدہ موسم بقی جلا کر کیک تو نہیں کاٹتی۔ ہاں! اس حد تک ضرور اپنی سالگرہ مناتی ہوں کہ کچھ بھی اچھا سا کیک کسب کوڑے دی۔ رات کو اکرم آکس کریم کھلاتے ہیں۔ البتہ اپنی وہ سالگرہ میں کبھی نہیں بھول سکتی، جب میری میٹرک اسٹوڈنٹس نے میری سربراہ برتھ ڈے سیلیمینٹ

کی تھی۔ سب لڑکیوں کو معلوم تھا کہ 4 مئی کو میم کی سالگرہ ہوتی ہے۔ 4 مئی کی شام میں بچپن میں کوئٹنگ کر رہی تھی، جب وہ لوگ چیکے سے آئیں اور ڈھیر سارے پھولوں کی مجھ پر بارش گردی اور کورس میں ”ہی برتھ ڈے ٹو“ کہہ کر مجھے دس کیا۔ تین جانیں، بچیوں کی اتنی محبت پر میری آنکھیں بھگ گئیں۔ ڈھیروں برتھ ڈے کارڈز + پھول + گفتگو۔ سب سے زیادہ ان کی پر خلوص محبت جو میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔

4 مئی 2011ء کی بات ہے جب ہمارا موریم نے کوچنگ کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر میری سالگرہ کی چیکے چیکے تیار کی۔ (اتنی خاموشی سے سالگرہ شام میں ارنج کی کہ مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی) شام میں آکر کمرے کو سجاوا۔ کیک، کینڈلز، کولڈ ڈرنک دیگر امینیکس سے ٹیبل سجا کر مجھے بلا کر سربراہز اوپن کیا اور سب نے دس کیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں محبتوں کے معاملے میں کتنی امیر ہوں۔ ان کی ڈھیر ساری محبتیں یا کمر میں سرشار ہو گئی، جبکہ وہ پھول اور کارڈز میں نے اب تک سنبھال کر رکھے ہیں کیونکہ میں محبتوں کی اس قدر حفاظت کرتی ہوں۔ جب مجھے عمیرہ احمد کانول ”ایمان امید اور محبت“ بطور برتھ ڈے گفٹ ملا۔ یہ سالگرہ کا دن بھی میرے لیے یادگار دن رہا۔

ایک وقت تھا جب میں نے درجنوں ڈائریاں ہزاروں اشعار سے بھر رکھی تھیں۔ شاعری میری کمزوری تھی۔ مگر اب میری یہ دیوانگی کم ہو چکی ہے۔ گھر اور بچوں کے چکر نہ گھن چکر بنایا ہوا ہے۔ چلیں! میری پسند کا شعر پڑھیں اور مجھے دیں اب اجازت۔ دعاؤں کی طلب گار۔

اے خدا! اگر لوگ بتائے تھے پھر کے میرے احساس کو شیشہ نہ بنایا ہوتا!

دلی محسوس کرتے ہیں خلش درد محبت کی جو اپنے آپ سے بڑھ کر کسی سے پیار کرتے ہیں



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

فریدیہ۔۔۔ واہ کیٹ

میں نے خواتین ڈائجسٹ کا پہلا پرچہ 1990ء میں خرید اس وقت سیکنڈ ایئر میں تھی اور اسی سال میری شادی ہوئی تھی۔ 1997ء میں میں لندن پر منظم میں شفٹ ہو گئی۔ بھائی سے میں نے کچھ ناول اور پرچے منگوائے۔ ان میں فریدیہ اشفاق کا ایک ناول چل رہا تھا، اب نام یاد نہیں لیکن لڑکی نام رانی اور لڑکے کا نام شازے تھا آپ اگر مجھے اس ناول کا نام بتادیں اور یہ بھی کہ کیا مجھے مکمل ناول مل جائے گا۔ میں اپریل میں پاکستان آئی ہوں اور خواتین اور شعل فوراً خریدے ہیں سب کچھ دیسایا تھا۔ عنینہ سید، نگت عبداللہ۔ آسیہ رزاقی سب موجود تھیں مجھے لگائیں صحیح معنوں میں انہوں میں آگئی ہوں۔

ج: فریدیہ! ہمیں خوشی ہے کہ اتنے طویل عرصہ کے بعد خواتین سے آپ کا تعلق رابطہ بحال ہوا تو آپ کو اس میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی جس ناول کا آپ نے ذکر کیا وہ فریدیہ اشفاق کا ناول شکست شب تھا۔ یہ کتابی شکل میں آچکا ہے۔ مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی سے مل سکتا ہے۔

نایاب چندہ۔۔۔ F.F.C چوک

یہ رسالے صادق آباد میری باقی کے پاس آتے ہیں پھر وہ اسی دن میرے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ میں پڑھ کر ارم گودتی ہوں پھر ہم باہمی دو شادی شدہ بہنوں کرن اور سلطانہ کے پاس پہنچ دیتے ہیں۔

میری، ارم کی اور پاجی رانی کی فوریٹ کہانی ”ساری بھول ہماری تھی“ اس ماہ بھی یہ زبردست تھی اب آخری قسط کا انتظار ہے اور جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو بھی کافی سسپنس پر ختم ہوا۔

میرے خواب لوٹاؤ کا پچھلی اقساط کا خلاصہ دیا ہوا ہے، اس میں یہ غلطی کی ہے کہ وہاں لکھا ہوا ہے اسیہ نے سارہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتایا جو کہ نہیں بتایا اور میرے مطابق اسیہ ششدر کی بہو میں ہے کیونکہ سارہ جن پستیوں میں جائے گی۔ رازی کو بھی لے جائے گی اور تاجور کاٹوئیں نے پہلے ہی اٹھاؤہ حمادی ہیرو بن گئے۔

ج: نایاب! آپ ہمیں جس طرح مل جل کر رسالے پڑھتی ہیں کاش وطن عزیز کے سارے لوگ اسی طرح ایک دوسرے کا خیال کرنا سیکھ لیں۔

غلطی کی نشان دہی کے لیے شکریہ آپ نے صحیح لکھا ہے۔ اسیہ نے سارا کو نہیں بتایا یہ جان کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ ہماری قارئین پچھلی قسطوں کا خلاصہ بھی دیکھی اور بڑی توجہ سے پڑھتی ہیں۔

امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ثانیہ مشعل۔۔۔ حویلی لکھا، تحصیل دیپالپور، ضلع اوکاڑہ

سرخ رنگ سے جی ماڈل نہایت اچھی لگی۔ سب سے پہلے ”جو بچے ہیں سنگ“ پڑھا۔ اف فرحت آبی کی ہر

بیرونی بنی محبت سے گندھی ہوتی ہے۔ ویل ڈن فرحت جی ”بریکنگ نیوز“ بہت اچھا لگا۔ سلائی کیلئے سے توجان چھوٹی۔

آسیہ رزاقی کا ”آخری کوشش“ زبردست۔ ”لگی تھی جو جیت“ سمیر حمید کا ناول اچھا تھا۔ مگر کچھ جھول سا تھا ”میرے خواب لوٹاؤ“ کی یہ قسط شان دار رہی۔

ج: ثانیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

رابعہ ملک، جویریہ غنی۔۔۔ قصبہ فیروزہ

ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی ہماری امیدوں سے بڑھ کر تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک قسط وار ناول۔۔۔ واہ مزہ آ جاتا ہے۔

”کوہ گراں تھے ہم“ کیا کمال کی اسٹوری ہے۔ بہت اسٹونگ اور سب سے جدا۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں اس کی تعریف کے لیے۔ اینڈ میں ماہ نور بی بی تو گھوم گئی رہم جھوم گئے۔ اور آخر میں فرحت اشتیاق! آہہ۔۔۔ کیا نگہ تھی میں فرحت جی! ایک ایک لفظ موتیوں سے جڑا۔ بہت قیمتی ہے یہ اسٹوری ہمارے لیے۔ اب خدا جانے یہ ام مرتضیٰ کیا کریں گی۔

ج: شعاع! خواتین ہمارے دکھ سکھ کے سانچے۔ چون جوگے شالا آباد رہیں۔ رابعہ اور جویریہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ بہت خوب صورت تبصرہ کیا آپ نے۔ تہ دل سے شکریہ۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرنی رہیے گا۔

صالحہ اقصیٰ۔۔۔ میرپور، آزاد کشمیر

جون گرمیوں کی جیتی دوسریں ہوں یا دسمبر کی ٹھنڈی ہوئی سردی ہو۔ گرمیوں میں آم کھانے کا موسم ہو یا سردیوں میں مالے کھانے کا موسم خواتین اور شعاع سے رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ وجہ شاید نہیں یقیناً ”اس کا معیار جو شروع سے لے کر چالیس سال تک آج بھی قائم ہے۔ عنینہ سید بڑی خوب صورتی سے کہانی کو آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ ماہ نور نے جس تماشے والے جوں اور کہار کو دکھایا وہ ایک ہی شخص سعد ہے اور یہ اسی طرح کے مختلف کام کرتا رہے گا فرحت اشتیاق کے ناول کی یہ قسط بھی نایب رہی، آسیہ رزاقی کا ناول بھی

اچھا تھا۔ شہزادی عباس کا ناول بھی اچھا تھا۔ افسانوں میں بریکنگ نیوز سب سے اچھا رہا بانی افسانے بھی اچھے تھے۔ صنم بلوچ کا تفصیلی انٹرویو شامل کریں اور مہمن میں ندایا سراور یا سر نواز کا انٹرویو شامل کریں۔

ج: صبا اور اقصیٰ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف اور مشورے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ فرمائش نوٹ کر لی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

سدرہ ساحر قریشی۔۔۔ ٹھٹھہ سندھ

خط لکھنے کی وجہ فرحت اشتیاق کا ناول ”جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو“ ہے اور سینور سکندر کا کر دار بہت اچھا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے اس کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ ”کرن کرن رو شنی“ بڑھ کر ایمان تو تازہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کافی سال پہلے ایک ناول پڑھا ”ڈائجسٹ کافی پرانا تھا پڑھا ہوا اس لیے مصنف کا نام نہیں پڑھ سکی البتہ کہانی کا عنوان یاد ہے ”وہ اک ایسا شجر ہو“ تھا۔

ج: سدرہ خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ جس ناول کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے۔ وہ فرحت اشتیاق نے لکھا تھا۔ کرن میں نومبر 2000 میں شائع ہوا تھا۔ اب کتابی شکل میں آنے والا ہے۔

فرخندہ انجم۔۔۔ لاہور

آج نہ تو کسی کہانی پر تبصرہ کرنا ہے نہ ہی کچھ اور لکھنے کو دل کر رہا ہے تمام پڑھنے والی پرانی سل اور نئی نسل سے صرف ایک سوال پوچھتا ہے؟

کیا ایک ماں جو بیٹے کو پاتی ہے پڑھاتی ہے اس کے لیے لڑکی پسند کرتی ہے اور وہی لڑکی سرال سے لائے ہوئے جوڑے کو پسند ہی نہ کرے شگون کے جوڑے کو نکاح کے دن پہن کر ہی نہ دکھائے اس لڑکی کی۔ تعلیم و تربیت کیا ہوئی اور وہ ساس جو ہو کو بیٹا کر کھنے کا سوچے بیٹھی ہو اسے پہلی بیڑھی پر روک دیا جائے۔

کہ تمہارا بیٹا تو ہمیں پسند ہے۔ تمہاری لائی ہوئی کوئی بھی چیز ہمیں پسند نہیں وہ ماں جس نے بازار گھوم گھوم کر سب کچھ پسند کیا ہو اس کی پسند کو اہمیت ہی نہ دی جائے لڑکی کی ماں بجائے اس کے کہ بیٹی کو سمجھائیں۔ اس کی

فرزانہ شبنم۔۔۔ گلخانہ تحصیل کھاری

شعاع اور خواتین سے دوستی کو تقریباً بارہ سال ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے نام لوں گی عمیرہ احمد کا کہ بہت زبردست لکھتی ہیں میں حیران ہوتی ہوں کہ اللہ نے ان کو بہت ذہین بنایا ہے فرحت اشتیاق کو اللہ صحت دے۔ راحت جنیں کانول ”میری مٹی سے میرے خوابوں کا رشتہ“ اور میمونہ خورشید کا ”سن اے سحجنی“ ان کو دوبارہ شائع کریں کوئی اعتراض نہیں کرے گا کہ سب کو پسند آئے گا۔ مہر واجد چھوٹی سی عمر میں اتنے زبردست ناول لکھتی ہیں کہ ماشاء اللہ ”جنت کے پتے“ کا تو میں نے بھائی کو انگلیٹنڈس بتایا کہ تم بھی پڑھو، پہلے وہ مجھے منع کرتا تھا لیکن اب وہ خود بھی بہت شوق سے پڑھتا ہے۔

ج : پیاری فرزانہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ دس سال سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہیں یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن یہ بات اچھی نہیں لگی کہ آپ نے اس عرصہ میں ایک بھی خط نہیں لکھا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سیدہ نازیہ حسن۔ تاندلیا نوالہ فیصل آباد

جون کا خواتین زبردست تھا۔ شہزادی عباس خلیجی ہیں تو بی بی رائے مگر بہت اچھا لکھتی ہیں سمیرا حمید اور آسیہ رزائی نے بھی کمال کر دیا۔

مجھے جس تحریر نے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ مٹی میں شائع ہونے والا صبحت اسمین کا مکمل ناول ”مزاحف“ پڑھتے ہوئے خود بخود آنسو نکلنے لگے اس سے پہلے بھی کئی تحریروں نے دلایا جس میں ”درد گر آدمی“ کے حیدر مغیث کی موت اور اس کی محبت نے۔

خواتین کا ایک سلسلہ ”تصویری بناتے جائیں“ اپریل 2011ء کے بعد ایک بار بھی شائع نہیں ہوا۔ کیا ساجدہ حبیب کلرودی وعدہ اور وفائیں کتابی شکل میں آگیا ہے؟ پلیز بتائیں۔

نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز، رضا خالد، فرحت اشتیاق، ام مریم، سندس جبین، مریم عزیز اور نازیہ کنول نازی نے ہیو بنانے کے لیے خصوصی فیکٹریز لگوا رکھی ہیں کیا؟ ویسے مجھے ذاتی طور پر خوب صورتی سے زیادہ مرد کا باکردار ہونا پسند ہے۔ مگر باکردار مرد بہت کم ہوتے ہیں۔

ساس کو سمجھائیں چلیں بچی ہے۔ بس آج کل کی لڑکیاں ایسی ہی ہیں۔

میں آج کل کی لڑکیوں سے ایک سوال کرتی ہوں اگر آپ کو سسرال کی لائی ہوئی کوئی چیز پسند نہیں آئی تو کیا وہ ساس کے ساتھ پہلے قدم پر ایسا سلوک کرے گی؟ میں سخت پریشان ہوں ہو سکتا ہے آپ کا جواب مجھے ذہنی سکون دے۔

ج : فرخندہ! آپ کی پریشانی کا جان کر افسوس ہوا۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں تو یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں۔ شادی کا دن ایک لڑکی کی زندگی کا اہم ترین دن ہوتا ہے۔ اس دن اسے سینکڑوں لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنا ہوتا ہے مودی کی شکل میں یہ لمحات نامہ محفوظ رہتے ہیں۔ اگر اسے شادی کا جوڑا پسند نہیں آیا، اس کا رنگ اچھا نہیں لگا یا کوئی اور وجہ ہے اور وہ اپنی پسند کا جوڑا پہننا چاہتی ہے تو یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں۔

آپ کی بیٹی کو اگر سسرال کا جوڑا پسند نہ آئے تو آپ کیا کریں گی دو ہی صورتیں ہیں یا تو اس کو سمجھا بھار کر راضی کریں گی کہ وہ نا پسندیدہ چیز کو قبول کرے یا اس کی پسند کے مطابق جوڑا دلوا دیں گی۔ لیکن یہ سوچیں آپ کی بیٹی دل سے خوش نہیں ہوگی۔ وہ سمجھو ما کرے گی ایک ماں کی حیثیت سے آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔ اگر ایک ماں اپنی بیٹی کی خوشی چاہتی ہے وہ نہیں چاہتی اس کی بیٹی سمجھوتا کرے تو آپ بھی اسے اپنی بیٹی سمجھ کر اس کی خوشی کو قبول کر لیں۔

آپ کی بہو اگر اپنے دل کو سمجھا لیتی اور تھوڑا سا سمجھوتا کر لیتی تو اس میں اسی کا فائدہ تھا۔ آپ کے دل سے نکلی دعائیں اس کی آئندہ خوشگوار زندگی کی ضامن ہوتیں

اور اس کی سعادت مندی سے آپ کے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہوتی۔ لیکن کم عمری میں انسان بہت سی باتیں سمجھ نہیں پاتا۔ وقت کے ساتھ اسے عقل آجائے گی۔

یہ تو ہمارا نقطہ نظر ہے۔ ہم اپنے قارئین کو بھی اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ اس موضوع پر اظہار خیال کریں۔ آئندہ ماہ ہم آپ کے خطوط شائع کریں گے۔

رائٹرز سے بلکہ قابل احترام پھاری رائٹرز سے مودبانہ گزارش ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کے نام اعراب کے ساتھ ایک دفعہ لکھ دیا کریں تاکہ ان کا صحیح تلفظ سے بڑھ سکیں اور برائے مہربان ان نام کے مطالب بھی ساتھ لکھا کریں۔ بشری گوئل نے بہت عرصہ سے کچھ نہیں لکھا۔ سدرۃ المنتبی سے گزارش ہے کہ پلیر نام لے کر اور واضح الفاظ میں آسان لکھا کریں۔ کمائی پڑھتے ہوئے پتائی نہیں چلتا کہ ہیرو کی بات ہو رہی ہے یا ہیروئن کی مفروضہ تو آپ لکھتی ہیں گریڈز اچھایا مت کریں۔ پھاری آسیر زانی آپ کی تعریف کے لیے ستارے اکٹھے کر کے لفظ بنانے پڑیں گے۔ آپ کی کمائیوں کی نایاباں اور ادایاں اللہ انہیں جی عمر بہت ساری تندرست کے ساتھ دے۔ آمین۔

اور مجھے ان قاری بہنوں سے کہنا ہے جو صرف تنقیدی کرنا اپنا مقصد سمجھتی ہیں کہ رائٹرز بہت کھلاؤ لکھتی ہیں مگر مجھے ایسی کوئی بات بھی نظر نہیں آئی۔ آپ میں سے اکثر کے گھر کیل ہے جس کے دروازے دیکھ کر دیوار میں ٹکر مارنے کوئل کرنا ہے اور آپ Ptv پر بھی ہماری ڈائجسٹ کی کمائیوں سے بہت زیادہ روٹاں دکھایا جاتا ہے۔ بات میں صرف یہ کرنا چاہتی ہوں کہ ایک سبق آموز کمائی جب لکھی جائے تو سب واضح کرنا ضروری ہو گا کیونکہ آج کل کے بچے وہ نہیں ہیں کہ ماں باپ کے منع کرنے سے رک جائیں بلکہ وہ اس چیز کے پیچھے زیادہ ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں جس سے روکیں مگر میں یہ بات خاص کر ماؤں سے کہنا چاہوں گی کہ پلیر آپ اپنی بیٹیوں کی دوست بنیں تاکہ ڈنڈا چلانے والی مائیں۔ میرے خیال میں بہت صاف ستھرا ادب ہم تک ان رسالوں کے ذریعے پہنچتا ہے۔

ج : پیاری نازیہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ خوب صورت تبصرے کے لیے تمہ دل سے شکریہ جہاں تک ہمیں علم ہے پرائیویٹ چینلز کے ڈراموں کی ڈی وی ڈی دستیاب نہیں ہیں۔ نایاب جیلانی اور نیلہ عزیز کے متعلق جو سوال آپ نے کیے ہیں۔ ہم جلد ہی ان سے انٹرویو کریں گے۔ اس میں ان سوالوں کے جواب بھی دریافت کر لیں گے۔

خصوصاً ہیرو کی فیکٹرز کے متعلق مصنفین خود ہی بتا سکتی ہیں ویسے ہمیں کچھ اندازہ ہے کہ ہیرو کی یہ قسم نایاب ہے اور زیادہ تر یہ خواب و خیال کی دنیا میں پائے

جاتے ہیں۔ سدرۃ المنتبی بہت اچھی اور ذہن مصنفہ ہمیں بھی ان سے یہی شکایت ہے کہ وہ تھوڑا مشکل لکھتی ہیں۔ ہم نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ قدرے عام فہم انداز میں لکھیں۔

عالیہ متول۔ حویلی بہادر شاہ

جون کا شمار ہاتھ میں ہے ٹائٹل انتہائی برا لگا آب کو میری بات بری لگے تو لکے میں تو کافی عرصے سے مستقل قاری ہوں خواتین کی لیکن قلم اٹھایا شادی کے بعد اب میں اتنی مصروف رہتی ہوں میرے دو بچے بھی ہیں جوائنٹ سسٹم بھی ہے میں بیمار ہوں پلیر آپ میرے لیے صحت کی دعا کریں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

عزیزہ سید بہت اچھی طرح سے کمائی بھاری ہیں گرہیں کھاتی جاری ہیں نگہت عبداللہ نے بھی کچھ کچھ تیز کر دی ہے کمائی آسیر زانی کی آخری کوشش بھی اچھی تحریر تھی۔ فرحت اشتیاق ویل ڈن بہت خوب لکھ رہی ہیں۔

”ساری بھول ہماری تھی“ میں بہت دکھ ہوا بہر حال اچھا ہوا عمریش کی آنکھیں تو کھلیں شہزادی عباس کا وفا حسن ناؤٹ نازیہ کا کردار کے علاوہ احسن کی وفا پسند آئی۔

ج : پیاری عالیہ! اللہ تعالیٰ آپ کو شفا سے کلی عطا فرمائے آمین۔

کمائیاں لکھی ہیں تو سنہال کرکوں رکھی ہیں ہمیں بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ یہ بات ہمیں کیوں بری لگے گی۔ آپ کو اپنی رائے رکھنے اور اس کا اظہار کرنے کا پورا حق حاصل ہے ہم نے یہ سلسلہ آپ لوگوں کی آراء جاننے کے لیے ہی شروع کیا ہے۔

نجمہ بخاری۔ مظفر گڑھ

ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ جی، تو بات ہو جائے ”جو بچے ہیں سنگ“ کی لگ رہا ہے ایک اور ہند گلی، سکندر کا مقدر ہونے والی ہے۔ لیکن فرحت جی سے گزارش سکندر کے ساتھ کچھ اور برا نہیں کریں۔

شمینہ عظمت علی کا ”بریکنگ نیوز“ عمدہ تحریر تھی پڑھ کے بہت مزا آیا۔

”وفا ہے حسن“ ایک خوب صورت تحریر پہلی بار کسی مرد نے عقل سے فیصلہ کیا۔ ورنہ تو حسن سامنے دیکھ کے اچھے اچھوں کی عقل پر ہی بندھی جاتی ہے۔ آخری کوشش ٹھیک تھا۔ لیکن اس کمائی پر جو اسکیچ تھا وہ بہت خوب صورت تھا۔ اس لڑکی کی خوب صورتی بے مثال تھی ”گوہ گراں تھے ہم“ بالکل نئے انداز اور نئے اسٹائل کی کمائی ہے اور کافی انٹرٹیننگ ہے۔

ایڈ میں ایک فرمائش پلیر بلیز ایف ایم۔ 94 کے آر جے شفقت بخاری کو ڈھونڈ کے ان کا ایڈریس تصویر سمیت شائع کریں ان کی آواز و انداز جیسی کسی کی نہیں میرے پورے ملک میں۔ آپ جب بات کریں گی تو آپ جان جائیں گی۔ دل کے تاروں کو پھونکی ہوئی آواز ہے ان کی۔ ج : نجمہ! ہمیں افسوس ہے ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شفقت بخاری کی آواز واقعی اچھی ہے۔ آپ کی فرمائش جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

تہنیت احمد۔ غازی پور ضلع رحیم یار خان

میرا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک ایسے گاؤں سے ہے۔ جہاں کے لوگ موسموں کے اندر چڑھاؤ سے بے نیاز ہو کر اپنی دھرتی کو سجانے کا سبب بنتے ہیں یہاں کے کسان دسمبر کی ٹھنڈی راتوں کی پرواہ کرتے ہیں نہ ہی جون کے تپتے سورج کی اگر پرواہ ہوتی ہے تو اپنی فصل کی کہ فصل کو موسم کی سختی سے بچایا جاسکے۔ سخت سردیوں کی راتوں میں گرم کپڑوں سے بے نیاز اپنی فصلوں کو پانی لگاتے ہوئے اور گرمیوں میں سورج کے نیچے کام کرتے ہوئے جب ان کا پسینہ نیچے گر رہا ہو تو اسے اور پیاسی دھرتی اپنے اندر جذب کرتی ہے تو دل میں یہی خیال آتا ہے کہ بلاشبہ یہ عظیم لوگ ہیں جن کی بدولت ہمارا پیارا ملک ہر ابھرا ہے جب فصل نکالنا شروع ہوتی ہے اور ہر طرف سبز ہوا کے دوش پہ ایسے جھوم رہا ہوتا ہے جسے ہمارا سبز پلائی پرچم لہرا رہا ہو۔ ایسا منظر اور کسان کی خوشی الفاظ میں ناقابل بیان ہے۔

اسی پسماندہ اور ترقی پذیر گاؤں کے چند تعلیم یافتہ گھرانوں سے میرا تعلق ہے میں ایم اے (اردو) کرنے کے بعد اپنے گاؤں کی بچوں کو زبور تعلیم سے آراستہ کر رہی ہوں باوجود اس کے کہ یہاں تک خواتین ڈائجسٹ منگوانا بہت مشکل ہے لیکن ہم پھر بھی ہر مہینے باقاعدگی سے خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میری عادت ہے کہ خواتین ڈائجسٹ میں سب سے پہلے قارئین کے دلچسپ خطوط پڑھتی ہوں پھر ان کے تبصرے اپنے خیالات سے ملاتی ہوں کہ آیا جس کمائی کے بارے میں جیسا میں نے سوچا دوسری قارئین نے بھی ویسا ہی سوچا کہ نہیں۔ ہماری تمام قارئین کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں اور ہماری مصنفین بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ ان کے لیے بس اتنا کہوں گی کہ ان کی وجہ سے خواتین ڈائجسٹ ہماری رگوں میں نشے کی طرح سرایت کر گیا ہے کہ جب تک پڑھ نہ لیں چین نہیں آتا۔

ج : پیاری تہنیت خاتون کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے صحیح لکھا۔ ہمارے بغاٹ اور سختی کسان محنت اور مشقت سے دھرتی کا سینہ چیر کر پورے ملک کو اناج مہیا کرتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آج تک کسی نے ان کے لیے نہیں سوچا۔ ان کے سر پر پھٹ ہے نہ تن پر کپڑا۔ پیٹ بھر کھانا میسر ہے نہ صاف پانی۔ ان کے بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ وہ جب تک جاگیرداروں کو ووٹ دیتے رہیں گے۔ ان کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ علم حاصل کر کے دوسروں تک یہ روشنی پہنچا رہی ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے سب سے پہلے شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ذیلی مجلے پر ڈراما یا فلمی منظر اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



اپنے کباب و چائے خانہ

حفظہ العام

1 - کھانا پکاتے وقت خیال تو غذائیت اور صحت سب ہی کا رکھنا چاہیے، مگر وہ جو ایک چیز ہے لذت کام و دہن (اوہ! اسے آسان الفاظ میں زبان کے چٹکارے کہہ لیں) تو بس یہی چیز غذائیت اور صحت کو اکثر پس پشت ڈال دیتی ہے اور پھر صرف پسند ناپسند ہی کا خیال رکھنا پڑتا ہے، کیونکہ مجھ سمیت گھر کے تمام افراد چٹ پٹی چیزوں کے شوقین ہو ٹھہرے لہذا زیادہ تر ایسی ہی ذائقہ دار چیزیں بنانی پڑتی ہیں۔

2 - مہمان اللہ کی رحمت ہیں اور چ پوچھیں تو مہمان نوازی میری فطرت ہے۔ مہمانوں کی آمد پر (اچانک آمد) صرف یہی پریشانی ہوتی ہے کہ انہیں جلد سے جلد کتنا زیادہ سے زیادہ پکا کر کھلایا جائے (مقدار نہیں ڈشیں) اس لیے فوراً ”داغ اڑانا شروع کر دیتی ہوں۔ ویسے تو مجھے چکن بریانی بنانا بھی بہت آسان لگتا ہے اور بقول گھر والوں کے ”تم بریانی اتنی جلدی بناتی ہو“ جتنی دیر میں ہم اندازاً فرمائی کریں۔ ”بہر حال ایک بہت آسان اور جلد تیار ہونے والی ڈش لکھ رہی ہوں۔

اشیا :
قیمہ
دہی
گھی
خشخاش
پسی لال مرچ
بادام
نمک
لونگ
کالی مرچ
سفید زیرہ
کالا زیرہ
چھوٹی الائچی
پیاز
پودینہ

دم کا قیمہ
ایک کلو
ایک پیالی
ایک پیالی
ایک چمچ
ایک چمچ
چھ عدد
حسب ذائقہ
چار عدد
چھ عدد
ایک چمچ
ایک چمچ
چھ عدد
ایک عدد
ایک گڈی

ہری مرچ
لیموں
لہسن
ادرنک
ہیسن
ترکیب :

دو عدد
دو عدد
کھانے کا ایک چمچ
حسب ضرورت
دو چمچے

سب سے پہلے خشخاش اور بادام بھگو کر پیس لیں۔ پھر سارے خشک مسالے باریک پیس لیں۔ قیمہ دھو کر سارے خشک مسالے اور لہسن دہی نمک گھی، ہری مرچ، لیموں ہمیں خشخاش اور بادام ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیاز تل کر نکال لیں۔ ایک چٹلی میں سارا قیمہ پڑھا دیں۔ جب قیمہ گل جائے اور پیانی خشک ہو جائے تو تورا رکھ کے تھوڑی دیر دم پر رکھ دیں۔ تلی ہوئی پیاز پودینہ ہری مرچ اور ڈال دیں۔

3 - عورت ہو یا لڑکی بچن دیکھ کر ہی اس کے سلیقے کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور بقول امی ”ہمارے وقتیں میں عورتیں سو کی تلاش میں کسی گھر جانی تھیں تو کسی نہ کسی بہانے سے بچن کا جائزہ ضرور لیتی تھیں۔“ (خیر! یہ معاملہ تو اب بھی ہے شاید۔) لیکن صرف اسی وجہ سے نہیں بلکہ مجھے خود بھی بچن کی صفائی کا خیال ہے ساتھ ہی اس کی آرائش کا بھی خیال رکھتی ہوں روزانہ بھر پور صفائی اور ہفتہ وار تفصیلی صفائی معمولات میں شامل ہے۔

4 - صبح کا ناشتا تو اب رمضانوں میں سحری میں تبدیل ہو گیا ہے جس میں کھلے، پھینٹی وغیرہ کے ساتھ پرائے اور دہی کی نمکین سی لازمی ہے ویسے یہ روغنی روٹی بھی بہت مزہ دیتی ہے۔

سفید آٹا
خشک دودھ
شکر
چار کپ
آدھا کپ
آدھا کپ

اندھے
گھی
ترکیب :

دو عدد
حسب ضرورت

آٹے میں خشک دودھ، شکر اور گھی اچھی طرح ملا لیں۔ نیم گرم پانی سے آٹا گوندھ کر آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیڑے بنا کر موٹی موٹی روٹی تیل لیں اور گرم تیل پر پکھی آج کر کے سینک لیں۔ مزے دار روغنی روٹی تیار ہے یہ روٹی نہایت لذیذ ہونے کے ساتھ ساتھ روزے کی حالت میں سارا دن آپ کو توانائی بھی فراہم کرے گی۔

(نوٹ: اس روٹی میں شکر کی جگہ نمک بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔)

5 - باہر کھانا کھانے کا شوق نہیں ہے۔ البتہ کبھی کبھار پروگرام بن جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلسل پکا کر کھانے اور کھلانے کے بعد کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنا چاہیے (کیوں صحیح ہے نا؟)

6 - موسم اور پھولوں کا لازم اور ملزم ہیں۔ برسات ہو اور پکڑے نہ ہوں تو پھر کیسا مزہ! اسی طرح سردیوں میں پائے اور گرمیوں میں کرپے اور مختلف شہوت موسم کا لطف دوہلا کر دیتے ہیں۔ گرمیوں میں ”ستو“ (جی ہاں! ستو) بھی ہمارے سب گھر والے شوق سے نوش فرماتے ہیں۔

7 - اچھا پکانے کے لیے صرف محنت نہیں بلکہ شوق، محو اور ہاتھ کا قدرتی ذائقہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ سب نہ ہوں تو صرف محنت سے لذت نہیں آتی۔

8 - باورچی خانے کا اصل حسن اس کا صاف ستھرا ہونا ہے۔ باخصوص کاروبار اور کیرے کوٹوں سے پاک ہونا چاہیے۔ اگر کچن کینٹ میں براؤن پیپر (خاکی کاغذ) بچھا دیں تو کاروبار نہیں آتے۔





موٹے کے پیکوان

حالاہ جیلانی

دہی بڑے چنا چاٹ

اجزا :

دہی
اے کاہلی پنے
ماش کی دال
موٹے کی دال
آلو
نمٹا
پیاز
ہری مرچ
ہرا دھنیا
میٹھا سوڈا
کئی لال مرچ
زیرہ

دو کپ
ایک کپ
آدھا کپ
آدھا کپ

دو عدد

دو عدد

ایک عدد

دو عدد

آدھی مٹھی

آدھا چائے کا چمچ

ایک چائے کا چمچ

ڈیڑھ چائے کا چمچ

چاٹ مسالا
پینگ
ثابت دھنیا
پاڑی
نمک
تیل
ترکیب :

حسب ذائقہ
ایک چنگلی
ایک چائے کا چمچ
چار عدد
حسب ذائقہ
حسب ضرورت
موٹے اور ماش کی دال چار گھنٹے تک بھگونے کے بعد پیس لیں اور اس میں نمک، میٹھا سوڈا، کئی ہونی لال مرچ اور آدھا چمچ زیرہ (بھون کر پیس لیں) ملا کر رکھ دیں۔ آمیزہ پتلا نہیں ہونا چاہیے۔
فرائنگ پان میں ایک کھانے کا چمچ تیل گرم کر کے اس میں پینگ ڈالیں، پھر ثابت دھنیا اور ثابت زیرہ ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کوٹ کر دال

میں ملا دیں۔ کڑائی میں دال کے بڑے بنا کر سنہرا ہونے تک تلیں، پھر نمک لے پانی میں ڈال دیں۔
دہی میں نمک، کئی ہونی لال مرچ اور بانی پچا ہوا زیرہ ڈال کر پھینٹ لیں۔
آلو کو ابل کر چوکور کاٹ لیں اور کاہلی چنوں کے ساتھ دہی میں ڈالیں، پھر بڑے بھی پانی سے نکال کر دہی میں ڈال دیں۔ نمٹا، مرچ، پیاز اور ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈالیں اور ہلکے ہاتھ سے سب کو مٹس کر دیں۔
چاٹ مسالا، پاڑی اور املی کی چٹنی کے ساتھ مزے دار دہی بڑے چنا چاٹ پیش کریں۔

چکن چٹوری

اجزا :

چکن
لہسن اور ک پیسٹ
پیاز
خسکاش

ایک کلو
ایک کھانے کا چمچ
دو عدد
دو کھانے کے چمچ

ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ

آٹھ عدد
ایک چوتھائی چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ
آدھا چائے کا چمچ

دس عدد
ایک ٹکڑا

چار عدد
دو کھانے کے چمچ

حسب ذائقہ
آدھا کپ

ترکیب :

زیرہ، دھنیا، مرچ اور خسکاش کو توے پر بھون کر باریک پیس لیں۔ پیسلی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کر لیں۔ لہسن اور ک پیسٹ ڈال کر تھوڑا بھونیں، پھر

اجزا :

دو عدد
خسک دو عدد

کریم

کنڈینسڈ ملک

انڈے

کافی

کو کو پاؤڈر

چاکلیٹ

مکھن

ترکیب :

چکن ڈال کر فرائی کریں۔ ساتھ ہی ہلدی، دار چینی، لونگ، الائچی، باؤڈر، نمک اور اوپر والا مسالا بھی ڈال دیں۔ گوشت گھنے تک ہلکی آگ پر پکائیں، پھر آلو بخارے ڈال کر روغن آنے تک بھوئیں اور پانچ منٹ کے لیے دم پر چھوڑ دیں۔ ڈش میں نکالتے وقت میوں کا رس ڈال کر تان یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

چاکلیٹ آئس کریم

تین کپ

آدھا کپ

ڈیڑھ کپ

ایک کپ

دو عدد

ایک چائے کا چمچ

دو کھانے کے چمچ

ایک کپ

ایک کھانے کا چمچ

دو عدد پکا کر اس میں انڈے پھینٹ کر ڈالیں اور مسلسل چمچ ہلاتے رہیں۔ خسک دو عدد بھی تھوڑے سے پانی میں حل کر کے شامل کر دیں۔ ایک ابلال آجائے تو چوبیس سے اتار لیں۔ اب کافی اور کو کو پاؤڈر ڈال کر کس کر لیں۔ ایک بڑے پیالے میں چاکلیٹ اور مکھن ڈال کر بڑے پیالے کے اندر گرم پانی میں رکھ دیں تاکہ چاکلیٹ پکھل کر مکھن کے ساتھ مٹس ہو جائے۔ چاکلیٹ اور مکھن پکھل جائیں تو کریم مٹس کر لیں۔ دو عدد والا آمیزہ بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر لیں اور کسی پیالے میں نکال لیں۔ اب اس میں کنڈینسڈ ملک اور چاکلیٹ کریم اچھی طرح میجان کر کے فریزر میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد نکال کر دوبارہ خوب پھینٹیں اور ایر ناٹ بکس میں ڈال کر تقریباً دو گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔
مزے دار فیج چاکلیٹ آئس کریم تیار ہے۔

ڈبل کارہنگی نے پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک صاحب کی سرگزشت لکھی ہے جس کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ بالکل سچی ہے۔

گھرے صدمہ کے باعث ایک صاحب کی بھوک اڑ گئی، نیند غائب ہو گئی۔ کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ ان کے اعصاب بالکل جواب دے گئے اور خود اعتمادی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹروں کے پاس گئے تو کسی نے سکون اور گولیاں دیں۔ کسی نے سیرو تفریق کی سفارش کی۔ انہوں نے دونوں کو آزمایا لیکن بالکل فائدہ نہ ہوا اور طبیعت اور حالت بدی ہی رہی۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ ”ایک شام میں افسردہ اور غمگین بیٹھا تھا تو میرا چار سالہ بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کے لیے ایک کشتی بنادوں۔“

میں کشتی بنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دراصل میرا کوئی کام کرنے کوئی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اپنی ضد پر اڑا رہا اور مجھے شکست تسلیم کرنی پڑی۔

اس رسمی یا ناؤ بنانے میں میرے تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ کام ختم کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کشتی بنانے میں جو تین گھنٹے لگائے ہیں وہ انتہائی سکون اور اطمینان کی گھڑیاں تھیں اور یہ سکون اور اطمینان مجھے کئی مہینوں کے بعد پہلی بار حاصل ہوا تھا۔

اس انکشاف پر میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کئی مہینوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جب میں کسی ایسے کام میں مصروف رہوں جس میں سوچ بچار اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہو تو میرا پریشان، افسردہ اور غمگین رہنا مشکل ہے۔ مثلاً ”اس کشتی کے کام کو سمجھنے“ اس نے میری ساری پریشانیوں کو یکسر ختم کر دیا۔ چنانچہ میں نے مصروف رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی صبح میں ہر کمرے میں جا کر ان چیزوں کی فہرست تیار کرنے لگا جو میری توجہ چاہتی تھیں۔ بے شمار اشیاء۔ کتابیں رکھنے کا ریک۔ سیڑھیاں، کھڑکیاں، پردے، کنڈیاں، تالے، ٹوئیاں مرمت طلب تھیں۔ میں نے دو ہفتوں کے دوران تمام مرمت طلب چیزوں کو مرمت کر لیا۔ اس کے علاوہ میں نے سماجی کام کرنے شروع کیے۔ محلے کے لوگوں کی تکلیف اور ان کی مدد کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ کھاتے پیتے لوگوں کو محلے کے سفید پوش ضرورت مند لوگوں کی ضرورتوں سے آگاہ کرنا شروع کیا اور ان سے کار خیر میں حصہ لینے کے لیے کہا تو ان میں سے بیشتر اس کے لیے خوشی تیار ہو گئے اور یہ سب کچھ کر کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنے رن جو غم پریشانیاں بھول کر ایسے کاموں میں جو گھر رشتہ دار اور محلے والوں کے تھے۔ ایسا مصروف ہوا کہ پریشان اور افسردہ رہنے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

میں دو بچوں کی ماں ہوں میں اپنے خاوند کی بہت عزت کرتی ہوں مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی اور شخص میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ وہ ہمارے خونی رشتے سے نہیں ہیں۔ لیکن جب تک میں ان کو دیکھ نہ لوں تو مجھے قرار نہیں آتا۔ میرے خاوند کو ابھی تک اس کا علم نہیں۔ میں ان صاحب کو صرف دیکھنے کی حد تک پسند کرتی ہوں۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں، صرف دیکھنے کو دل چاہتا ہے اور اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ وہ مجھے ہر طرح سے سمجھا کر تھک گئے ہیں کہ آپ بزدل ہیں۔ اس لیے آپ محبت کے چکروں میں نہ پڑیں۔ وہ حضرت بیوی کو چھوڑ چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تو آزاد ہوں مگر آپ مجبور ہیں۔ مجھے تین ماہ سے یہ جھون ہے کہ میں ان کو دل بھر کر دیکھ لوں۔ جتنا دیکھتی ہوں دل نہیں بھرتا۔ جب وہ بھی نہ آئیں تو میں بہت زیادہ روتی ہوں کسی کے پوچھنے پر یہ کہہ کر اس کی تسلی کرتی ہوں کہ مجھے علم نہیں کہ میں کیوں روتی ہوں۔ ویسے میرے گھروالے بھی اس وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ وہ کہتے ہیں اگر آپ کو میرے ساتھ بارے تو یا اسے گھر میں میرا تعلق بڑھائیں۔ یا میرے ساتھ کہیں بھاگ چلیں۔ لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ میں ساری زندگی گناہ گار بن کے گزاروں۔ کیونکہ نکاح کے اوپر نکاح بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ویسے آج تک انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی کیونکہ ہم اکثر اکیلے بھی ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہاری خوشی کے ساتھ میری خوشی ہے جو تم پسند کرو وہ ہی میں پسند کروں گا۔ ان کی ایک دن کی غیر حاضری میرے لیے جان کا عذاب بن جاتی ہے۔ جو چیز گھر میں پکاتی ہوں وہ شامل نہ ہوں تو کھانے کو دل نہیں چاہتا۔

واضح کر دوں کہ میرے شوہر کی عمر سینتالیس سال ہے اور میری عمر صرف ستائیس سال ہے۔ وہ میرے ہم عمر ہیں۔ میرے گھر میں ہر چیز ہونے کے باوجود مجھے سکون نہیں۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ میں اپنے خاوند کو کیسے مطمئن کروں اور وہ کیسے ہمارے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں؟ انہیں دیکھنے کو دل پریشان رہتا ہے بتائیں کیا کروں میں پریشان رہتی ہوں۔ بچوں کو۔ ماری ہوں۔ ہر وقت ست اور پزار رہتی ہوں۔ کافی کوشش کرتی ہوں کہ میں گھر میں شامل رہوں۔ لیکن میرے بس سے باہر ہے۔ ہر وقت ان کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں مجھے آپ سے پہلے پار نہیں تھا۔ لیکن اب ہم نے قرآن کو گواہ بنا کر قسم کھائی ہے کہ میں آپ کا راستہ ہموار کروں گی۔ اگر نہ ہوا تو میں کیا کروں۔ میں نے سہم اٹھائی ہے۔

ج : آپ دو بچوں کی ماں ہیں۔ کسی کی بیوی ہیں۔ ایک گھر کی عزت آپ سے وابستہ ہے آپ کی حرکات، آپ کا رویہ، آپ کا راستہ گناہ اور دلدل کا راستہ ہے جس راستے پر آپ چل رہی ہیں اور چلنے کا سوچ رہی ہیں وہ بتائی، بربادی اور بدنامی کا راستہ ہے جس کے بعد آپ دین کی رہیں گی نہ دنیا کی۔ اس بد معاش نے آپ کو اس قدر پھانس لیا (یا آپ خود پھنس گئیں) اتنی بے راہ روی تو اختیار کروالی۔ یا دونوں نے مل کر کر لی۔ اب سب گھر میں رہ کر گناہ کے مزید راستے کھولنا چاہتا ہے۔

اگر آپ کو اپنی اپنے خاندان اپنے شوہر اور بچوں کی زندگی اور عزت عزیز ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ بدنامیوں کے داغ آپ کے دامن پہ نہ لگیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے بچے زمانے کی دشامیوں سے بچے رہیں۔ تو آج ہی اسی وقت اس شخص سے بیشبہ بیشبہ کے لیے اپنا واسطہ اور تعلق ختم کر لیں۔ اس سے بھی نہ ملیں۔ اسے کبھی گھر نہ آنے دیں۔ اپنی بیوی کو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ اب وہ آپ کی تباہی کے درپے ہے۔

میں تو دعائی کر سکتا ہوں کہ اللہ آپ کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ باقی اس پر عمل کرنا آپ کا کام ہے۔ اس گناہ سے بچنا آپ کے ہاتھ میں ہے اور خدا کرے آپ بچ جائیں۔

سچی دیکھیں

میک اپ کرنے سے پہلے آپ چہرے پر برف کے ٹکڑوں سے مساج کریں۔ اس سے چہرے کے مسام بند ہونے میں مدد ملے گی۔

ترشیہ خان..... لاہور

س : میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کوئی بھی شیمپو سوٹ نہیں کرتا۔ بال بے حد روکھے اور خشک ہیں۔

میری آنکھوں کے گرد حلقے ہیں جو بیدار نشی ہیں۔ کیا وہ دور ہو سکتے ہیں؟

ج : بالوں کی خشکی دور کرنے کے لیے آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ یہ نسخہ استعمال کریں تو آپ کے بالوں میں چمک آجائے گی اور بال صحت مند رہیں گے۔

ایک کپ دودھ میں ایک انڈا چھینٹ لیں۔ جب خوب جھاگ بن جائے تو اسے سر پر بالوں میں اچھی طرح لگائیں۔ پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں پھر بال دھو لیں۔

بہت سے لوگوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ شیمپو سے ان کے بال خشک ہو جاتے ہیں۔ آپ گھر پر بنا ہوا شیمپو استعمال کریں۔

گھر پر شیمپو بنانے کی ترکیب یہ ہے۔

ایک کپ گلیسرین صابن
ایک کپ پانی
ایک کپ الڈا

گلیسرین صابن کو کچل کر ایک کپ الڈا پانی میں ابال لیں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر وہ جیلی کی طرح بن جائے گا۔ انڈے کو اچھی طرح چھینٹ لیں اور جیلی میں ملا لیں۔

اس سے بال دھو لیں۔ آنکھوں کے حلقے اگر پیدا نہیں ہوتے تو ان کو دور کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ حلقے کم ضرور کیے جاتے ہیں۔

حلقوں کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں۔

عائشہ کاظمہ..... بھاول نگر

س : گرمی میں مختلف تقریبات میں شرکت کرنا ہوتی ہے تو میک اپ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میک اپ ٹھہرتا نہیں۔ کچھ دیر بعد چہرے پر دھبے پڑ جاتے ہیں اور چہرے پر رونق اور چمکا پھیکا لگنے لگتا ہے۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میں گرمی میں میک اپ کر کے تقریب میں شرکت کر سکوں۔

ج : گرمیوں کے موسم میں جلد کے بعض غدود اپنی چکنائی زیادہ تعداد میں خارج کرنے لگتے ہیں اور جلد چکنی ہو جاتی ہے۔ دن میں کئی بار منہ دھوئیں مگر چہرہ عجیب چمکا چمکا رہتا ہے۔ اس لیے میک اپ بھی چہرے پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کے لیے ایک آسان سا علاج کیجیے۔

اشیا :
ٹماٹر اور میانہ سرخ
لیموں کے قطرے
پودینہ کا عرق
ترکیب :

ایک عدد
تین چمچ
ایک چمچ

ٹماٹر کے دو ٹکڑے کر لیں۔ اس پر لیموں اور پودینہ کے قطرے ڈال کر آہستہ آہستہ چہرے پر اس کا رس ملیں۔ رس ملتے وقت آپ ہاتھ کو نیچے کی جانب لاکر مالش نہ کریں۔ بلکہ ہاتھ کو پیشانی کے رخ پر رکھیں۔ پندرہ منٹ بعد آپ سادہ پانی سے منہ دھو لیں۔ آپ کو خود تازگی کا اثر محسوس ہو گا۔ ٹماٹر کی یہ منہ می مالش جلد کے لیے بہترین مالش ہے۔ میک اپ کرنے سے پہلے یہ عمل کریں گی تو میک اپ دیر تک قائم رہے گا کیونکہ یہ عمل چکنائی خارج ہونے میں وقفہ پیدا کرتا